اپنے دُکھ مجھے دے دو

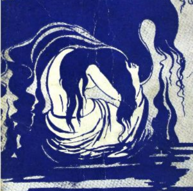

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

اپنے دُکھ مجھے دے دو

راجندر سنگھ بیدی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

© راجندر سنگھ بیدی

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اُردو بازار۔ دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ 202001

نومبر ۹۷ء   تعداد 1000   قیمت: ۲۹/=

برنی آرٹ پریس، پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں طبع ہوئی۔

آل احمد سُرُور کے نام

فہرست

لاجونتی	۷
جوگیا	۲۳
بتل	۴۵
لمبی لڑکی	۸۳
اپنے دُکھ مجھے دے دو	۱۱۷
ٹرمینس سے پرے	۱۴۶
حجام الٰہ آباد کے	۱۷۵
دیوالہ	۱۹۹
یوکلپٹس	۲۲۲

لاجونتی

"ہتھ لائیاں کملاں نی لاجونتی دے بوٹے
(یہ چھوئی موئی کے پودے ہیں ری ہاتھ بھی لگاؤ تو کمھلا جاتے ہیں)
________ ایک پنجابی گیت

بٹوارا ہوا اور بے شمار زخمی لوگوں نے اٹھ کر اپنے بدن پر سے خون پونچھ ڈالا اور پھر سب مل کر اُن کی طرف متوجہ ہو گئے جن کے بدن صحیح و سالم تھے، لیکن دل زخمی۔

گلی گلی، محلّے محلّے میں "پھر بساؤ" کمیٹیاں بن گئی تھیں اور شروع شروع میں بڑی تندہی کے ساتھ "کاروبار میں بساؤ"، "زمین پر بساؤ" اور "گھروں میں بساؤ" پروگرام شروع کر دیا گیا تھا لیکن ایک پروگرام ایسا تھا جس کی طرف کسی نے توجہ نہ دی تھی۔ وہ پروگرام مغویہ عورتوں کے سلسلے میں تھا جس کا سلوگن تھا "دل میں بساؤ" اور اس پروگرام کی نارائن باوا کے مندر اور اس کے آس پاس بسنے والے قدامت پسند طبقے کی طرف سے بڑی مخالفت ہوتی تھی ________

اس پروگرام کو حرکت میں لانے کے لیے مندر کے پاس محلّے "ملّا شکور" میں ایک کمیٹی قائم ہو گئی اور گیارہ ووٹوں کی اکثریت سے سندر لال بابو کو اس کا سکریٹری چن لیا

گیا۔ وکیل صاحب صدر، چوکی کلاں کا بوڑھا محرّر اور محلّے کے دوسرے معتبر لوگوں کا خیال تھا کہ سندر لال سے زیادہ جانفشانی کے ساتھ اس کام کو کوئی اور نہ کر سکے گا۔ شاید اس لیے کہ سندر لال کی اپنی بیوی اغوا ہو چکی تھی اور اس کا نام تھا بھی لاجو ________ لاجونتی۔

چنانچہ پربھات پھیری نکالتے ہوئے جب سندر لال بابو، اس کا ساتھی رسالو اور نیکی رام وغیرہ مل کر گاتے ________ "ہتھ لائیاں کملاں نی لاجونتی دے بوٹے۔" تو سندر لال کی آواز ایک دم بند ہو جاتی اور وہ خاموشی کے ساتھ چلتے چلتے لاجونتی کی بابت سوچتا ________ جانے وہ کہاں ہوگی، کس حال میں ہوگی، ہماری بابت کیا سوچ رہی ہوگی، وہ کبھی آئے گی بھی یا نہیں؟ ________ اور پتھریلے فرش پر چلتے چلتے اس کے قدم لڑکھڑانے لگتے۔

اور اب تو یہاں تک نوبت آ گئی تھی کہ اس نے لاجونتی کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس کا غم اب دنیا کا غم ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے دُکھ سے بچنے کے لیے لوک سیوا میں اپنے آپ کو غرق کر دیا۔ اس کے باوجود دوسرے ساتھیوں کی آواز میں آواز ملاتے ہوئے اسے یہ خیال ضرور آتا ________ انسانی دل کتنا نازک ہوتا ہے۔ ذرا سی بات پر اسے ٹھیس لگ سکتی ہے۔ وہ لاجونتی کے پودے کی طرح ہے، جس کی طرف ہاتھ بھی بڑھاؤ تو کمھلا جاتا ہے لیکن اس نے اپنی لاجونتی کے ساتھ بدسلوکی کرنے میں کوئی بھی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ وہ اسے جگہ بے جگہ اٹھنے بیٹھنے کھانے کی طرف بے توجہی برتنے اور ایسی ہی معمولی معمولی باتوں پر پیٹ دیا کرتا تھا

اور لاجو ایک پتلی شہتوت کی ڈالی کی طرح نازک سی دیہاتی لڑکی تھی۔ زیادہ دھوپ دیکھنے کی وجہ سے اس کا رنگ سونلا چکا تھا۔ طبیعت میں ایک عجیب طرح کی بیقراری تھی۔ اُس کا اضطرار شبنم کے اس قطرے کی طرح تھا جو پارا بن کر اس کے بڑے سے پتّے پر کبھی ادھر اور کبھی اُدھر لڑھکتا رہتا ہے۔ اس کا دبلاپن اس کی صحت کے خراب ہونے کی دلیل نہ تھی ایک صحت مندی کی نشانی تھی جسے دیکھ کر بھاری بھرکم سندر لال پہلے تو گھبرایا لیکن جب اس نے دیکھا کہ لاجو ہر قسم کا بوجھ، ہر قسم کا صدمہ حتیٰ کہ مار پیٹ تک سہ

گزرتی ہے تو وہ اپنی بدسلوکی کو بتدریج بڑھاتا گیا اور اس نے ان حدوں کا خیال ہی نہ کیا جہاں پہنچ جانے کے بعد کسی بھی انسان کا صبر ٹوٹ سکتا ہے۔ ان حدوں کو دھندلا دینے میں لاجونتی خود بھی تو ممد ثابت ہوئی تھی۔ چونکہ وہ دیر تک اُداس نہ بیٹھ سکتی تھی اس لیے بڑی سے بڑی لڑائی کے بعد بھی سندر لال کے صرف ایک بار مسکرا دینے پر وہ اپنی ہنسی نہ روک سکتی اور لپک کر اُس کے پاس چلی آتی اور گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہہ اُٹھتی ـــــ "پھر مارا تو میں تم سے نہیں بولوں گی ـــــ" صاف پتا چلتا تھا وہ ایک دم ساری مارپیٹ بھول چکی ہے۔ گانو کی دوسری لڑکیوں کی طرح وہ بھی جانتی تھی کہ مرد ایسا ہی سلوک کیا کرتے ہیں بلکہ عورتوں میں کوئی بھی سرکشی کرتی تو لڑکیاں خود ہی ناک پر انگلی رکھ کے کہتیں ـــــ "لے وہ بھی کوئی مرد ہے بھلا۔ عورت جس کے قابو میں نہیں آتی...." اور یہ مارپیٹ ان کے گیتوں میں چلی گئی تھی۔ خود لاجو گایا کرتی تھی۔ میں شہر کے لڑکے سے شادی نہ کروں گی۔ وہ بوٹ پہنتا ہے اور میری کمر بڑی پتلی ہے۔ لیکن پہلی ہی فرصت میں لاجو نے شہر ہی کے ایک لڑکے سے لو لگا لی اور اس کا نام تھا سندر لال، جو ایک برات کے ساتھ لاجونتی کے گانو چلا آیا تھا اور جس نے دولھا کے کان میں صرف اتنا سا کہا تھا ـــ "تیری سالی تو بڑی نمکین ہے یار۔ بیوی بھی چٹ پٹی ہوگی" لاجونتی نے سندر لال کی اس بات کو سن لیا تھا۔ مگر وہ یہ بھول ہی گئی کہ سندر لال کتنے بڑے بڑے اور بھدے بوٹ پہنے ہوئے ہے اور اس کی اپنی کمر کتنی پتلی ہے'

اور پربھات پھیری کے سمے ایسی ہی باتیں سندر لال کو یاد آتیں اور وہ یہی سوچتا۔ ایک بار، صرف ایک بار لاجو مل جائے تو میں اسے سچ مچ ہی دل میں بسا لوں اور لوگوں کو بتا دوں ـــــ ان بچاری عورتوں کے اغوا ہو جانے میں ان کا کوئی قصور نہیں۔ فسادیوں کی ہوس ناکیوں کا شکار ہو جانے میں ان کی کوئی غلطی نہیں۔ وہ سماج جو اِن معصوم اور بے قصور عورتوں کو قبول نہیں کرتا، انھیں اپنا نہیں لیتا ـــــ ایک گلا سڑا سماج ہے اور اسے ختم کر دینا چاہیے...... وہ ان عورتوں کو گھروں میں آباد کرنے کی تلقین کیا کرتا اور انھیں ایسا مرتبہ دینے کی پریرنا کرتا جو گھر میں کسی بھی عورت،

کسی بھی ماں، بیٹی، بہن یا بیوی کو دیا جاتا ہے۔ پھر وہ کہتا ـــــ انھیں اشارے اور کنایے سے بھی ایسی باتوں کی یاد نہیں دلانی چاہیے جو اُن کے ساتھ ہوئیں ـــــ کیوں کہ ان کے دل زخمی ہیں۔ وہ نازک ہیں، چھوئی موئی کی طرح ـــــ ہاتھ بھی لگاؤ تو کمھلا جائیں گے ـــــ

گویا "دل میں بساؤ" پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے محلہ مُلّا شکور کی اس کمیٹی نے کئی پربھات پھیریاں نکالیں۔ صبح چار پانچ بجے کا وقت ان کے لیے موزوں ترین وقت ہوتا تھا۔ نہ لوگوں کا شور، نہ ٹریفک کی اُلجھن۔ رات بھر چوکیداری کرنے والے کتے تک بجھے ہوئے تنوروں میں سر دیے کر پڑے ہوتے تھے۔ اپنے اپنے بستروں میں دبکے ہوئے لوگ پربھات پھیری والوں کی آواز سن کر صرف اتنا کہتے ـــ او! وہی منڈلی ہے! اور پھر کبھی صبر اور کبھی تنگ مزاجی سے وہ بابو سندر لال کا پروپگنڈا سنا کرتے۔ وہ عورتیں جو بڑی محفوظ اس پار پہنچ گئی تھیں گوبھی کے پھولوں کی طرح پھیلی پڑی رہتیں اور ان کے خاوند اُن کے پہلو میں ڈنٹھلوں کی طرح اکڑے پڑے پڑے پربھات پھیری کے شور پر احتجاج کرتے ہوئے منہ میں کچھ منمناتے چلے جاتے۔ یا کہیں کوئی بچہ تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں کھولتا اور "دل میں بساؤ" کے فریادی اور اندوہگین پروپگنڈے کو صرف ایک گانا سمجھ کے پھر سو جاتا۔

لیکن صبح کے سمے کان میں پڑا ہوا شبد بیکار نہیں جاتا۔ وہ سارا دن ایک تکرار کے ساتھ دماغ میں چکر لگاتا رہتا ہے اور بعض وقت تو انسان اس کے معنی کو بھی نہیں سمجھتا۔ پر گنگناتا چلا جاتا ہے۔ اسی آواز کے گھر کر جانے کی بدولت ہی، کہ انھیں دنوں جب کہ مس مردولا سارا بھائی، ہند اور پاکستان کے درمیان اغوا شدہ عورتیں تبادلے میں لائیں تو محلہ مُلّا شکور کے کچھ آدمی انھیں پھر سے بسانے کے لیے تیار ہو گئے۔ ان کے وارث شہر سے باہر چوکی کلاں پر اُن سے ملنے کے لیے گئے۔ مغویہ عورتیں اور ان کے لواحقین کچھ دیر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر سر جھکائے اپنے اپنے برباد گھروں کو پھر سے آباد کرنے کے کام پر چل دیے۔ رسالو اور نیکی رام اور سندر لال بابو کبھی "مہندر سنگھ زندہ باد"

اور کبھی "سوہن لال زندہ باد" کے نعرے لگاتے .... اور وہ نعرے لگاتے رہے حتیٰ کہ ان کے گلے سوکھ گئے ــــ ....

لیکن مغویہ عورتوں میں کچھ ایسی بھی تھیں جن کے شوہروں، جن کے ماں، باپ، بہن اور بھائیوں نے انھیں پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔ آخر وہ مر کیوں نہ گئیں ؟ اپنی عفت اور عصمت کو بچانے کے لیے انھوں نے زہر کیوں نہ کھا لیا ؟ کنوئیں میں چھلانگ کیوں نہ لگا دی ؟ وہ بزدل تھیں جو اس طرح زندگی سے چمٹی ہوئی تھیں۔ سینکڑوں ہزاروں عورتوں نے اپنی عصمت لٹ جانے سے پہلے اپنی جان دے دی لیکن انھیں کیا پتا کہ وہ زندہ رہ کر کس بہادری سے کام لے رہی ہیں۔ کیسے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے موت کو گھور رہی ہیں۔ ایسی دنیا میں جہاں ان کے شوہر تک انھیں نہیں پہچانتے۔ پھر ان میں سے کوئی جی ہی جی میں اپنا نام دہراتی ــــــ سہاگ وتی۔ ــــ سہاگ والی.. اور اپنے بھائی کو اس جم غفیر میں دیکھ کر آخری بار اتنا کہتی ــــــــ تو بھی مجھے نہیں پہچانتا بہاری ؟ میں نے تجھے گودی کھلایا تھا، رے .... اور بہاری چلّا دینا چاہتا۔ پھر وہ ماں باپ کی طرف دیکھتا اور ماں باپ اپنے جگر پر ہاتھ رکھ کے نارائن بابا کی طرف دیکھتے اور نہایت بے بسی کے عالم میں نارائن بابا آسمان کی طرف دیکھتا جو دراصل کوئی حقیقت نہیں رکھتا اور جو صرف ہماری نظر کا دھوکا ہے۔ جو صرف ایک حد ہے جس کے پار ہماری نگاہیں کام نہیں کرتیں۔

لیکن فوجی ٹرک میں مس سارا بھائی تبادلے میں جو عورتیں لائیں، ان میں لاجو نہ تھی۔ سندر لال نے امید و بیم سے آخری لڑکی کو ٹرک سے نیچے اترتے دیکھا اور پھر اس نے بڑی خاموشی اور بڑے عزم سے اپنی کمیٹی کی سرگرمیوں کو دوچند کر دیا۔ اب وہ صرف صبح کے سمے ہی پربھات پھیری کے لیے نہ نکلتے تھے بلکہ شام کو بھی جلوس نکالنے لگے، اور کبھی کبھی ایک آدھ چھوٹا موٹا جلسہ بھی کرنے لگے جس میں کمیٹی کا بوڑھا صدر وکیل کالکا پرشاد صوفی کھنکاروں سے ملی جلی ایک تقریر کر دیا کرتا اور رسالو ایک پیکدان لیے ڈیوٹی پر ہمیشہ موجود رہتا۔ لاؤڈ اسپیکر سے عجیب طرح کی آوازیں آتیں۔ پھر کہیں نیکی رام، محرّر چوکی کچھ کہنے کے

لیے اٹھتے۔ لیکن وہ جتنی بھی باتیں کہتے اور جتنے بھی شاستروں اور پرانوں کا حوالہ دیتے اتنا ہی اپنے مقصد کے خلاف باتیں کرتے اور یوں میدان ہاتھ سے جاتے دیکھ کر سندر لال بابو اٹھتا لیکن وہ دو فقروں کے علاوہ کچھ بھی نہ کہہ پاتا۔ اس کا گلا رندھ جاتا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے اور روہانسا ہونے کے کارن وہ تقریر نہ کر پاتا۔ آخر بیٹھ جاتا۔ لیکن مجمع پر ایک عجیب طرح کی خاموشی چھا جاتی اور سندر لال بابو کی ان دو باتوں کا اثر جو کہ اس کے دل کی گہرائیوں سے چلی آتیں وکیل کالکا پرشاد صوفی کی ساری ناصحانہ فصاحت پر بھاری ہوتا لیکن لوگ وہیں رو دیتے۔ اپنے جذبات کو آسودہ کر لیتے اور پھر خالی الذہن گھر لوٹ جاتے ــــــــــــ

ایک روز کمیٹی والے سانجھ کے سمے بھی پرچار کرنے چلے آئے اور ہوتے ہوتے قدامت پسندوں کے گڑھ میں پہنچ گئے۔ مندر کے باہر پیپل کے ایک پیڑ کے ارد گرد سیمنٹ کے تھڑے پر کئی شردھالو بیٹھے تھے اور رامائن کی کتھا ہو رہی تھی۔ نارائن باوا رامائن کا وہ حصّہ سنا رہے تھے جہاں ایک دھوبی نے اپنی دھوبن کو گھر سے نکال دیا تھا اور اس سے کہہ دیا ــــــ میں راجا رام چندر نہیں جو اتنے سال راون کے ساتھ رہ آنے پر بھی سیتا کو بسائے گا اور رام چندر جی نے مہاستونتی سیتا کو گھر سے نکال دیا ــــــ ایسی حالت میں جب کہ وہ گربھ وتی تھی "کیا اس سے بھی بڑھ کر رام راج کا کوئی ثبوت مل سکتا ہے ؟" ــــــ نارائن باوا نے کہا ــــــ "یہ ہے رام راج! جس میں ایک دھوبی کی بات کو بھی اتنی ہی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے!"

کمیٹی کا جلوس مندر کے پاس رک چکا تھا اور لوگ رامائن کی کتھا اور شلوک کا ورنن سننے کے لیے ٹھہر چکے تھے۔ سندر لال آخری فقرے سنتے ہوئے کہہ اٹھا ــــــــ

"ہمیں ایسا رام راج نہیں چاہیے بابا!"

"چپ رہو جی ــــــ تم کون ہوتے ہو"؟ ــــــ "خاموش!" مجمع سے آوازیں آئیں اور سندر لال نے بڑھ کر کہا ــــــ "مجھے بولنے سے کوئی نہیں روک سکتا!" پھر ملی جلی آوازیں آئیں ــــــ "خاموش!" ــــــ "ہم نہیں بولنے دیں گے" اور

ایک کونے میں سے یہ بھی آواز آئی ——— "مار دیں گے!"

نارائن بابا نے بڑی میٹھی آواز میں کہا ——— "تم شاستروں کی مان مریادا کو نہیں سمجھتے سندر لال؟"

سندر لال نے کہا ——— "میں ایک بات تو سمجھتا ہوں بابا ——— رام راج میں دھوبی کی آواز تو سنی جاتی ہے لیکن سندر لال کی نہیں!"

انھی لوگوں نے جو ابھی مارنے پہ تلے تھے، اپنے نیچے سے پیپل کی گولریں ہٹا دیں۔ اور پھر سے بیٹھتے ہوئے بول اٹھے "سنو، سنو، سنو ——"

رسالو اور نیکی رام نے سندر لال بابو کو ٹھوکا دیا اور سندر لال بولے ——— "شری رام نیتا تھے ہمارے۔ پر یہ کیا بات ہے باباجی، انھوں نے دھوبی کی بات کو ستیہ سمجھ لیا مگر اتنی بڑی مہارانی کے ستیہ پر وشواس نہ کر پائے؟"

نارائن بابا نے اپنی داڑھی کی کھچڑی پکاتے ہوئے کہا ——— "اس لیے کہ سیتا ان کی اپنی پتنی تھی۔ سندر لال! تم اس بات کی مہانتا کو نہیں جانتے۔"

"ہاں بابا" سندر لال بابو نے کہا ——— "اس سنسار میں بہت سی باتیں ہیں جو میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ پر میں سچا رام راج اسے سمجھتا ہوں جس میں انسان اپنے آپ پر بھی ظلم نہیں کر سکتا۔ اپنے آپ سے بے انصافی کرنا اتنا ہی بڑا پاپ ہے جتنا کسی دوسرے سے بے انصافی کرنا ——— آج بھی بھگوان رام نے سیتا کو گھر سے نکال دیا ہے۔ اس لیے کہ وہ راون کے پاس رہ آئی ہے ——— اس میں کیا قصور تھا سیتا کا؟ کیا وہ بھی ہماری بہت سی ماؤں بہنوں کی طرح ایک چھل اور کپٹ کی شکار نہ تھی؟ اس میں سیتا کے ستیہ اور استیہ کی بات ہے یا راکشش راون کے وحشی پن کی جس کے دس سر انسان کے تھے لیکن ایک اور سب سے بڑا سر گدھے کا؟"

آج ہماری سیتا نردوش گھر سے نکال دی گئی ہے ——— سیتا ——— لاجونتی ——— اور سندر لال بابو نے رونا شروع کر دیا۔ رسالو اور نیکی رام نے تمام وہ سُرخ جھنڈے اُٹھا لیے جن پر آج ہی اسکول کے چھوکروں نے بڑی صفائی سے نعرے کاٹ کے چپکا دیے

تھے اور پھر وہ سب "سندر لال بابو زندہ باد" کے نعرے لگاتے ہوئے چل دیے۔ جلوس میں سے ایک نے کہا ——— "مہا ستی سیتا زندہ باد" ایک طرف سے آواز آئی ——— "شری رام چندر" ....

اور پھر بہت سی آوازیں آئیں ——— "خاموش! خاموش!" اور نارائن باوا کی مہینوں کی کتھا اکارت چلی گئی بہت سے لوگ جلوس میں شامل ہو گئے جس کے آگے آگے وکیل کالکا پرشاد اور حکم سنگھ محرر چوکی کلاں، جا رہے تھے، اپنی بوڑھی چھڑیوں کو زمین پر مارتے اور ایک فاتحانہ سی آواز پیدا کرتے ہوئے ——— اور ان کے درمیان کہیں سندر لال جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ابھی تک آنسو بہ رہے تھے۔ آج اس کے دل کو بڑی ٹھیس لگی تھی اور لوگ بڑے جوش کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر گا رہے تھے۔

"ہتھ لائیاں کملاں نی لاجونتی دے بوٹے ———!"

ابھی گیت کی آواز لوگوں کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ ابھی صبح بھی نہیں ہو پائی تھی اور محلہ ملا شکور کے مکان ۴۱۴ کی بدھوا ابھی تک اپنے بستر میں کربناک سی انگڑائیاں لے رہی تھی کہ سندر لال کا "گرائیں" لال چند جسے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے سندر لال اور خلیفہ کالکا پرشاد نے راشن ڈپو لے دیا تھا، دوڑا دوڑا آیا اور اپنی گاڑھے کی چادر سے ہاتھ پھیلائے ہوئے بولا:

"بدھائی ہو سندر لال۔"

سندر لال نے میٹھا گُڑ چلم میں رکھتے ہوئے کہا ——— "کس بات کی بدھائی لال چند؟"

"میں نے لاجو بھابی کو دیکھا ہے۔"

سندر لال کے ہاتھ سے چلم گر گئی اور میٹھا تمباکو فرش پر گر گیا ——— "کہاں دیکھا ہے؟" اس نے لال چند کو کندھوں سے پکڑتے ہوئے پوچھا اور جلد جواب نہ پانے پر جھنجھوڑ دیا۔

"واگہ کی سرحد پر۔"

سندر لال نے لال چند کو چھوڑ دیا اور اتنا سا بولا "کوئی اور ہوگی۔"

لال چند نے یقین دلاتے ہوئے کہا ——— "نہیں بھیا وہ لاجو ہی تھی لاجو۔"

"تم اسے پہچانتے بھی ہو؟" سندر لال نے پھر سے میٹھے تمباکو کو فرش پر سے اٹھاتے اور ہتھیلی پر مسلتے ہوئے پوچھا اور ایسا کرتے ہوئے اس نے رسالو کی چلم حقے پر سے اٹھا لی اور بولا ——— "بھلا کیا پہچان ہے اس کی؟"

"ایک تیندولا ٹھوڑی پر ہے، دوسرا گال پر ———"

"ہاں ہاں ہاں" اور سندر لال نے خود ہی کہہ دیا "تیسرا ماتھے پر۔" وہ نہیں چاہتا تھا اب کوئی خدشہ رہ جائے اور ایک دم اسے لاجونتی کے جانے پہچانے جسم کے سارے تیندولے یاد آگئے جو اس نے بچپنے میں اپنے جسم پر بنوا لیے تھے جوان ہلکے ہلکے سبز دانوں کی مانند تھے جو چھوئی موئی کے پودے کے بدن پر ہوتے ہیں اور جس کی طرف اشارہ کرتے ہی وہ کمھلانے لگتا ہے۔ بالکل اسی طرح ان تیندولوں کی طرف انگلی کرتے ہی لاجونتی شرما جاتی تھی ——— اور گم ہو جاتی تھی، اپنے آپ میں سمٹ جاتی تھی۔ گویا اس کے سب راز کسی کو معلوم ہو گئے ہوں اور کسی نامعلوم خزانے کے لٹ جانے سے وہ مفلس ہو گئی ہو ——— سندر لال کا سارا جسم ایک ان جانے خوف، ایک ان جانی محبت اور اس کی مقدس آگ میں پھنکنے لگا۔ اس نے پھر سے لال چند کو پکڑ لیا اور پوچھا،

"لاجو واگہ کیسے پہنچ گئی؟"

لال چند نے کہا ——— "ہند اور پاکستان میں عورتوں کا تبادلہ ہو رہا تھا نا۔"

"پھر کیا ہوا ———؟" سندر لال نے اکڑوں بیٹھتے ہوئے کہا "کیا ہوا پھر؟"

رسالو بھی اپنی چارپائی پر اٹھ بیٹھا اور تمباکو نوشوں کی مخصوص کھانسی کھانستے ہوئے بولا ——— "سچ مچ آگئی ہے لجونتی بھابی؟"

لال چند نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا "واگہ پر سولہ عورتیں پاکستان نے دے دیں اور اس کے عوض سولہ عورتیں لے لیں ——— لیکن ایک جھگڑا کھڑا ہو گیا۔

ہمارے والنٹیر اعتراض کر رہے تھے کہ تم نے جو عورتیں دی ہیں ان میں ادھیڑ، بوڑھی اور بیکار عورتیں زیادہ ہیں۔ اس تنازع پر لوگ جمع ہو گئے۔ اس وقت اُدھر کے والنٹیروں نے لاجو بھابی کو دکھاتے ہوئے کہا ——— "تم اسے بوڑھی کہتے ہو؟ دیکھو ——— دیکھو ——— جتنی عورتیں تم نے دی ہیں ان میں سے ایک بھی برابری کرتی ہے اس کی؟"

اور وہاں لاجو بھابی سب کی نظروں کے سامنے اپنے تیندولے چھپا رہی تھی۔"

پھر جھگڑا بڑھ گیا۔ دونوں نے اپنا اپنا "مال" واپس لے لینے کی ٹھان لی۔ میں نے شور مچایا۔ "لاجو ——— لاجو بھابی" مگر ہماری قوم کے سپاہیوں نے ہمیں ہی مار مار کے بھگا دیا۔

اور لال چند اپنی کہنی دکھانے لگا، جہاں اسے لاٹھی پڑی تھی۔ رسالو اور نیکی رام چپ چاپ بیٹھے رہے اور سندر لال کہیں دور دیکھنے لگا۔ شاید سوچنے لگا۔ لاجو آئی بھی پر نہ آئی ——— اور سندر لال کی شکل ہی سے جان پڑتا تھا جیسے وہ بیکانیر کا صحرا پھاند کر آیا ہے اور اب کہیں درخت کی چھاؤں میں، زبان نکالے ہانپ رہا ہے۔ منہ سے اتنا بھی نہیں نکلتا ——— "پانی دے دو۔" اسے یوں محسوس ہوا، بٹوارے سے پہلے اور بٹوارے کے بعد کا تشدد ابھی تک کارفرما ہے۔ صرف اس کی شکل بدل گئی ہے۔ اب لوگوں میں پہلا سا دریغ بھی نہیں رہا۔ کسی سے پوچھو، سانبھر والا میں لہنا سنگھ رہا کرتا تھا اور اس کی بھابی بنتو ——— تو وہ جھٹ سے کہتا "مر گئے" اور اس کے بعد موت اور اس کے مفہوم سے بالکل بے خبر بالکل عاری آگے چلا جاتا۔ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر بڑے ٹھنڈے دل سے تاجر، انسانی مال، انسانی گوشت اور پوست کی تجارت اور اس کا تبادلہ کرنے لگے۔ مویشی خریدنے والے کسی بھینس یا گائے کا جبڑا ہٹا کر دانتوں سے اس کی عمر کا اندازہ کرتے تھے۔

اب وہ جوان عورت کے روپ، اس کے نکھار، اس کے عزیز ترین رازوں، اس کے تیندولوں کی شارع عام میں نمائش کرنے لگے۔ تشدد اب تاجروں کی نس نس میں بس چکا ہے، پہلے منڈی میں مال بکتا تھا اور بھاؤ تاؤ کرنے والے ہاتھ ملا کر اس پر ایک رومال ڈال لیتے اور یوں "گپتی" کر لیتے۔ گویا رومال کے نیچے انگلیوں کے اشاروں سے

سودا ہو جاتا تھا۔ اب "گیتی" کا رومال بھی ہٹ چکا تھا اور سامنے سودے ہو رہے تھے اور لوگ تجارت کے آداب بھی بھول گئے تھے۔ یہ سارا لین دین، یہ سارا کاروبار پرانے زمانے کی داستان معلوم ہو رہا تھا جس میں عورتوں کی آزادانہ خرید و فروخت کا قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ ازبیک اَن گنت عریاں عورتوں کے سامنے کھڑا اُن کے جسموں کو ٹٹول ٹٹول کے دیکھ رہا ہے اور جب وہ کسی عورت کے جسم کو انگلی لگاتا ہے تو اس پر ایک گلابی سا گڑھا پڑ جاتا ہے اور اس کے اردگرد ایک زرد سا حلقہ اور پھر زردیاں اور سرخیاں ایک دوسرے کی جگہ لینے کے لیے دوڑتی ہیں ــــــ ازبیک آگے گزر جاتا ہے اور ناقابلِ قبول عورت ایک اعترافِ شکست، ایک انفعالیت کے عالم میں ایک ہاتھ سے ازاربند تھامے اور دوسرے سے اپنے چہرے کو عوام کی نظروں سے چھپائے سسکیاں لیتی ہے۔

سندر لال امرتسر (سرحد) جانے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ اسے لاجو کے آنے کی خبر ملی۔ ایک دم ایسی خبر مل جانے سے سندر لال گھبرا گیا۔ اس کا ایک قدم فوراً دروازے کی طرف بڑھا لیکن وہ پیچھے لوٹ آیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ روٹھ جائے اور کمیٹی کے تمام پلے کارڈوں اور جھنڈیوں کو بچھا کر بیٹھ جائے اور پھر روئے لیکن وہاں جذبات کا یوں مظاہرہ ممکن نہ تھا۔ اس نے مردانہ وار اس اندرونی کشاکش کا مقابلہ کیا اور اپنے قدموں کو ناپتے ہوئے چوکی کلاں کی طرف چل دیا کیوں کہ وہی جگہ تھی جہاں مغویہ عورتوں کی ڈلیوری دی جاتی تھی۔

اب لاجو سامنے کھڑی تھی اور ایک خوف کے جذبے سے کانپ رہی تھی۔ وہی سندر لال کو جانتی تھی اس کے سوائے کوئی نہ جانتا تھا۔ وہ پہلے ہی اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتا تھا اور اب جب کہ وہ ایک غیر مرد کے ساتھ زندگی کے دن بتا کر آئی تھی نہ جانے کیا کرے گا؟ سندر لال نے لاجو کی طرف دیکھا وہ خالص اسلامی طرز کا لال دوپٹا

اوڑھے تھی اور بائیں بُکل مارے ہوئے تھی ــــــ عادتاً محض عادتاً ــــــ دوسری عورتوں میں گھل مل جانے اور بالآخر اپنے صیاد کے دام سے بھاگ جانے کی آسانی تھی اور وہ سندر لال کے بارے میں اتنا زیادہ سوچ رہی تھی کہ اسے کپڑے بدلنے یا دوپٹا ٹھیک سے اوڑھنے کا بھی خیال نہ رہا۔ وہ ہندو اور مسلمان کی تہذیب کے بنیادی فرق ــــــ دائیں بُکل اور بائیں بُکل میں امتیاز کرنے سے قاصر رہی تھی۔ اب وہ سندر لال کے سامنے کھڑی تھی اور کانپ رہی تھی ایک امید اور ایک ڈر کے جذبے کے ساتھ ــــــ

سندر لال کو دھچکا سا لگا۔ اس نے دیکھا لاجونتی کا رنگ کچھ نکھر گیا تھا اور وہ پہلے کی بہ نسبت کچھ تندرست سی نظر آتی تھی۔ نہیں۔ وہ موٹی ہو گئی تھی ــــــ سندر لال نے جو کچھ لاجو کے بارے میں سوچ رکھا تھا وہ سب غلط تھا۔ وہ سمجھتا تھا غم میں گھل جانے کے بعد لاجونتی بالکل مریل ہو چکی ہو گی اور آواز اس کے منہ سے نکالے نہ نکلتی ہو گی۔ اس خیال سے کہ وہ پاکستان میں بڑی خوش رہی ہے، اسے بڑا صدمہ ہوا لیکن وہ چپ رہا کیوں کہ اس نے چپ رہنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ اگرچہ وہ نہ جان پایا کہ اتنی خوش تھی تو پھر چلی کیوں آئی؟ اس نے سوچا شاید ہند سرکار کے دباؤ کی وجہ سے اسے اپنی مرضی کے خلاف یہاں آنا پڑا ــــــ لیکن ایک چیز وہ نہ سمجھ سکا کہ لاجونتی کا سونلایا ہوا چہرہ زردی لیے ہوئے تھا اور غم، محض غم سے اس کے بدن کے گوشت نے ہڈیوں کو چھوڑ دیا تھا۔ وہ غم کی کثرت سے موٹی ہو گئی تھی اور صحت مند نظر آتی تھی لیکن یہ ایسی صحت مندی تھی جس میں دو قدم چلنے پر آدمی کا سانس پھول جاتا ہے ــــــ

مغویہ کے چہرے پر پہلی نگاہ ڈالنے کا تاثر کچھ عجیب سا ہوا۔ لیکن اس نے سب خیالات کا ایک اثباتی مردانگی سے مقابلہ کیا۔ اور بھی بہت سے لوگ موجود تھے کسی نے کہا ــــــ "ہم نہیں لیتے مسلران (مسلمان) کی جھوٹی عورت ــــــ"

اور یہ آواز رسالو، نیکی رام اور چوکی کلاں کے بوڑھے محرر کے نعروں میں گم ہو کر

رہ گئی۔ ان سب آوازوں سے الگ کالکا پرشاد کی پھٹی اور چلّاتی آواز آ رہی تھی ـــــ وہ کھانس بھی لیتا اور بولتا بھی جاتا۔ وہ اس نئی حقیقت، اس نئی شدھی کا شدّت سے قائل ہو چکا تھا یوں معلوم ہوتا تھا آج اس نے کوئی نیا وید کوئی نیا پران اور شاستر پڑھ لیا ہے اور اپنے اس حصول میں دوسروں کو بھی حصّے دار بنانا چاہتا ہے ـــــ ان سب لوگوں اور ان کی آوازوں میں گھرے ہوئے لاجو اور سندر لال اپنے ڈیرے کو جا رہے تھے اور ایسا جان پڑتا تھا جیسے ہزاروں سال پہلے کے رام چندر اور سیتا کسی بہت لمبے اخلاقی بن باس کے بعد اجودھیا لوٹ رہے ہیں۔ ایک طرف تو لوگ خوشی کے اظہار میں دیپ مالا کر رہے ہیں اور دوسری طرف انھیں اتنی لمبی اذیت دیے جانے پر تاسّف بھی۔

لاجونتی کے چلے آنے پر بھی سندر لال بابو نے اسی شدّ و مدّ سے دل میں بساؤ، پروگرام کو جاری رکھا۔ اس نے قول اور فعل دونوں اعتبار سے اسے نبھا دیا تھا اور وہ لوگ جنھیں سندر لال کی باتوں میں خالی خولی جذباتیت نظر آتی تھی، قائل ہونا شروع ہوئے۔ اکثر لوگوں کے دل میں خوشی تھی اور بیشتر کے دل میں افسوس۔ مکان ۴۱۴ کی بیوہ کے علاوہ محلّہ ملّا شکور کی بہت سی عورتیں سندر لال بابو سوشل ورکر کے گھر آنے سے گھبراتی تھیں۔

لیکن سندر لال کو کسی کی اعتنا یا بے اعتنائی کی پروا نہ تھی۔ اس کے دل کی رانی آ چکی تھی اور اس کے دل کا خلا پٹ چکا تھا۔ سندر لال نے لاجو کی سورن مورتی کو اپنے دل کے مندر میں استھاپت کر لیا تھا اور خود دروازے پر بیٹھا اس کی حفاظت کرنے لگا تھا۔ لاجو جو پہلے خوف سے سہمی رہتی تھی، سندر لال کے غیر متوقع نرم سلوک کو دیکھ کر آہستہ آہستہ کھلنے لگی۔

سندر لال، لاجونتی کو اب لاجو کے نام سے نہیں پکارتا تھا، وہ اسے کہتا تھا "دیوی"! اور لاجو ایک ان جانی خوشی سے پاگل ہوئی جاتی تھی۔ وہ کتنا چاہتی تھی کہ سندر لال کو اپنی واردات کہہ سنائے اور سناتے سناتے اس قدر روئے کہ اس کے سب گناہ دُھل جائیں لیکن سندر لال، لاجو کی وہ باتیں سننے سے گریز کرتا تھا اور لاجو اپنے

کھل جانے میں بھی ایک طرح سے سمٹی رہتی۔ البتہ جب سندر لال سو جاتا تو اسے دیکھا کرتی اور اپنی اس چوری میں پکڑی جاتی۔ جب سندر لال اس کی وجہ پوچھتا تو وہ "نہیں" "یونہیں" "اوںھوں" کے سوا اور کچھ نہ کہتی اور سارے دن کا تھکا ہارا سندر لال پھر اونگھ جاتا ـــــ البتہ شروع شروع میں ایک دفعہ سندر لال نے لاجونتی کے سیاہ دنوں، کے بارے میں صرف اتنا سا پوچھا تھا؛

کون تھا وہ؟

لاجونتی نے نگاہیں نیچی کرتے ہوئے کہا ـــــ "جاّں" ـــــ پھر وہ اپنی نگاہیں سندر لال کے چہرے پر جمائے کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن سندر لال ایک عجیب سی نظروں سے لاجونتی کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کے بالوں کو سہلا رہا تھا۔ لاجونتی نے پھر آنکھیں نیچی کر لیں اور سندر لال نے پوچھا؛

"اچھا سلوک کرتا تھا وہ؟"

"ہاں"

"مارتا تو نہیں تھا؟"

لاجونتی نے اپنا سر سندر لال کی چھاتی پر سرکاتے ہوئے کہا ـــــ "نہیں" اور پھر بولی "وہ مارتا نہیں تھا، پر مجھے اس سے زیادہ ڈر آتا تھا۔ تم مجھے مارتے بھی تھے پر میں تم سے ڈرتی نہیں تھی ـــــ اب تو نہ مارو گے؟"

سندر لال کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے اور اس نے بڑی ندامت اور بڑے تاسّف سے کہا ـــــ "نہیں دیوی! اب نہیں ـــــ نہیں ماروں گا ـــــ"

"دیوی!" لاجونتی نے سوچا اور وہ بھی آنسو بہانے لگی۔

اور اس کے بعد لاجونتی سب کچھ کہہ دینا چاہتی تھی لیکن سندر لال نے کہا؛

"جانے دو بیتی باتیں! اس میں تمھارا کیا قصور ہے؟ اس میں قصور ہے ہمارے سماج کا جو تجھ ایسی دیویوں کو اپنے ہاں عزت کی جگہ نہیں دیتا۔ وہ تمھاری ہانی نہیں کرتا اپنی کرتا ہے۔"

اور لاجونتی کی من کی من ہی میں رہی۔ وہ کہہ نہ سکی ساری بات اور چپکی دبکی پڑی رہی اور اپنے بدن کی طرف دیکھتی رہی جو کہ بٹوارے کے بعد اب "دیوی" کا بدن ہو چکا تھا۔ لاجونتی کا نہ تھا۔ وہ خوش تھی بہت خوش۔ لیکن ایک ایسی خوشی میں سرشار جس میں ایک شک تھا اور وسوسے۔ وہ لیٹی لیٹی اچانک بیٹھ جاتی جیسے انتہائی خوشی کے لمحوں میں کوئی آہٹ پاکر ایکا ایکی اس کی طرف متوجہ ہو جائے ——

جب بہت سے دن بیت گئے تو خوشی کی جگہ پورے شک نے لے لی۔ اس لیے نہیں کہ سندر لال بابو نے پھر وہی پرانی بدسلوکی شروع کر دی تھی بلکہ اس لیے کہ وہ لاجو سے بہت ہی اچھا سلوک کرنے لگا تھا۔ ایسا سلوک جس کی لاجو متوقع نہ تھی —— وہ سندر لال کی وہی پرانی لاجو ہو جانا چاہتی تھی جو گاجر سے لڑ پڑتی اور مولی سے مان جاتی۔ لیکن اب لڑائی کا سوال ہی نہ تھا۔ سندر لال نے اسے یہ محسوس کرا دیا جیسے وہ —— لاجونتی کانچ کی کوئی چیز ہے جو چھوتے ہی ٹوٹ جائے گی —— اور لاجو آئینے میں اپنے سراپا کی طرف دیکھتی اور آخر اس نتیجے پر پہنچتی کہ وہ اور تو سب کچھ ہو سکتی ہے پر لاجو نہیں ہو سکتی۔ وہ بس گئی، پر اُجڑ گئی —— سندر لال کے پاس اُس کے آنسو دیکھنے کے لیے آنکھیں تھیں اور نہ آہیں سننے کے لیے کان! —— پربھات پھیریاں نکلتی رہیں اور محلہ ملّا شکور کا سدھارک رسالو اور نیکی رام کے ساتھ مل کر اُسی آواز میں گاتا رہا:

ہتھ لائیاں کملان نی، لاجونتی دے بوٹے ——

جوگیا

نہا دھو کر، نیچے کے تین ساڑھے تین کپڑے پہنے، جوگیا روز کی طرح اس دن بھی الماری کے پاس آ کھڑی ہوئی اور میں اپنے بان سے تھوڑا پیچھے ہٹ کر دیکھنے لگا۔ ایسے میں دروازے کو ہاتھ جو لگا تو 'چوں' کی ایک بے سری آواز پیدا ہوئی۔ بڑے بھیا جو کہیں پاس ہی بیٹھے شیو بنا رہے تھے، مڑ کر بولے،

"کیا ہے جگل؟"

"کچھ نہیں موٹے بھیا،" میں نے انھیں ٹالتے ہوئے کہا —— "گرمی بہت ہے۔"

اور میں پھر سامنے دیکھنے لگا —— ساری کے سلسلے میں جوگیا آج کون سا رنگ چنتی ہے؟ —— میں جے جے اسکول آف آرٹس میں پڑھتا تھا، رنگ میرے حواس پر چھائے رہتے تھے۔ رنگ مجھے مرد عورتوں سے زیادہ ناطق معلوم ہوتے تھے اور آج بھی ہوتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ لوگ اکثر بے معنی باتیں کرتے ہیں لیکن رنگ کبھی معنی سے خالی بات نہیں کرتے۔

ہمارا مکان کالبا دیوی کی وادی شیٹ اگیاری لین میں تھا۔ پارسیوں کی اگیاری تو کہیں دور گلی کے موڑ پر تھی۔ یہاں پر صرف مکان تھے آمنے سامنے جو ایک

دوسرے سے بغل گیر ہو رہے تھے۔ ان مکانوں کی ہم آغوشیاں کہیں تو ماں بچے کے پیار کی طرح دھیمی دھیمی، ملائم، ملائم اور صاف ستھری تھیں اور کہیں مرد عورت کی محبت کی طرح مجنونانہ۔ سینہ بہ سینہ، لب بہ لب، غلیظ اور ——— مقدس ———

سامنے باپنو گھر کی قسم کے کمروں میں جو کچھ ہوتا تھا، وہ ہمارے ہاں گیان بھون سے صاف دکھائی دیتا ——— ابھی بجور کی ماں ترکاری چھیل رہی ہے اور چاقو سے اپنا ہی ہاتھ کاٹ لیا ہے۔ ڈنکر بھائی نے احمد آباد سے گھی اور تیل کے دو پیپے منگوائے ہیں اور ہنجا بن سب کی نظریں بچا کر انڈوں کے چھلکے کوڑے کے ڈھیر میں پھینک کر بھاگ رہی ہے۔ جیسے ہمارے گیان بھون سے ان لوگوں کا کھایا پیا سب نظر آتا تھا ایسے ہی انھیں بھی ہمارا سب کچھ نظر آتا ہوگا۔

جوگیا کے گھر کا نام تو رنچھوڑ نواس تھا لیکن میں اسے باپنو گھر کہتا تھا۔ اس لیے کہ اس میں عام طور پر بدھوائیں اور چھوڑی ہوئی عورتیں رہتی تھیں ان میں ایک جوگیا کی ماں تھی جو دن بھر کسی درزی گھر میں سلائی کی مشین چلاتی اور اس سے اتنا پیسا پیدا کر لیتی جس سے اپنا اور اپنی بیٹی کا پیٹ پال سکے اور ساتھ ہی جوگیا کی تعلیم بھی مکمل کرے۔

جوگیا سترہ اٹھارہ برس کی ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ قد کوئی ایسا چھوٹا نہ تھا لیکن بدن کے بھرے پُرے اور گٹھے ہونے کی وجہ سے اس پر چھوٹا ہونے کا گمان گزرتا تھا۔ کسی کو یقین بھی نہ آسکتا تھا کہ جوگیا دال، رنگنا اور ہفتے میں ایک آدھ بار کی شری کھنڈ سے اتنی تندرست ہو سکتی تھی بہر حال ان لڑکیوں کا کچھ مت کہیے۔ جو بھی کھاتی ہیں سب اَلَم غَلَم ان کے بدن کو لگتا ہے اور بعض وقت تو غلط حصّوں کو لگتا ہے جنھیں میں تو صحیح حصّے کہتا ہوں کیونکہ عورت کے جسم میں پتلے پتلے، پیلے پیلے خطوط کی بہ نسبت، مجھے گہرے گہرے اور بھرپور خط اچھے لگتے ہیں۔ جوگیا کا چہرہ سومنات مندر کے پیش رُخ کی طرح چوڑا تھا جس میں قندیل جیسی آنکھیں، رات کے اندھیرے میں بھٹکے ہوئے مسافروں کو روشنی دکھاتی تھیں۔ مورتی میں ناک اور ہونٹ زمرد اور یاقوت کی طرح ٹنکے ہوئے تھے، سر کے بال کمر سے نیچے تک کی پیمایش کرتے تھے جنھیں وہ کبھی

ڈھیلا ڈھیلا اور بھیگا بھیگا رکھتی اور کبھی اس قدر خشک بنا دیتی کہ ان کی کچھ لٹیں باقی بالوں سے خواہ مخواہ الگ ہو کر چہرے اور گردن پر مچلتی رہتیں۔ اس کا چہرہ کیا تھا، پورا تارا منڈل تھا جس میں چاند خیالوں اور جذبوں کے ساتھ گھٹتا اور بڑھتا رہتا تھا۔ جوگیا یوں بڑی بھولی تھی لیکن اپنے آپ کو سجانے بنانے کے سلسلے میں بہت چالاک تھی۔ کب اور کس وقت کیا کرنا ہے وہ خوب جانتی تھی اور اس کے اس جاننے میں اس کی تعلیم کا بڑا ہاتھ تھا جس نے اس کے حُسن کو دوبالا کر دیا تھا۔ گڑبڑ تھی تو صرف رنگ کی کیوں کہ جوگیا کا رنگ ضرورت سے زیادہ گورا تھا جسے دیکھتے ہی زکام کا سا احساس ہونے لگتا۔ اگر باقی کی چیزیں اتنی متناسب نہ ہوتیں تو بس، چھٹی ہو گئی تھی۔

میں نہیں جانتا محبّت کس چڑیا کا نام ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ جوگیا کو دیکھتے ہی میرے اندر دیواریں سی گرنے لگتی تھیں اور جہاں تک مجھے یاد ہے جوگیا بھی مجھے دیکھ کر غیر متعلق باتیں کرنے لگتی۔ جوگیا میری بھتیجی ہیا کی سہیلی تھی۔ عجیب سہیل پنا تھا ——— ہیا صرف سات سال کی تھی اور جوگیا اٹھارہ برس کی۔ ان کی دوستی کی کوئی وجہ تھی جسے صرف جوگیا جانتی تھی اور یا پھر میں جانتا تھا۔ موٹے بھیا اور بھابی صرف یہی سمجھتے تھے کہ وہ ہیا سے پیار کرتی ہے۔ اس لیے اسے پڑھانے آتی ہے۔ یوں ہمارے گھر میں آکر جوگیا سب کو سبق دے جاتی تھی۔ میں جو ایک آرٹسٹ بننے جا رہا تھا۔ ایسی رکھ رکھاو کی باتوں کا قائل نہ تھا۔ لیکن میری مجبوریاں تھیں۔ میں نے کمانا شروع نہیں کیا تھا اور میرے ہر قسم کے خرچ کا مدار موٹے بھیا پر تھا۔ البتہ بیچ بیچ میں مجھے اس بات کا بھی خیال آتا تھا کہ اس داؤ گھات میں بھی ایک مزہ ہے۔ مغرب میں لڑکے لڑکیاں جو اتنی آسانی سے ایک دوسرے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں بنا کسی التہاب کے ایک دوسرے کی آغوش میں چلے آتے ہیں خاک لطف اٹھاتے ہیں ؛ اتفاقاً محبوبہ کے بدن سے چھو جانے پر ان کے اندر تو کوئی بجلی نہ دوڑتی ہو گی ؟ شاید ان کو کوئی ایسا لطف ملتا ہو جو ہمارے لطف سے ارفع ہو۔ لیکن ہمارے ہاں صرف لمس اور ادھر ادھر کی باتوں ہی میں ایسے تلذّذ کا احساس ہوتا ہے کہ ان کے وصال میں بھی کیا ہوگا ؟

یوں ہی دو چار بار میرا ہاتھ جوگیا کے پنڈے کو لگ گیا ہوگا۔ ایک بار صرف ایک بار میں نے اپنے ارادے سے اس کا منہ چوما تھا۔

ہم گھر سے تھوڑے تھوڑے وقفے اور فاصلے کے ساتھ نکلتے تھے اور پھر پارسیوں کی اگیاری کے پاس مل جاتے ہمارے اس راز کو صرف وہ پارسی پجاری ہی جانتا تھا جو فرشتوں کے لباس میں اگیاری کے باہر بیٹھا ہوتا اور منہ میں ژند اَوستا پڑھتا رہتا تھا۔ وہ صرف ہمارے سروش کو سمجھتا تھا۔ اس لیے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے ہم آسے ضرور "صاحب جی" کہتے اور پھر اس راستے پر چل پڑتے جو دنیا کے لہو ولعب میٹرو سنیما کی طرف جاتا تھا جہاں پہنچ کر جوگیا اپنے کالج کی طرف چل دیتی اور میں اپنے اسکول کی طرف۔ راستے بھر ہم غیر منطقی باتیں کرتے اور ان سے پورا حظ اٹھاتے اگر پیار کی باتیں ہوتیں بھی تو کسی دوسرے کے پیار کی جن میں وہ مرد کو ہمیشہ بدمعاش کہتی اور پھر اس بات پر کڑھتی بھی کہ اس کے بغیر بھی گزارا نہیں۔ ایک دن جہانگیر آرٹ گیلری میں کسی آرٹسٹ کی منفرد نمایش تھی اور پورے شہر بمبئی میں سے کوئی بھی اس بدنصیب کی تصویروں کو دیکھنے اور خریدنے نہ آیا تھا۔ صرف میں اور جوگیا پہنچے تھے اور وہ بھی تصویریں دیکھنے کی بجائے ایک دوسرے کو دیکھنے۔ محسوس کرنے کے لیے، پورے ہال میں ہمارے سوا کوئی نہ تھا اور تین طرف سے رنگ ہمیں گھور رہے تھے۔ "جوہو میں ایک صبح" کے نام کی ایک بڑی سی تصویر تھی جس میں اوپر کے حصے پر برش سے گہرے سرخ رنگ کو سوتے موٹے اور بھدے طریقے سے تھوپا اور پچارا گیا تھا۔ اس نے ہماری روحوں تک میں التہاب پیدا کر دیا۔ تصویر کے نیچے ایک اسٹول سا پڑا تھا جس پر جوگیا کسی اندرونی تکان کے احساس سے بیٹھ گئی اس کی سانس قدرے تیز تھی اور میں جانتا تھا محبت میں ایک قدم بھی بعض اوقات سیکڑوں فرسنگ ہوتا ہے ــــــ اور آدمی چلنے سے پہلے تھک جاتا ہے ــــــ

آرٹسٹ روہانسا ہو کر باہر چلا گیا ــــــ دیکھنے کوئی آتا مرتا ہے یا نہیں۔ اپنی نفرت میں وہ ہماری محبت کو نہ دیکھ سکا تھا۔

جبھی ہم دونوں کے اکیلے پن نے سارے ہال کو بھر دیا۔

اس دن میں نے جوگیا سے سب کہہ دینا چاہا۔ ہم دونوں ہی پیار کی ہیرا پھیریوں سے تنگ آ چکے تھے۔ چنانچہ میں نے ایک قدم آگے بڑھایا ٹھٹھکا اور پھر اسٹول کے پاس جوگیا کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ میں کہہ بھی سکا تو بس اتنا ــــــ "جوگیا! میں تمھیں ایک لطیفہ سناؤں؟"

"سامنے آ کے سناؤ" جوگیا بولی ــــــ

میں نے کہا "لطیفہ ہی ایسا ہے ــــــ جوگی!"

میری طرف دیکھے بغیر ہی آسے میرے حیص بیص کا اندازہ ہو رہا تھا اور مجھے پیچھے اس کے کانوں کی لووں سے اس کی مسکراہٹ دکھائی دے رہی تھی۔ آخر میں نے لطیفہ شروع کیا۔

"ایک بہت ہی ڈرپوک قسم کا پریمی تھا"

"ہوں" ــــــ جوگیا کے سنبھلنے ہی سے اس کی دلچسپی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ پھر میں نے کہا ــــــ "وہ کسی طرح بھی اپنی پریمیکا کو اپنا پیار نہ جتا سکتا تھا"

اس پر جوگیا نے تین چوتھائی میں میری طرف دیکھا ــــــ "تم لطیفہ سنا رہے ہو؟"

"ہاں!" میں نے کچھ خفیف ہوتے ہوئے کہا۔

اور جوگیا پھر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی ــــــ منتظر ــــــ ایک ایسا انتظار جو بہت ہی لمبا ہو گیا تھا، جس میں لمحات کے شرارے کسی بارود سے پھوٹ پھوٹ کر نکل رہے تھے، خلائیں پھٹ رہے تھے اور آخر معدومیت کا حصہ ہوتے جا رہے تھے۔ جبھی "جوہو میں ایک صبح" میں لال رنگ کے بیچ سے سورج کی کرن نیچے سمندر کی سیاہیوں میں ڈولتی ہوئی کشتی پر پڑی اور میں نے کہا ــــــ "وہ لڑکی اپنے پریمی سے تنگ آ گئی۔ آخر اس نے سوچا اس بچارے میں تو ہمت ہی نہیں۔ کیوں نہ میں اسے کوئی ایسا موقع دوں شاید ــــــ چنانچہ

اس نے اپنے جنم دن پر لڑکے کو بلا لیا۔ لڑکا آیا بھی، گلدستہ بھی لایا جسے ہاتھ میں لیتے ہوئے اس کی پریمیکا نے کہا ـــــ ہے کتنا پیارا ہے، یہ اودے میں گلابی گلابی میں سبز رنگ کے پھول ـــــ پھر؟ جوگیا کی بے صبری پیچھے سے بھی دکھائی دے رہی تھی۔

ان کے بدلے تو کوئی میرا مُنہ بھی چوم لے۔" پھر ـــــ لڑکی نے اپنا مُنہ تھوڑا آگے کر دیا، مگر ـــــ وہ لڑکا باہر جا رہا تھا، دروازے کی طرف۔"

"ہے بھگوان" اور جوگیا نے ہاتھ اپنے ماتھے پر مار لیا۔

میں نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا ـــــ لڑکی بولی "کہاں جا رہے ہو لالی؟"

لالی نے دروازے کے پاس مُڑتے ہوئے کہا ـــــ "اور پھول لینے"

اس سے پہلے کہ جوگیا ہنستی اور اس کا انتظار ابدیت پر چھا جاتا میں نے پیچھے سے اس کے دونوں بازو جکڑ کر اس کا مُنہ چوم لیا تھا۔ اب جوگیا بناوٹی غصّے سے مجھے ہلکے ہلکے تھپڑ لگا رہی تھی اور اپنے ہونٹ پونچھ رہی تھی۔ وہ ہنس نہ سکی کیوں کہ وہ ناراض تھی اور خوش بھی۔ محبّت کے اس بے برگ وگیاہ سفر میں ایکا ایکی زمین کا کوئی ایسا ٹکڑا چلا آیا تھا جسے بارش کے چھینٹوں نے ہرا بھرا کر دیا تھا ـــــ اس دن اگر ہم جوشیلے، گہرے سرخ رنگ کی تصویر کے نیچے کھڑے نہ ہوتے تو میں جوگیا کا مُنہ نہ چوم سکتا تھا۔ اس کے بعد آرٹ کا دلدادہ کوئی آدمی آیا اور اس نے بازو والی تصویر خرید لی جس کا نام تھا "کوئی کسی کا نہیں" اور جس میں ایک عورت سر ہاتھوں میں دیے رو رہی تھی۔ سب رنگوں میں اُداسی تھی اور وہ ایسے وقت میں اُداسی کے رنگ خرید رہا تھا جب کہ سب کھلتے ہوئے رنگ ہمارے تھے جیب میں ایک پائی نہ ہونے کے باوجود سب تصویریں ہماری تھیں، نمایش ہماری تھی۔ جوگیا ایک عظیم تشفی کے احساس سے معمور باہر دروازے کے پاس پہنچ چکی تھی جہاں سے اس نے ایک بار مڑ کر میری طرف دیکھا، مُکا دکھایا، مسکرائی اور بھاگ گئی ـــــ

کچھ دیر یونہی اِدھر اُدھر رنگ اُچھالنے کے بعد میں بھی باہر چلا آیا۔ دنیا کی

سب چیزیں اس روز اُجلی اُجلی دکھائی دے رہی تھیں۔ لوگوں نے ایسے ہی رنگوں کے نام اُودا، سفید، کالا اور نیلا وغیرہ رکھے ہوئے ہیں۔ کسی کو خیال بھی نہیں آیا۔ ایک رنگ ایسا بھی ہے جو اُن کی جمع تفریق میں نہیں آتا اور جسے اُجلا کہتے ہیں اور جس میں دھنک کے ساتوں رنگ چھپے ہوتے ہیں ـــــ میرا گلا تشکّر کے احساس سے رندھا ہوا تھا۔ میں کس کا شکریہ ادا کر رہا تھا؟ ـــــ اس ایک لمس سے جوگیا ہمیشہ کے لیے میری ہو گئی تھی۔ میں جیسے اس کی طرف سے بے فکر ہو گیا تھا۔ اب وہ کسی کے ساتھ بیاہ بھی کر لیتی، کسی کے ساتھ سو بھی جاتی، جب بھی وہ میری تھی۔ ایسا چھن جس میں سچّائی ہو، ولولہ ہو، بدنصیب شوہر کو کہاں ملتا ہے؟

تو گویا میں اس دن دیکھ رہا تھا کون سے رنگ کی ساری جوگیا اپنی الماری میں سے نکالتی ہے۔ اگر وہ مجھے میرے ہال کے دروازے کے پیچھے دیکھ لیتی تو ضرور اشارے سے پوچھتی ـــــ آج کونسی ساری پہنوں اور اس میں سارا مزہ کرکرا ہو جاتا۔ میں تو جاننا چاہتا تھا، صبح سویرے، نہا دھو کر جب کوئی سندری اپنی ساریوں کے ڈھیر کے سامنے کھڑی ہوتی ہے تو اس میں کونسی چیز ہے جو اس بات کا فیصلہ کرتی ہے ـــــ آج گلابی رنگ کی ساری پہننی چاہیے۔ ان عورتوں کے سوچنے کا طریقہ بڑا پُراسرار ہے، اور پُرپیچ، اتنا بھید، اتنا رہسیہ کہ مرد اس کی تھاہ کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ سُنا ہے چاند نہ صرف عورت کے خون بلکہ اس کے سوچ بچار پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ لیکن چاند کا اپنا تو کوئی رنگ ہی نہیں، روشنی ہی نہیں۔ وہ تو سب سورج سے مستعار لیتا ہے ـــــ جبھی ـــــ جبھی ساری پہننے سے پہلے عورت ہمیشہ اپنے کسی سورج سے پوچھ لیتی ہے ـــــ... آج کونسی ساری پہنوں؟

نہیں، نہیں ـــــ اس کا اپنا رنگ ہے، اپنا فیصلہ۔ ہر کسی کو کوئی مرد تھوڑا ہی بتانے جاتا ہے؟ پھر رات ـــــ رجنی کا بھی تو ایک رنگ ہوتا ہے اس کا اپنا رنگ ـــــ جسے دیکھ کر گاتے ہیں۔ مو ہے شیام رنگ دئی دے ـــــ

مورا گورا رنگ لئی لے ______

اس دن بہت گرمی تھی۔ نیچے وادی شیٹ اگیاری لین میں آتے جاتے لوگ ریت کے رنگ کی سڑک پر سے گزرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا موسم کی بھٹیارن کہیں دانے بھون رہی ہے۔ جبھی کوئی پنجابی یا مارواڑی بڑا سا پگڑ باندھے آتا تو اوپر سے بالکل مکی کا دانہ معلوم ہوتا جو بھٹی کی آنچ میں پھول کر سفید ہو جاتا ہے۔

یہاں گیان بھون سے مجھے صرف رنگ کے چھینٹے دکھائی دیے۔ وہ سب ساریاں تھیں جن میں سے ایک جوگیا اپنے لیے، میرے لیے ساری دنیا کے لیے چن رہی تھی۔ یوں ہی اس نے ایک بار میرے گھر کی طرف دیکھا شاید اس کی نگاہیں مجھے ڈھونڈ رہی تھیں۔ لیکن میں نے تو کسی اوٹ کی سلیمانی ٹوپی پہن رکھی تھی جس سے میں تو ساری دنیا کو دیکھ سکتا تھا لیکن دنیا مجھے نہ دیکھ سکتی تھی۔ اس دن میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی جب میں نے دیکھا جوگیا نے ہلکے نیلے رنگ کو چُنا ہے۔ ایسی گرمی میں یہی ٹھنڈا رنگ اچھا معلوم ہوتا تھا۔ اگر میں ہوتا تو جوگیا کو یہی رنگ پہننے کا مشورہ دیتا۔ جبھی میں نے سوچا میں نے بہت چھپنے کی کوشش کی، لیکن جوگیا نے جانے اپنے من میں مجھے بلا کر مجھ سے پوچھ ہی لیا ہے۔

پھر وہی شروع کی جدائی اور آخر کا میل۔ معلوم ہوتا تھا اگیاری تک یہ دُنیا اور اس کے قانون ہیں۔ اس کے بعد کوئی قانون ہم پر لاگو نہیں ہوتا۔

میں نے بڑھ کر جوگیا کے پاس پہنچتے ہوئے کہا "آج تم نے بڑا پیارا رنگ چُنا ہے، جوگی ______"

"میں جانتی تھی تم اسے پسند کرو گے۔"

"تم کیسے جانتی تھیں؟"

"ایسے ہی ______ کبھی کبھی تمھارا من میرے من میں آجاتا ہے۔"

"ہوں" میں نے سوچتے ہوئے کہا ______ "آج تمھیں چھونے، ہاتھ لگانے کو بھی جی نہیں چاہتا۔"

"کیا چاہتا ہے؟"

اس وقت ایک وکٹوریہ ہم دونوں کے بیچ آگئی جسے نکلنے میں صدیاں لگیں میری نگاہیں پھر جھیلوں میں تیرنے، چھینٹے اڑانے لگیں۔ جب تک ہم پرنسس اسٹریٹ کا چوراہا پار کر کے میٹرو کے پاس آ چکے تھے جہاں سے ہمارے راستے جدا ہوتے تھے۔

میں نے کہا ______ "آج جی چاہتا ہے سر تمھارے پیروں پر رکھ دوں اور روؤں۔"

"روؤں؟ ______ کیوں؟"

"شاستر کہتے ہیں آتما کے پاپ رونے ہی سے دُھل سکتے ہیں۔"

"کون سا پاپ کیا ہے تمھاری آتما نے؟"

"ایسا پاپ جو میرا شریر نہ کر سکا۔"

ایسی باتوں کو عورتیں بالکل نہیں سمجھتیں اور یا پھر ضرورت سے زیادہ سمجھ جاتی ہیں۔ جوگیا نہ سمجھ سکی۔ اپنا کوئی بچارا اس کے من میں چلا آیا تھا ______ "جانتے ہو میرا جی کیا چاہتا ہے؟"

"کیا ______ کیا ______ کیا؟" میں نے بے صبری سے پوچھا۔

"چاہتا ہے" اس نے اپنی ہلکے نیلے رنگ کی ساری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تمھیں اس میں چھپا کر ان امبروں پر اڑ جاؤں، جہاں سے آپ ہی واپس آؤں، نہ تمھیں آنے دوں" اور یہ کہتے ہوئے جوگیا نے ایک بار اوپر، ہلکے نیلے رنگ کے آسمان کی طرف دیکھا جہاں سے وہ کبھی آئی تھی۔

میں کچھ دیر کے لیے وہیں تھم گیا اور ان خوش نصیبوں کے بارے میں سوچنے لگا جنھیں جوگیا ایسی سندریاں اپنے دامن میں چھپا کر امبروں پر لے گئیں جہاں سے وہ خود آئیں اور نہ انھیں آنے دیا۔ خدا بھی ان کے پاس سے گزرا تو ایک سرد آہ بھر کر چلا گیا۔

مڑ کے دیکھا تو جوگیا جا چکی تھی۔

امبر تو کہاں، جوگیا مجھے تپتی ہوئی زمین اور ٹوٹی پھوٹی سڑک کے ایک

طرف اکیلا بے یار و مددگار چھوڑ گئی تھی جس کا احساس مجھے خاصی دیر کے بعد ہوا۔ حدت سے پھٹتی ہوئی سڑک کی دراڑوں میں گھوڑا گاڑیوں کے بڑے بڑے پہیے پھنس رہے تھے اور ان کے ڈرائیور پیشانیوں پر سے پسینا پونچھتے ادھر ادھر تبرّے سناتے ہوئے آ جا رہے تھے۔ جبھی میں نے دیکھا خنک آب کی سی کوئی موج چلی آ رہی ہے۔
وہ کوئی اور جوان لڑکی تھی —— لانبی، اونچی، باب کیے ہوئے بال۔
وہ ہلکے نیلے رنگ کی شلوار پہنے ہوئے تھی!

چند قدم اور آگے گیا تو ایک نہیں، دو، تین، چار عورتیں ہلکے نیلے رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے شاپنگ کرتی پھر رہی تھیں!

یہ تجربہ مجھے پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ اس سے پہلے بھی ایک بار کرافورڈ مارکیٹ کے علاقے میں آنے جانے والی سب عورتوں نے دھانی لباس پہن رکھا تھا۔ فرق تھا تو صرف اتنا کسی کی اوڑھنی دھانی تھی اور کسی کی ساری۔ اسکرٹ بھی دھانی تھے اور میں سوچتا رہ گیا تھا —— سویرے جب یہ عورتیں نہا دھو کر بالوں کو چھانٹتی بناتی ہوئی کپڑوں کی الماری کے پاس پہنچتی ہیں تو ان میں کونسی بات، کون سا ایسا جذبہ ہے جو انھیں بتا دیتا ہے —— آج مولسری پہننا چاہیے؟ یہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ ایک دن کوئی نارنجی رنگ استعمال کرتی ہے تو پھر اس سے اس کی طبیعت اُوب جاتی ہے اور پھر دوسرے دن اس کا ہاتھ اپنے کسی دوسرے رنگ کی طرف اُٹھ جاتا ہے۔ مثلاً سرسوں کا سا پیلا رنگ، چمپئی رنگ، گل اناری، کاسنی، فیروزی —— لیکن —— وہ کونسا بے تار برقی کا عمل ہے جس سے وہ سب کی سب ایک دوسری کو بتا دیتی ہیں اور پھر ایکا ایکی پورا بازار، پورا سنسار ایک ہی رنگ سے رنگ جاتا ہے؟ شاید یہ موسم کی بات ہے یا ویسے ہی چاندنی، بادل کی —— شاید کوئی مروّجہ فیشن، کسی ایکٹرس کا لباس ہے جو ان کے انتخاب میں دخل رکھتا ہے، نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔ بعض اوقات وہ رنگا رنگ کپڑے بھی پہنتی ہیں اور کیا کچھ مرد کی آنکھوں کے سامنے لہرا دیتی ہیں۔

اس دن سب کی ساریاں ہلکے نیلے رنگ کی دیکھ کر میری آنکھوں کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ سمجھ کا شمّہ بھر بھی دماغ میں نہ گھس سکتا تھا۔ میں اسکول پہنچا تو ایک کلاس ختم ہو چکی تھی اور لڑکے لڑکیاں باہر آ رہے تھے۔ کچھ آکر کمپاؤنڈ میں گل مہر کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ ان میں سکیشی بھی تھی۔ اس کے اسکرٹ کا بھی رنگ نیلا تھا ——!

اگر ہیمنت میرا دوست وہاں نہ مل جاتا تو میں پاگل ہو جاتا۔ ہیمنت یوں تو خزاں کو کہتے ہیں لیکن وہ حقیقت میں واسنت تھا —— بہار جو اس پر ہمیشہ چھائی رہتی تھی دنیا بھر میں کہیں، کسی جگہ بھی ایک ہی موسم نہیں رہتا اور نہ ایک رنگ رہتا ہے لیکن اس کے چہرے پر ہمیشہ ایک ہی سی ہنسی رہتی تھی جس کے کارن ہم اسے کہا کرتے تھے —— "سالے! چاہے کتنا زور لگا لے تو کبھی آرٹسٹ نہیں بن سکتا۔ کیا تجھ پر گریبان پھاڑ کر باہر بھاگ جانے کی نوبت آئی ہے؟ بے بسی میں تشنج ہاتھ تو نے ہوا میں پھیلائے ہیں اور اپنے بال نوچے ہیں؟ کیا تیرے بدن پر ایکا ایکی لاکھوں ٹڈے رینگتے ہیں —— رات کے وقت اندھیرے میں چمگادڑ تجھ پر جھپٹے ہیں اور اپنا منہ تیری شہ رگ سے لگا کر تیرا خون چوسا ہے؟ کیا تو اس وقت بچوں کی طرح رویا ہے جب تیری تصویر انعامی مقابلے میں اوّل آئی؟ کیا تجھے ایسا محسوس ہوا ہے کہ ماں باپ ہوتے ہوئے بھی تو یتیم ہے اور دوست ایک ایک کر کے تجھے اندھے کنوئیں میں دھکیل کر چل دیے ہیں؟ کیا تو نے جانا ہے جس منصور کو سولی پر چڑھایا گیا تھا وہ تو تھا؟ تیرے چہرے پر سیاہیاں چھٹی ہیں اور تیرے خدوخال اتنے سخت، گھناونے اور طاقتور ہوئے ہیں جتنے میکسیکو کے میورلز؟ کیا تجھے ہر لمبوتری چیز ایک لنگ اور پٹیر یرکی گانٹھ یونی معلوم ہوئی ہے جس سے متوحش ہو کر......

آج پھر میں نے اسے بتایا —— شہر کی سب عورتیں ہلکا نیلا لباس پہنے نکل آئی ہیں۔ ہیمنت نے اپنے دانت دکھا دیے اور حسبِ معمول میرا مذاق اڑانے لگا۔ وہ مجھے ساون کا اندھا سمجھتا تھا۔ جسے ہر طرف ہرا ہی ہرا دکھائی دیتا ہے۔

میں نے سکیشی کی طرف اشارا کیا جسے ہم ماڈل کہا کرتے تھے۔ وہ آج تک کسی کی ماڈل نہ بنی تھی لیکن اس کے بدن کے خطوط بالکل ویسی لڑکیوں کے تھے۔ میں نے کہا ــــ

"دیکھو آج یہ بھی ہلکے نیلے رنگ کا اسکرٹ پہنے ہوئے ہے ــــ"

ہیمنت نے کچھ نہ کہا وہ میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا کمپاؤنڈ سے لان پر لے آیا۔ جو پام کے پیڑوں سے پٹا پڑا تھا۔ وہاں ایک کنارے پر پہنچ کر وہ باڑ کے پیچھے کھڑا ہو گیا جہاں سے سامنے سڑک دکھائی دیتی تھی۔ ایک راستہ کرافورڈ مارکیٹ کی طرف جاتا اور دوسرا کٹوریہ ٹرمنیس اور ہارن بی روڈ کی طرف۔ وہ ثابت کرنا چاہتا تھا یہ سب میرا وہم ہے۔ وہاں پہنچے تو کوئی عورت ہی نہ تھی۔ اگر عورتیں اپنے مردوں کو ہلکے نیلے رنگ کی ساریوں میں چھپا کر اوپر امبروں پر اڑ گئی ہوتیں تو وہاں مرد نظر نہ آتے ــــ لیکن ــــ چاروں طرف مرد ہی مرد تھے اور وہ یوں گھوم پھر رہے تھے جیسے کسی عورت سے سروکار ہی نہیں۔ کوئی لامبا تھا اور کوئی ناٹا۔ کوئی خوبصورت اور کوئی بدصورت اور تو ندیلا۔ اور وہ سب بھاگ رہے تھے جیسے انھیں کسی عورت کو جواب نہیں دینا ہے۔ جبھی ادھر سے جیسے لوہے کی بنی ہوئی گھاٹن گزری جس نے ہرے رنگ کا کاشٹا لگا رکھا تھا۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہیمنت بولا ــــ "پہچان اپنی اس ماں کو ــــ"

میں نے بیکار کی عذرداری کی ــــ "میں ان بچاری غریب مزدور عورتوں کی بات نہیں کرتا۔"

"کن کی کرتے ہو؟"

"ان کی ــــ جن کے پاس کپڑے تو ہوں۔"

جبھی میری بدقسمتی سے ایک سیڈان، سامنے، پارسی دارو والے کے ہاں رکی۔ اس میں ادھیڑ عمر کی ایک عورت بیٹھی تھی۔ وہ اس جماعت کی نمائندہ تھی جس کے پاس نہ صرف کپڑے ہوتے ہیں بلکہ بے شمار ہوتے ہیں اور رنگ اتنی انواع کے کہ وہ بوکھلا جاتی ہیں اسی لیے جب وہ اپنے وارڈروب کے سامنے کھڑی ہوتی

ہیں تو انھیں سندریوں کا وہ بے تار برقی کا پیغام نہیں آتا۔ ان کی حالت اس خریدار کی ہوتی ہے جس کے سامنے کوئی دکاندار انواع واقسام کا ڈھیر لگا دے اور وہ ان میں سے کچھ بھی نہ چن سکیں۔ وہ عورت خوب لپی پتی ہوئی تھی اور اس نے ایک شعلہ رنگ ساری پہن رکھی تھی۔ پچاس فیٹ چوڑی سڑک کے اس پار سے مجھے اس کی وجہ سے گرمی لگ رہی تھی لیکن اسے اس بات کا احساس نہ تھا کہ باہر آگ برس رہی ہے جس میں ایسا شعلے کا سا رنگ نہ چلے گا۔

اس عورت کا نوکر جو تھوڑی دیر پہلے پرمٹ کے کاغذ سنبھالتا ہوا اندر گیا تھا، ایک ٹوکری میں کچھ وہسکی اور چند بیئر کی بوتلیں رکھے ہوئے باہر چلا آیا اور ڈکی کھول کر اس میں رکھنے لگا۔ جب تک میں ہیمنت کے سامنے خفیف ہو چکا تھا اپنی خفت کو چھپانے کے لیے میں نے کہا:

"یہ بیئر کی بوتلیں ــــ کم از کم اس کے مرد کو تو گرمی لگتی ہے۔"

ایسے ہی میں ہیمنت کے سامنے کئی بار شرمندہ ہوا۔ ایک آدھ بار مجھے اُسے شرمسار کرنے کا موقع مل گیا جب کہ سب عورتیں سرمئی ساریاں پہنے سڑک پر چلی آئی تھیں۔ مجھے ہمیشہ ان کے رنگ ایک سے لگتے تھے لیکن جب ہیمنت میرا کان پکڑ کر مجھے باہر لاتا تو مجھے وہ الگ الگ دکھائی دینے لگتے۔ آخر میں نے اسے اپنے دل کا واہمہ سمجھ کر ان باتوں کا خیال ہی چھوڑ دیا۔

لیکن ــــ وہ چھوڑتا کیسے؛ ایک دن جوگیا نے کالے بلاؤز اور خاکستری رنگ کی ساری کا بے حد خوبصورت امتزاج پیدا کیا تھا۔ اس دن سب عورتوں نے یہی کمبی نیشن کر رکھا تھا۔ فرق تھا تو صرف اتنا کہ ان میں کسی کا بلاؤز خاکستری تھا تو ساری کالے رنگ کی تھی جس میں سنہرے کا ایک آدھ تار جھلملا رہا تھا۔

کئی موسم بدلے۔ خزاں گئی تو بہار آئی ــــ یعنی جس قسم کی خزاں اور بہار بمبئی میں آسکتی ہے اور پھر اس بہار میں ایک کاہش سی پیدا ہونی شروع

ہوئی۔ ایک چبھن، تلخی کی ایک رمق چلی آئی جو محبت اور کامرانی کو حد درجہ گداز کر دیتی ہے اور جذبوں کی آنکھوں میں آنسو چلے آتے ہیں۔ پھر کہیں ہرا زیادہ ہرا ہو گیا اور اس پر تازگی اور شگفتگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ جیسے بارش کے دو چھینٹوں کے بیچ سبک سی ہوا پانی پر دو شالہ بُن دیتی ہے۔ پھر سمندر میں اس قدر زمرد گھلا کر نیلم ہو گیا اور اس میں مچھلیوں کی چاندیاں چمکنے لگیں۔ آخر وہ چاندیاں تڑپ تڑپ کر اپنے آپ کو ماہی گیروں کے حوالے کرنے لگیں۔ پھر آسمان پر صوت و تجلی کا ٹکراؤ ہوا۔ بادل گرجے، بجلی تڑپی، اور یکایک چھاجوں پانی برسنے لگا۔ اس عرصے میں جوگیا نے کئی نیلے پیلے، اودے، کالے، سردئی اور سرمئی دھانی اور چمپئی رنگ بدلے۔ اسے کتنی جلدی تھی لڑکی سے عورت بن جانے کی اور پھر عورت سے ماں ہو جانے کی۔ مجھے یقین تھا کہ اتنی صحت مند لڑکی کے جب بچے پیدا ہوں گے، جڑواں ہوں گے بلکہ تین چار بھی ہو سکتے ہیں، میں انھیں کیسے سنبھالوں گا؟ اور اس خیال کے آتے ہی میں ہنسنے لگا۔

ان دنوں جوگیا اپنی بیمار ماں کے پیر پکڑ کر اس سے لپ اسٹک لگانے کی اجازت بھی لے چکی تھی۔ ایک طرف زندگی دھیرے دھیرے بجھی جا رہی تھی اور دوسری طرف لپک لپک کر کھل رہی تھی۔ جوگیا نے لپ اسٹک استعمال کرنے کی اجازت تو لے لی تھی لیکن اتنی ساریوں اتنے رنگوں کے لیے اتنے لپ اسٹک کہاں سے لاتی؟ میں نے ایک دن میکس فیکٹر کی لپ اسٹک خرید کر تحفے میں جوگیا کو دی تو وہ کتنی خوش ہوئی۔ جیسے میں نے کسی بہت بڑے راز کی کلید اُس کے ہاتھ میں دے دی ہو۔ وہ بھول ہی گئی کہ وہ میرے ساتھ گرگام کے ترام کے پٹّے پر کھڑی ہے۔ وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کے فوراً ہی بعد اس کی آنکھیں میلوں اندر دھنس گئیں اور نمی سی باہر جھلکنے لگی۔ میں سمجھ گیا جوگیا بیحد جذباتی لڑکی ہے۔ بھلا میرے سامنے اتنی ممنون دکھائی دینے کی کیا ضرورت تھی، لیکن بات دوسری تھی جس رنگ کی میں لپ اسٹک لایا تھا۔ اس سے میچ کرتی ہوئی ساری جوگیا کے پاس نہ تھی اور نہ خریدنے کے لیے پیسے تھے۔ میرے پاس بھی اتنے پیسے نہ تھے

جن سے کوئی خوبصورت سی ساری خرید کر اسے دے سکتا۔ میں نے تو لپ اسٹک کے پیسے بھی موٹے بھیا کی جیب سے چرائے تھے اور یا بھابی کے ساتھ اس عشق میں جوڑے تھے جس کا حق صرف دیور ہی کو پہنچتا ہے۔

برسات ختم ہوئی تو ایک تماشا ہوا۔ جوگیا نے گھر میں بڑوں کے وقت کے پڑے ہوئے کچھ عقیق بیچ ڈالے اور میری لپ اسٹک کے ساتھ میچ کرتی ہوئی ایک ساری خرید لی۔ اس بات کا مجھے کہاں پتا چلتا لیکن ہمارے گھر میں ایک مخبر تھی۔ جوگیا کی سہیلی ہیا ـــــ جوگیا نے نارنجی سرخ رنگ کی ساری پہنی اور جب ہم اگیاری پار، لاقانوینت کے جنگل میں ملے تو میں نے جوگیا کو چھیڑا ـــــ

"بانتی ہو، جوگیا! آج تم کیا لگتی ہو"

"کیا لگتی ہوں؟"

"بیر بہوٹی ـــــ جو برسات ہوتے ہی نکل آتی ہے"

جوگیا کے دل میں کوئی شرارت آئی۔ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ـــــ

"جانتے ہو تم کون ہو؟"

"؟"

"بیر ـــــ اور میں بیر بہوٹی"

اور اس کے بعد جوگیا اس قدر لال ہو کر بھاگ گئی کہ اس کے چہرے کے رنگ اور ساری کے رنگ میں ذرا سا بھی فرق نہ رہا۔

اس دن سب عورتوں نے نارنجی رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اپنی آنکھوں سے اس جلوس کی تاب نہ لا کر میں نے پھر ہیمنت سے کہہ دیا۔ اب کے ہیمنت نے اکیلے نہیں، تین چار لڑکوں کو ساتھ لیا اور شاہراہِ عام پر میری بے عزتی کی۔ شاید مجھے اتنا بے عزتی کا احساس نہ ہوتا اگر سکیشی وہاں نہ آ جاتی جو سفید نائیلون کی ساری پہنے ہوئے تھی اور اس میں تقریباً ننگی نظر آ رہی تھی ـــــ وہ روز بروز سچ مچ کا ماڈل ہوتی جا رہی تھی۔

جوگیا کو بیر بہوٹی بننے کی کتنی خواہش تھی۔ اس کا مجھے روح کی گہرائیوں تک سے اندازہ تھا لیکن میں کچھ نہ کر سکتا تھا سوائے اس کے کہ میں اسکول سے پاس ہو کر نکل جاؤں اور کوئی اچھی سی نوکری کروں اور یا تصویریں بنا کر مالا بار ہل اور وارڈن روڈ کے جھوٹے دقیقہ شناسوں کو اونے پونے میں بیچ دوں۔ لیکن ان سب باتوں کے لیے وقت چاہیے تھا جو میرے پاس تو بہت تھا تھوڑا بہت جوگیا کے پاس بھی تھا لیکن اس کی ماں کے پاس نہ تھا، محنت اور مشقت کی وجہ سے جیسے کوئی کرم روگ لگ گیا تھا۔

میں اس انتظار میں تھا کہ ایک دن بھابی اور موٹے بھیا سے کہہ دوں۔ لیکن مجھے اس کی ضرورت ہی نہ پڑی، ہیما باپنو گھر میں جوگیا کے پیار دلار لیتی ہوئی ایکاایکی اپنے گھر میں آدھمکی اور دھڑسے کہہ ڈالا ——— "کاکا! کیوں نہیں تم جوگیا سے بیاہ کر لیتے؟"

جبھی میں نے کہا ——— "دھت"

"یہ دھت" اگر میں ہی کہتا تو کوئی بات نہ تھی۔ کچھ دنوں بعد ہیما کی اس ٹائیں ٹائیں پر بھیا اور بھابی نے اسے ڈانٹنا شروع کر دیا اور ایک دن تو بھابی نے اس معصوم کو ایسا تمانچا مارا کہ وہ اُلٹ کر دہلیز پر جا گری۔ اس دن میرا ماتھا ٹھنکا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس بارے میں دونوں گھروں کے بیچ میں کوئی بات ہوئی ہے۔

میرا اندازہ ٹھیک تھا۔ جوگیا اور بجور کی ماؤں اور پنجابن نے مل کر بھابی کے ساتھ بات چلائی اور منہ کی کھائی۔ باپنو گھر کی عورتیں یوں ٹھیک تھیں۔ ان سے باتیں کر لینا ان کے ساتھ چیزوں کا تبادلہ بھی درست تھا۔ ایک آدھ کو اشارے سے رام کرنا اور چوری چھپے ان سے ہم بستری کر لینا بھی ٹھیک تھا لیکن ان کے ساتھ رشتے ناتے کی بات چلانا کسی طرح بھی درست نہیں تھا۔ پھر اور بھی بہت سی باتیں نکل آئیں جو ہمارے گجراتی گھروں کا وبال، ان کا

زہر، مٹی کا تیل اور کنواں ہوتی ہیں ——— جوگیا کی ماں لڑکی کو کچھ دے دلا نہ سکتی تھی۔ اسی لیے ہمارے گھروں میں جب کوئی لڑکی جوان ہوتی ہے تو کچھ لوگ اس کی طرف دیکھ کر کہتے ہیں ——— تیار ہو گئی مرنے کو ——— خبر دینے دلانے کی بات پر میں تن کر کھڑا ہو گیا، لیکن اس کے بعد بھابی اور گیان بھون کی عورتوں نے دوسری باتیں شروع کر دیں ——— جوگیا کا باپ کون تھا؟ کوئی کہتی وہ مسلمان تھا اور کوئی بڑھیا گواہی دیتی وہ ایک پرتگالی تھا جو بڑودے میں بڑے عرصے تک رہا تھا۔ جو بھی ہو وہ سب باتیں تھیں۔ ایک بات جو تحقیق کے ساتھ مجھے معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ جوگیا کی ماں منادر کے براہمن دیوان کی دوسری بیوی تھی جسے قانون نے نہیں مانا۔ جوگیا اس دیوان کی لڑکی تھی مگر لوگ جوگیا کی ماں ایک بیا ہتا عورت کو دیوان صاحب کی رکھیل کہتے تھے۔ یہ اس قسم کے لوگ تھے جنھوں نے جوگیا کی ماں کے کچھ بھی پلّے پڑنے نہ دیا اور وہ بمبئی چلی آئی۔ کچھ بھی تھا، اس میں جوگیا کا کیا قصور تھا؟ وہ تو اپنے باپ کی موت کے تین مہینے بعد پیدا ہوئی تھی اور باپ کی شفقت کا منہ تک نہ دیکھا، میں ان سب چیزوں کے خلاف جہاد کرنے اور جوگیا کے ساتھ فٹ پاتھ پر رہنے کو تیار تھا لیکن باقی سب نے مل کر جوگیا کی ماں کو اتنا صدمہ پہنچایا کہ وہ مرنے کے قریب ہو گئی۔ اب وہ چاہتی تھی جلدی سے جلدی جوگیا کا ہاتھ کسی واجبی گزارے والے مرد کے ہاتھ میں دے دے۔ میرے گھر والوں کی باتوں کے کارن وہ میری صورت سے بھی بیزار ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی بیٹی سے صاف کہہ دیا تھا اگر اس نے مجھ سے شادی کی بات بھی کی تو وہ کپڑوں پر تیل چھڑک کر جل مرے گی۔ جوگیا اب کالج نہ جاتی تھی اور باپنو گھر کے جوگیا والے فلیٹ کے کواڑ اکثر بند رہتے اور ہم تازہ ہوا کے ایک جھونکے کے لیے ترس گئے تھے۔

ایک شام مجھ پر بہت کڑی آئی۔ سر شام ہی چمگادڑ کے بڑے بڑے پَر مجھ غریب پر سمٹنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد یوں لگا جیسے کوئی میری شہ رگ پر

اپنا منھ رکھے تیزی سے میری سانس چوس رہا ہے۔ جتنا میں اسے ہٹانے کی کوشش کرتا ہوں اتنا ہی اس کے دانت میرے گلے میں گڑے جا رہے ہیں۔ ایسی شاموں کا رنگ سیاہ بھی نہیں ہوتا اور سفید بھی نہیں ہوتا ان کا صرف ایک ہی رنگ ہوتا ہے ـــــ جنس اور جانکا ہی کا رنگ اور جن لوگوں پر ایسی شامیں آتی ہیں وہی جانتے ہیں کہ ایسے میں صرف ماں کی چھاتیاں اور محبوبہ کی چھاتیاں ہی ان کو بچا سکتی ہیں میری ماں مر چکی تھی اور جوگیا میری نہ ہو سکتی تھی۔

اُفوہ ـــــ اتنی گھٹن، اتنی اداسی ـــــ اداسی کا بھی ایک رنگ ہوتا ہے۔ میلا میلا، چھدرا چھدرا، جیسے منھ میں ریت کے بے شمار ذرّے اور پھر اس میں ایک عفونت ہوتی ہے جس سے متلی بھی ہوتی ہے اور نہیں بھی ہوتی۔ آخر آدمی وہاں پہنچ جاتا ہے جہاں سے احساس کی حدیں ختم ہو جاتی ہیں اور رنگوں کی پہچان جاتی رہتی ہے۔

صبح اُٹھا تو میرا اس گھر، اس شہر، اس دنیا سے بھاگ جانے کو جی چاہتا تھا۔ اگر جوگیا کی ماں نہ ہوتی اور وہ میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو جاتی تو میں اُسے لے کر کہیں بھی نکل جاتا ـــــ جبھی مجھے بیراگی یاد آنے لگے، بدھ بھکشو یاد آنے لگے جو اس دنیا کو چھوڑ دیتے ہیں اور کہیں سے بھی بھکشا لے کر اپنے پیٹ میں ڈال لیتے ہیں اور پھر بیٹھ کر "اوم منے پدمے" کا ورد کرنے لگتے ہیں۔

میں واقعی اس دُنیا کو چھوڑ دینا چاہتا تھا لیکن سامنے باپو گھر میں جوگیا کے فلیٹ کا دروازہ کھلا اور جوگیا مجھے سامنے نظر آئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ رات کو نہیں سوئی۔ اس کے بال بے حد روکھے تھے اور یونہی اِدھر اُدھر چہرے اور گلے میں پڑے تھے اس نے کنگھی اٹھائی اور بالوں میں کھبو دی کچھ دیر بعد وہ الماری کے پاس جا پہنچی ـــــ

میں اسکول کی طرف جا رہا تھا۔ راستے میں سب عورتوں نے جوگیا کپڑے پہن رکھے تھے۔ انھیں کس نے بتایا تھا؟ وہ اُداس تھیں جیسے زندگی

کی ماہیت جان لینے پر انھیں بھی کوئی بیراگ ہو گیا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں کھڑتال تھی اور منھ میں بھجن تھے جو نہ کسی کو دکھائی دے رہے تھے اور نہ سنائی دے رہے تھے۔ وہ بھکشو بنی ایک دروازے سے دوسرے دروازے پر جا رہی تھیں اور انھیں کھٹکھٹا رہی تھیں لیکن اس بھرے شہر بمبئی میں کوئی انھیں بھکشا دینے کے لیے باہر نہ آ رہا تھا۔

اسکول پہنچا تو ہیمنت بدستور ہنس رہا تھا۔ آج اس نے پہل کی ـــــ بولا ـــــ "شہر کی عورتوں نے آج کیا رنگ پہن رکھا ہے؟"

میں اس بے حس آدمی کو جواب نہ دینا چاہتا تھا لیکن اپنے آپ ہی میرے منھ سے نکل گیا ـــــ "آج سب جوگنیں بن گئی ہیں۔ سب نے بیراگ لے لیا ہے اور جوگیا پہن لیا ہے۔"

اس دن میں اُسے اور سکیشی کو گل مہر کے نیچے سے پام کے پیڑوں میں سے گھسیٹتا ہوا ہاٹ کے پاس لے گیا۔ سامنے سڑک چل رہی تھی اور اس پر انسان کے پتلے ساکت تھے۔ ان سب نے بیراگ پا لیا تھا اور جوگیا کفنیاں پہنے بلا ارادہ، بے مقصد پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھور رہے تھے جیسے اس دنیا میں کوئی مرد نہیں کوئی عورت نہیں جسے ان کو جواب دینا ہے۔

میں نے ایک عورت کی طرف اشارہ کیا وہ جوگیا کپڑے پہنے ہاتھ میں کمنڈل لیے جا رہی تھی۔ ہیمنت کھلکھلا کے ہنسا۔ ساتھ سکیشی بھی ہنسی جس نے جینز پہن رکھی تھی اور اس کے کولھے اس کی رانیں تک دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ پورے طور پر ماڈل بن چکی تھی ـــــ

جب ہیمنت کی ہنسی تھمی تو اس نے کہا ـــــ "تو بالکل پاگل ہو گیا ہے، جنگل ـــــ کہاں ہیں جوگیا کپڑے؟ اس عورت نے تو ایک آدی کی ساری پہن رکھی ہے اور وہ کمنڈل جو تجھے دکھائی دیتا ہے، ایک خوبصورت پرس ہے" ـــــ سکیشی نے بھی ہیمنت کی تائید کی۔

میں حواس باختہ سڑک پر کھڑا سامنے دیکھتا رہا۔ جبھی ایک بس رُکی اور اس میں سے ایک لڑکی اتری ـــــــ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" میں نے اپنے آپ سے کہا ـــــــ "وہ جوگن ہے، جوگیا کپڑے پہنے ہوئے! ـــــ میں کیا اندھا ہوں؟"

لیکن اپنی آنکھوں پر یقین کرنے کے لیے میں کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔ کچھ دیر کے بعد مجھے یقین ہو گیا اور پیچھے دیکھتے ہوئے میں نے آواز دی۔

"ہیمنت ـــــ"

لیکن ہیمنت اور سکیشی ایک دوسرے کی باہنہ میں باہنہ ڈالے اندر جا چکے تھے ان کے قہقہے سنائی دے رہے تھے۔ وہ مجھے ایسے ہی بے یار و مددگار اس صحرا کے کنارے چھوڑ گئے تھے جیسے لوگ کسی پاگل آدمی کو چھوڑ جاتے ہیں ـــــ یہ بھی ان کی عنایت تھی کہ انھوں نے مجھے پتھر نہیں مارے تھے اور نہ ہی مجھے اولیا کہا تھا۔

اور وہ لڑکی اس طرف آ رہی تھی۔ اب تو مجھے پورے سنسار پر پھیلے ہوئے اس رنگ کے بارے میں کسی قسم کا شک نہ تھا۔ اس سے پہلے کہ میں یقین اور ایمان کی بلند آواز کے ساتھ ہیمنت اور سکیشی کو پکارتا وہ لڑکی میرے قریب آ چکی تھی میں نے ایک آواز سنی ـــــ "بیر"

اور میں نے چونک کر دیکھا۔ کسی دوسرے رنگ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کیوں کہ وہ خود جوگیا تھی جسے میں نے اس صبح اپنے گیان بھون سے بانو گھر کے کھلے دروازے میں سے، سب ساریوں میں سے جوگیا رنگ کی ساری کا انتخاب کرتے دیکھا تھا۔

ایک عجیب بے اختیاری کے عالم میں میں نے ایک قدم بڑھایا اور عجیب تر بےبسی کے عالم میں رُک گیا۔ جوگیا بولی۔

"میں کل بڑودے جا رہی ہوں"

"کیوں جوگیا ـــــ بڑودے میں کیا ہے؟"

"میری ننہیال ـــــ وہاں میرا بیاہ ہو رہا ہے، پرسوں ـــــ"

"او ـــــ"

"میں تم سے ملنے آئی تھی ـــــ"

تو ملو ـــــ؟ میں جانے کیا کہہ رہا تھا؟

اس وقت آرٹس اسکول کے کچھ لڑکے لڑکیاں، پرنسپل صابری اور کچھ دوسرے لوگ آ جا رہے تھے جب کہ جوگیا نے اچک کر اتنے زور سے میرا منہ چوم لیا کہ میں بوکھلا اور لڑکھڑا کر رہ گیا۔ وہ اٹھارہ انیس برس کی لڑکی کی بجائے پینتیس چالیس برس کی ایک بھرپور عورت بن گئی تھی۔ اس کا بوسہ کتنا مرتعش تھا کتنی مقدس وحشت، شہوت تھی اس میں۔

اگر کچھ لوگ دیکھ بھی رہے تھے تو ہمیں وہ دکھائی نہ دیے۔

"وہ دیکھ بھی رہے تھے تو کیا کر سکتے تھے"، جاتے ہوئے جوگیا نے کہا "میرے جانے کے بعد تم روئے تو میں تمھیں ماروں گی، ہاں" اور ساتھ ہی اس نے مجھے مکا دکھایا۔

اور اس کے بعد جوگیا چلی گئی۔

سویرے گیان بھون اور بانو گھر کے سامنے ایک وکٹوریہ کھڑی تھی جس پر بازار کا بوجھ اٹھانے والے کچھ سوٹ کیس اور کچھ ٹرنک رکھ رہے تھے اور کچھ یونہی اِدھر اُدھر کا سامان۔ ان لوگوں کو رخصت کرنے کے لیے بانو گھر کے سب لوگ نیچے چلے آئے تھے۔ لیکن سامنے گیان بھون سے میرے سوا کوئی نہ آیا تھا۔ موٹے بھیا اور بھابی تو کیا آتے معصوم ہیما کو بھی انھوں نے غسل خانے میں بند کر دیا تھا جہاں سے اس کے رونے کی آواز گلی میں آ رہی تھی۔

پہلے بجورکی ماں اور پنجابن کے سہارے جوگیا کی ماں اتری اور گرتی

پڑتی وکٹوریہ میں بیٹھ گئی۔ تھوڑا سانس درست کیا اور پھر سب کی طرف ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی ——— "اچھا بہنو، ہم چلتے بھلے، تم بستے بھلے!"

اور پھر آئی ——— جوگیا!

جوگیا نے ہلکے گلابی رنگ کی ایک خوبصورت ساری پہن رکھی تھی اور گلاب ہی کا پھول محنت اور خوبصورتی سے بنائے ہوئے جوڑے میں ٹانک رکھا تھا۔ ابھی وہ وکٹوریہ میں بیٹھی بھی نہ تھی کہ اگیاری کا پارسی پروہت ادھر آنکلا میں نے عادتاً کہا ——— "صاحب جی"

"صاحب جی" پارسی پروہت نے کہا اور پھر مجھے اور جوگیا کو تقریباً ایک ساتھ کھڑے دیکھ کر مسکرایا، آشیرواد میں ہاتھ اٹھائے اور منہ میں ژند اوستا کا جاپ کرتا ہوا چلا گیا۔ جوگیا گاڑی میں بیٹھی تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی ——— جب میں بھی مسکرا دیا!

ببّل

دربار ی لال، شام گھر ہی میں بیٹھا، سیتا کے ساتھ بیکار رہ رہا تھا۔ کسی کے ساتھ بیکار ہونا اس حالت کو کہتے ہیں جب آدمی دیکھنے میں ایوننگ نیوز یا غالب کی غزلیں پڑھ رہا ہو لیکن خیالوں میں کسی سیتا کے ساتھ غرق ہو۔

سیتا نے تو کہا تھا وہ ٹھیک چھے بجے اروراسینما کی طرف سے آنے والی سڑک کے موڑ پر کھڑی ہو گی۔ اس کی ساری کا رنگ کاسنی ہو گا، لیکن ———

درباری کنگز سرکل میں رہتا تھا جس کا نام اب مہیشوری اُدیان ہو گیا ہے۔ وہ لاؤڈ اسپیکروں کی ایک فرم میں کام کرتا تھا۔ آمدنی تو کوئی خاص نہیں تھی لیکن پیسے کی کمی بھی نہ تھی۔ باپ مہتا گردھاری لال نے ایک ہی دن کی فارورڈ ٹریڈنگ میں تین چار لاکھ روپے بنا لیے تھے اور پھر ایکا ایکی ہاتھ کھینچ لیے جواب تک کھینچے ہوئے تھے۔ آج بھی کاٹن ایکسچینج میں ان کے ساتھی مہتا صاحب کے مٹھیوں میں سے بالو کی طرح سے نکل جانے پر گالیاں دیتے تو وہ جواب میں ہنس دیتے ——— ایسی ہنسی جو آدمی تین چار لاکھ

مدھوپیا اندر ڈال کر ہی ہنس سکتا ہے!

پھر بڑے بھائی بہاری لال کی شادی مارواڑیوں کے گھر میں ہوئی تھی، جنھوں نے بیس سیر سونے کے کڑے اپنی لڑکی کے ہاتھوں میں ڈالے اور یوں اسے درباری کی بھابی بنایا۔ برس ایک بعد درباری کی اپنی بہن، ستونتی نار، ایک لکھ پتی اسماعیلی صالح محمد کے ساتھ بھاگ گئی اور نکاح کرلیا۔ گلی، محلے، پورے شہر میں ہنگامہ ہوا۔ برسوں مہتا صاحب نے لڑکی اور داماد دونوں کو "پریم کیٹرے" —— اپنے گھر میں گھسنے نہ دیا۔ آخر من منوتی ہوگئی لڑکے کے رشتے دار کہتے تھے لڑکی کو مشرف بہ اسلام کیا گیا ہے اور اس کا نام کنیز فاطمہ ہے اور مہتا صاحب کہتے تھے۔ لڑکے کو شدھ کرنے کے بعد اس کا نام سرداری موہن رکھا گیا ہے لیکن سرداری موہن یا صالح محمد اپنا نام ہمیشہ ایس ایم نواب، ہی لکھا کرتا۔ چونکہ لڑکے کی اس قبیح حرکت پر غصہ نکالنے کا اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اس لیے درباری لال کے حواری جب بھی ستونتی نار کے پتی یا شوہر سے ملتے تو یہی کہتے —— "کیوں بے صالح ——؟"

آج صالح یا سرداری اور ستونتی دونوں گھر پر تھے اور ان کے دو بچے بھی۔ اس سمے بہاری اور بھابی گن دلی نے مل کر درباری کی شادی کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ عورتیں شالی مرد اور مرد شالی عورت کی باتیں کرتے کرتے آپس میں اُلجھنے لگے۔ درباری برآمدے میں بیٹھا، اپنے بارے میں ساری گفتگو سُن رہا تھا۔ ایکا ایکی وہ لپکا اور اپنے منہ کے لاؤڈ اسپیکر کو کھڑکی میں سے اندر کرتے ہوئے بولا —— "میں! درباری لال مہتا، ولد گردھاری لال مہتا، ساکن بمبئی ہرگز ہرگز شادی نہیں کروں گا" —— سب اس آواز پر چونک گئے، عورتوں اور بچوں کی تو جان ہی نکل گئی۔

درباری لال واپس اپنی جگہ پر آکر ایوننگ نیوز کے ورق اُلٹنے لگا اور پھر اور اسینما کی طرف سے گھر کو مڑتی ہوئی سڑک پہ دیکھنے لگا، جہاں اسے

کاسنی بنگ کی ساری کی تلاش تھی۔

اندر سب ہنس رہے تھے۔ ماں بھی ان میں آکر شامل ہوگئی تھی۔ درباری گھر بھر کا بانکا تھا۔ جس طریقے سے وہ بالوں پر ہیئر ٹانک لگاتا، محنت سے ان کو بٹھاتا۔ قینچی لے کر آئینے کے سامنے گھنٹہ گھنٹہ دو دو گھنٹے مونچھوں کی نوک میں صرف کرتا، سب بانکپن کی دلیلیں ہی تو تھیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ شادی سے پہلے، عمر کے اس حصے میں لڑکے لڑکیوں کی سی حرکتیں کرنے لگتے ہیں اور لڑکیاں، لڑکوں کی سی۔ پھر شادی ہوتی ہے۔ آپس میں ملتے ہیں تب کہیں جا کر اپنا اپنا کام سنبھالتے ہیں —— درباری کی ان حرکتوں کو دیکھ کر گھر کی عورتیں کہتی تھیں 'یہ سب شادی کی نشانیاں ہیں اور مرد کہتے تھے —— بربادی کی!

برآمدے میں سکھ ترکھان نے جالی لگانے کا کام آج ہی شروع کیا تھا۔ وہ دن بھر ایک بے شکل، بے قاعدہ اور کھردری سی لکڑی کو چھیلتا، اس پر رندہ کرتا رہا تھا اور اسی لیے سارے گھر میں لکڑی کے چھلکے اور چھپٹیاں بکھری ہوئی تھیں اور پیروں میں لگ رہی تھیں —— جبھی سامنے ڈان باسکو اسکول میں گھنٹی بجی اور سفید سفید قمیص اور نیلی نیلی نیکر پہنے ہوئے لڑکے ایک دوسرے پر گرتے پڑتے ہاسٹل کے کمروں سے نکلے۔ شاید وہ شام کی دعا کے لیے گرجے کی طرف جا رہے تھے۔ اسکول کی گراؤنڈ میں لمبا سا فرغل پہنے، ابھی تک فادر بچوں کو فٹ بال کھلا رہا تھا۔ اس نے بھی سیٹی بجا دی، کھیل ختم کر دیا مگر سیتا نہ آئی ——

اور اسینما کی طرف سے ادھر آنے والی سڑک پر کچھ گائیں السائی سی بیٹھی تھیں اور جگالی کر رہی تھیں۔ پھر اس جانب سے ایک کار اندر کی طرف مڑی اور دائیں طرف کی بلڈنگ کے پیچھے کھڑی ہوگئی۔ جبھی ایک موٹی سی عورت آتے ہوئے دکھائی دی۔ اس کے پیچھے مدراسی ہوٹل اڈپی کا مالک راما سوامی

آرہا تھا۔ وہ بھی موٹا تھا۔ اگرچہ وہ موٹی عورت اور اڈپی کا مالک راما سوامی ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھے۔ تاہم یہاں درباری کے ہاں سے یہی معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ ایک دوسرے کو ٹھیلتے ڈھکیلتے، کوئی عجیب سا کھیل کھیلتے آ رہے ہیں۔

سیتا کی بجائے اُلٹی طرف سے مصری چلی آئی۔ ہمیشہ کی طرح، آج بھی اس کی گود میں بچّہ تھا ــــ ببّل

ببّل ایک تندرست بچّہ تھا گول مٹول، نرم نرم، جیسے اسفنج کا بنا ہوا۔ اس نے یوں تو کئی دانت نکال لیے تھے لیکن نیچے کے دو دانت نسبتاً بڑے تھے۔ کمینہ ہنستا تو والٹ ڈزنی کا خرگوش معلوم ہوتا۔ آج تک کوئی ایسا دکھائی نہ دیا، جو ببّل کو ہنستے دیکھ کر بے اختیار نہ ہنس دیا ہو۔

"ببّل" درباری نے پکارا اور ہاتھ بچّے کی طرف پھیلا دیے۔ مسکراتے ہوئے ببّل نے درباری کی طرف دیکھا اور اندر کی کسی بے بس سی تحریک سے ایکا ایکی درباری کی طرف ہمکنا شروع کر دیا۔ اب وہ اپنی ماں مصری سے سنبھالا نہ جا رہا تھا۔

"ٹھہرو" درباری نے کہا اور کرہرا لینے کے لیے اندر لپک گیا۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ سیتا آئے گی اور چلی جائے گی۔ ببّل کے چہرے پر ایک پُر خلوص مایوسی کی لہر دوڑ گئی اور پل بھر میں وہ یوں محسوس کرنے لگا جیسے کہ رہا ہو ــــــ یہ ساری دنیا دھوکا ہے۔ پھر جیسے وہ مایوس ہو رہا تھا، ایسے ہی درباری کو آتے دیکھ کر خوش بھی ہو گیا۔

ببّل کی ماں، مصری ایک بھکارن تھی۔ احتیاج کی بنا پر اتنی چھوٹی سی عمر میں اس نے ببّل کو بھیک مانگنے کا فن سکھا دیا تھا۔ بازار میں جاتی ہوئی وہ بابو قسم کے کسی بھی آدمی کے پاس کھڑی ہو جاتی اور ببّل ایک ریہرسل کیے ہوئے ایکٹر کی طرح اس آدمی کی دھوتی یا قمیص کو کھینچنے لگتا اور اس چیز کی طرف اشارہ کرنے لگتا جو اسے مطلوب ہوتی۔ آدمی دیکھتا، نظریں بچاتا، پھر دیکھتا

اور بے اختیار وہ چیز خرید کر ببّل کے ہاتھ میں تھما دیتا۔ مصری بابو کے چلے جانے کے بعد ببّل کے ہاتھ سے وہ چیز لے لیتی اور دکاندار کو واپس کر کے پیسے کھرے کر لیتی ــــــ ببّل روتا چلّاتا رہ جاتا۔

لیکن درباری کے ساتھ ببّل اور اس کی ماں مصری کا رشتہ ایسا نہ تھا۔ کرہرا لے کر اسے بیچنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا؟ کرہرے کے ساتھ مصری کو سیدھے دونّی یا چونّی مل جاتی تھی۔ جس سے ببّل کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اسے تو اپنا کرہرا چاہیے تھا جسے ماں نہیں چھینتی تھی اور نہ کسی دکاندار کو دیتی تھی۔ کرہرا وہ سیدھا منہ میں ڈال لیتا اور دانتوں میں پنچولتے ہوئے ہمک ہمک کر، اُچھل اُچھل کر اپنی خوشنودی کا اظہار کرتا ــــــ آج جب درباری نے ببّل کو گود میں اٹھایا تو ایک ہی بار میں کرمُرے سے مٹھی بھرتے ہوئے وہ ماں کی طرف لوٹنے، لپکنے لگا۔ درباری نے ببّل کو بہت روکا، پیار دُلار کی کوشش کی، لیکن وہ بھلا کہاں ماننے والا تھا۔ اوں اوں کرتا ہوا وہ تو جیسے ماں کی طرف گرا ہی جا رہا تھا ــــــ

درباری نے کہا ــــ کمینے ــــ سالے ــــ" ــــــ

اندر سے صالح یا سرداری کی آواز آئی ــــ "کیا حکم ہے حضور؟"

"آپ کو عرض نہیں کیا، فیض گنجور" درباری نے اندر کی طرف منہ کرتے ہوئے جواب دیا اور پھر ببّل کے پیارے، دلارے سے گالوں پر چپت لگاتے، اسے ماں کو لوٹاتے ہوئے بولا "اتنا خود غرض؟ ــــ سلام نہ دعا، شکریہ نہ دھنیہ واد ــــــ کام نکل گیا تو اب تو کون اور میں کون؟"

مصری فٹ پاتھ کی زندگی نے شرم کو جس کے لیے ایک تکلّف بنا دیا تھا، بے باکی سے بولی "یہ سب ایسے ہی ہوتے ہیں، بابو جی!" اور پھر ببّل کو چھاتی میں چھپاتی، وہیں کھڑی وہ اپنی دونّی یا چونّی کا انتظار کرنے لگی۔

ببّل ہمیشہ کی طرح الف نہیں تو ب ننگا ضرور تھا کیوں کہ بدن پر کمر کے نزدیک وہ ایک کالا سا تاگا پہنے ہوئے تھا جس میں ایک تعویذ لٹک رہا تھا۔

اس "لباس" میں خوش، ماں کے پاس پہنچتے ہی اس نے اپنا منہ مصری کی بڑی بڑی چھاتیوں میں چھپا دیا جہاں سے وہ ایک بہت بڑے فاتح کی طرح مڑ کر دیکھنے لگا جیسے وہ کسی بہت بڑے قلعے میں پہنچ گیا ہے۔ پھر نظروں کے تیر و ترکش تانے وہ قلعے کے کنگروں پر بیٹھا، سامنے کسی جدّال فوج کا جائزہ لینے لگا، یورش سے پہلے ہی جس کے چھکّے چھوٹ گئے۔ پھر ایکا ایکی، کسی پروں والے، خیالی گھوڑے پر بیٹھا وہ کسی شہسوار کی طرح لپکنے لگا۔ آگے ہی آگے، اوپر ہی اوپر —— اور منزلیں تسخیر ہو ہو کر اس کے پیروں میں پڑی ہوتی ہیں۔

مصری ایک پکّے بلکہ کالے رنگ کی جوان عورت تھی اور ببّل گورا چٹا —— یہ کیسے ہوا؟ —— درباری نے کبھی نہ پوچھا۔ وہ سمجھتا تھا یہ غریب عورتیں کتنی بے سہارا ہوتی ہیں۔ سڑک کے کنارے پڑی ہوئی مصری کو کوئی بابو آٹھ آنے روپے کے عوض ببّل دے گیا ہوگا۔

"آپ کے پاس تو پھر بھی چلا آتا ہے بابو جی۔ ورنہ یہ ہل کٹ —— کسی مرد کے پاس نہیں جاتا۔"

"کیوں، کیوں؟" درباری نے حیران ہو کر پوچھا۔

"مالم نہیں" مصری کہنے لگی اور پھر پیار سے ببّل کی طرف دیکھتی ہوئی بولی —— ہاں عورتوں کے پاس چلا جاتا ہے۔"

درباری جی کھول کے ہنسا —— "بدمعاش ہے نا —— ابھی سے عورتوں کی چاٹ لگی ہے۔ بڑا ہو کر کیا کرے گا؟"

مصری خوب شرمائی اور خوب ہی اترائی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اپنی گود میں ان گنت گوپیوں والے کنہیا کو کھلا رہی ہے اور مصری کے تصوّر میں جو گوپیاں تھیں، وہ خود بھی ان میں سے ایک تھی جیسے ببّل مصری کا من تھا اور مصری کی اپنی برتیاں اس کے اردگرد ناچ رہی تھیں —— ببّل ابھی ایک گوپی کے ساتھ تھا پھر انیک کے ساتھ!

درباری نے جو مصری بائی کے ساتھ تھوڑی سی آزادی لی تھی، اسی سے گھبرا کر پوچھ بیٹھا —— "اس کا باپ کیا کام کرتا ہے، مصری؟"

"اس کا باپ؟" —— مصری کو جیسے سوچنے میں وقت لگا —— "نہیں ہے۔"

اس جواب میں بہت سی باتیں تھیں یہ بھی تھی کہ وہ مر چکا ہے اور یہ بھی کہ مرنے سے بھی بدتر ہو گیا ہے مصری کہیں دور دیکھنے لگی اور پھر درباری لال کی نگاہوں کے تاسّف کو دور کرتے ہوئے بولی —— "ایک بار وہ پھر آیا تھا —— مجھے یوں ہی لگا، جیسے وہی ہے۔ لیکن —— میں کیا کہہ سکتی تھی بابو جی؟ —— میں نے تو اسے جی بھر کے دیکھا بھی نہ تھا —— جب تک میں نے اس بچے کا کوئی نام نہیں رکھا تھا۔ کبھی گوپو، کبھی ناریاں کہہ کے پکارتی تھی جبھی اس نے اس کے ہاتھ پر پانچ کا ایک نوٹ رکھا اور بڑے پیار سے پکارا —— ببّل! —— جب سے میں نے اس کا نام ببّل رکھ دیا ہے۔" —— اور مصری پھر سوچنے لگی —— "اس کا باپ نہ ہوتا تو پانچ روپے دیتا؟"

درباری بھی سوچنے لگا —— "ہو سکتا ہے وہ آدمی نہیں —— پانچ روپے کا نوٹ ہی اس بچے کا باپ ہو۔"

درباری نے آج اٹھنّی مصری کے ہاتھ پر رکھنے کی بجائے ببّل کے ہاتھ پر رکھ دی۔ ببّل نے سکّے کو ہاتھ میں لیا، زور زور سے بازو کو ہمکایا اور پھر اسے پھینک دیا۔

اٹھنّی سڑک کے مین ہول میں گرنے ہی والی تھی کہ جیسے مصری کی تقدیر کو ایک خشک بے بضاعت سے آم کے چھلکے نے اسے روک لیا۔ مصری نے جھک کر اٹھنّی اٹھائی اور ببّل کو سینے سے لپٹاتے ہوئے بولی ——۔ "لچّا ہے نا ——" اور پھر اسے چومتے ہوئے وہ درباری لال سے بولی۔

سچ پوچھو، بابو جی! تو میرا مرد یہی ہے۔"

"تیرا مرد ——— ؟"

"ہاں۔" مصری نے ببّل کو سنبھالا جو اپنی ماں کے سر پر سے پلّو کھینچ رہا تھا اور کہنے لگی: "یہ کماتا ہے، میں کھاتی ہوں۔"

مصری بہت باتونی تھی وہ اور بھی بہت کچھ کہتی ببّل اور بھی کرمرا نکتا لیکن درباری کو اپنی نظروں کے افق پر کاسنی رنگ لہراتا ہوا نظر آیا۔ اس نے جلدی سے مصری کے آبنوسی حسن اور ببّل کی گوری چٹی معصومیت کو جھٹک دیا اور ———

"میں چلا، صالح بھائی ——— اچھا بھابی" کہہ کر وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔ ابھی وہ سڑک پر پہنچا بھی نہ تھا کہ پتلون کے پائنچے میں اسے لکڑی کے چھلکے اڑتے ہوئے دکھائی دیے۔ جنھیں درباری نے جھٹک کر باہر نکالا اور سیتا کے پاس جا پہنچا۔

شیواجی پارک میں، سمندر کے کنارے، کلب اور بھیل پوری والوں سے کچھ دور ہٹ کر درباری اور سیتا ایک دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گئے۔

سیتا اٹھارہ انیس برس کی ایک لڑکی تھی جس کی ماں تو تھی پر باپ مر چکا تھا۔ گھر کی حالت کچھ اتنی خراب بھی نہ تھی کیوں کہ مکان اپنا تھا جس کے مکینوں سے کبھی کرایہ وصول ہوتا تھا اور کبھی نہیں۔ سیتا کی ماں لچھمن دئی یوں تو اپنی بیٹی کی شادی کرنا چاہتی تھی لیکن شادی سے زیادہ اسے اس بات کا خیال تھا کہ کوئی ایسا آئے جو ہر مہینے اپنے "مورنّاب" سے کرایہ اگاہے تاکہ سیتا کے کہنے کے مطابق، دروازے پر ہر مہینے جو بھیڑیا دکھائی دیتا ہے، بھاگ جائے ——— اور جینا سُکھی ہو جائے۔ لچھمن دئی سے سیتا نے درباری کی بات بھی کی۔ پہلے تو ماں شک اور بھروسے کا اظہار کرنے لگی۔ لیکن جب اسے پتا چلا درباری کا پورا نام درباری لال لہتا ہے تو اس نے جھٹ سے اجازت دے دی کیونکہ بمبئی میں جو لوگ مکانوں کا کرایہ اگاہتے

ہیں، انھیں جبتا بولتے ہیں۔

سیتا کا قد درمیانہ تھا لیکن بدن کا تناسب ایسا جو مردوں کے دلوں میں جذبے بیدار کیا کرتا ہے اور کوئی بےخودی سی ان کے ہونٹوں پر چلی آتی ہے۔ چہرے کی تراش خراش اچھی تھی لیکن اس کا پاس آنے ہی سے پتا چلتا تھا۔ پلکیں کچھ نم سی رہتیں کیوں کہ سیتا کی آنکھیں تھوڑا اندر دھنسی ہوئی تھیں اور ان کے بچاؤ کے لیے پلکوں کو جھکنا پڑتا تھا۔ لیکن یہ ان دھنسی ہوئی آنکھوں ہی کی وجہ سے تھا کہ سیتا مرد کے دل میں بہت دور تک دیکھ سکتی تھی۔ وہ کسی کو کچھ کہے یا نہ کہے، یہ الگ بات تھی، لیکن جانتی وہ سب تھی۔ ہاں، سیتا کے بال بہت لمبے تھے جن کے کارن درباری پوچھا کرتا ——— "تمھارے گھر میں کوئی کسی بنگالن کو بھی بیاہ کر لایا تھا؟" اور سیتا کہتی ——— "میں خود جو ہوں بنگالن ——— میرا نام سیتا موجمدار ہے ———" درباری کہتا ——— "سیتا مزے دار" اور سیتا ہنسنے لگتی۔ وہ خوش تھی کہ اس کا قد صرف اتنا ہے جس سے وہ اپنے حسین، کالے، چمکیلے اور لچکیلے بالوں والے سر کو درباری کی چھاتی پر رکھ سکتی ہے اور اپنے وجود کی روح تک کو کسی کے حوالے کر کے اپنے سارے دکھ بھول سکتی ہے اور تھوڑے سے فرق سے وہ پتی اور پتا کو ایک کر سکتی ہے ———

دیوار کی اوٹ میں بیٹھا ہوا درباری سیتا سے پیار کر رہا تھا۔ سیتا نہ چاہتی تھی کہ اس کا پیار اپنی حد سے گزر جائے۔ کمر کے گرد ہاتھ پڑتے ہی سیتا چوکنی ہونے لگی۔ اس نے درباری کو باتوں میں لگانا چاہا۔ بلاؤز میں سے اس نے ایک چھوٹی سی چاندی کی ڈبیا نکالی اور درباری کے منھ کے پاس کرتے ہوئے بولی ——— "دیکھو ——— میں تمھارے لیے کیا لائی ہوں؟"

"کیا لائی ہے؟" درباری نے پوچھا اور اَن جانے میں سیتا کی کر سے ہاتھ نکال کر ڈبیا کی طرف بڑھا دیا۔

سیتا نے ڈبیا کو پرے ہٹا لیا اور بولی ——— "ایسے نہیں ———

میں خود دکھاؤنگی" اور پھر اسے درباری کی ناک کے پاس کرتے ہوئے بولی ——— سونگھو"

شامتِ اعمال کو درباری نے ڈبیا کو سونگھ لیا اور اسے چھینکیں آنے لگیں۔ محبت کا سارا کھیل رُک گیا۔ درباری چھینک پر چھینک مار رہا تھا اور جیب سے رومال نکال کر بار بار اپنی ناک کو پونچھ رہا تھا اور سیتا پاس بیٹھی ہنسی جا رہی تھی۔

"یہ ———" درباری نے کہا اور پھر چھینکتے ہوئے بولا ——— "کیا مذاق ہے؟" ——— سیتا کہنے لگی ——— "تم اسے مذاق کہتے ہو؟ ——— بیس روپے تولہ کی نسوار ہے"

"نسوار؟"

"ہاں" سیتا بولی ——— "تم چھینکتے ہو تو مجھے بڑے اچھے لگتے ہو"

درباری نے سیتا کی طرف یوں دیکھا جیسے کوئی کسی پاگل کی طرف دیکھتا ہے۔ سیتا نے پیار بھری نگاہ اس پر ڈالی اور کہنے لگی ——— "یاد ہے پہلی بار تم مجھے کہاں ملے تھے؟"

"یاد نہیں" درباری نے سر ہلاتے ہوئے کہا "صرف اتنا ہی پتا ہے، تم سے کہیں پہلی بار ملا تھا"

"وہاں" سیتا نے سامنے، مہاتما گاندھی سوئمنگ پول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ——— "تم نہا رہے تھے اور چھینک رہے تھے۔ میرے ساتھ تین چار لڑکیاں اور بھی تھیں۔ اس دن دفتر میں آدھے دن کی چھٹی ہو گئی تھی اور ہم یونہی گھومتی گھماتی ادھر جا نکلیں ———"

"ادھر کیوں؟"

"یونہی" سیتا نے کہا ——— "چھٹی ہوتے ہی نہ جانے ہم سب لڑکیوں کو کیا ہونے لگتا ہے؟ ہم گھر بیٹھ ہی نہیں سکتیں۔ ایسے ہی باہر نکل جاتی ہیں

جیسے کچھ ہونے والا ہے پھر ہوتا ہواتا تو کچھ نہیں، جبھی پتا چلتا ہے ـــ کوکا کولا پی رہی ہیں"

سیتا ہنسی تو ساتھ درباری بھی ہنس دیا۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی: "ہم سب تمہاری طرف دیکھ دیکھ کر ہنس رہی تھیں کیوں کہ تم چھینکتے ہوئے بورڈ سے فوارے تک اور فوارے سے کنارے تک آ جا رہے تھے اور ایسا کرنے میں سر سے پیر تک دُہرے تہرے ہوئے جاتے تھے ——— بچے کی طرح میرا جی چاہا، بھاگ کے تمہیں پکڑ لوں اور پلو سے تمہارا منہ تمہاری ناک پونچھوں اور پیچھے ایک چپت لگا کے کہوں ——— 'اب جاؤ، مزے اڑاؤ' ———"

درباری جیسے ایک ہی بات سوچ رہا تھا ——— "دوسری لڑکیاں کون تھیں؟"

"ایک تو کمد تھی" سیتا بولی "دوسری جولی ——— وہاں، کھاڑی کے پار ماؤنٹ میری کے پاس رہتی ہے تیسری ———" اور پھر ایکا ایکی رکتے ہوئے کہنے لگی ——— "تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"ایسے ہی" درباری نے جواب دیا "تمہاری سہیلیاں تمہاری جوتی کی بھی ریس نہیں کرتیں"

"تم نے دیکھی ہیں؟"

"دیکھی تو نہیں"

سیتا کا چہرہ جو تھوڑا کھل اٹھا تھا، ماند پڑ گیا۔ جبھی ایک چھینک نے درباری کے چہرے پہ پر تولے لیکن رک گئی۔ وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولا ——— "آج دن ڈوبتا ہی نہیں"

سمندر میں جوار شروع ہو چکا تھا۔ لہریں کناروں کی طرف بڑھ رہی تھیں اور اپنے ساتھ بھیل پوری کے بے شمار پتّل، گنڈیری اور مونگ پھلی کے چھلکے، ناریل کے کھوپڑے لا رہی تھیں۔ پھر بیچ میں کہیں کوئلے بھی دکھائی دیتے تھے

جو دور، اندر، دخانی کشتیوں اور بڑے بڑے جہازوں نے اپنا غم ہلکا کرنے کے لیے سمندر میں پھینک دیے تھے۔ تیل کا الزام بھی خشکی پہ ٹال دیا تھا اور ان کا خالی کیا ہوا ڈیزل ریتے پر پنج کراس کے ایک بڑے سے حصّے کو چکنا اور سیاہ بنا رہا تھا ——— سیتا نے مڑ کر دیکھا، درباری کچھ عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سیاہیوں کے پرے اس کے چکنے چہرے پر چھیٹ رہے تھے ———

دن ڈوب رہا تھا۔ اس نے اپنے لانبے لانبے بازو دنیا کے دونوں کناروں سے سمیٹے اور انھیں بغل میں دبا کر، ایک گہرے، کیسری رنگ کی گٹھری سی بنا، دور پچھم کے گہرے پانی میں اترنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کا تیج زمین کی گولائیوں میں گم ہو گیا۔ اب کنارے اور اس کے مکانوں اور مکینوں پر وہی روشنی تھی جو آسمان پر کے آوارہ بادلوں پر سے ہوتے ہوئے نیچے زمین پر پڑتی ہے اور جو ہولے ہولے، دھیرے دھیرے، بڑے پیار سے اندھیرے کو اپنی جگہ دیتی ہے جیسے کہہ رہی ہو ——— لو، اب تمھارا راج ہے۔ جاؤ موج اڑاؤ ———

وہی چھینک جس نے درباری کو سیتا سے کوسوں دور پھینک دیا تھا، ایک ہی وار میں اس کے قریب بھی لے آئی ——— سیتا کانپنے لگی، درباری ہانپنے لگا۔

اندھیرے کا تسلط ہوتے ہی پول اور کلب اور سڑک پر کے قہقہے تو ایک طرف، پھیری والوں کے چھابوں اور ٹھیلوں پر ٹمٹمانے والے دیے بھی لرزنے لگے۔

جبھی، جیسے دیوار میں سے آواز آئی ——— "درباری! کیا کرتے ہو؟"

"اس کا مطلب ہے" درباری نے اپنا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا ——— "تم مجھ سے پیار نہیں کرتیں؟"

"پیار کا مطلب ——— یہ تھوڑے ہوتا ہے؟"

"میں سب جانتا ہوں" ——— اور درباری اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اپنے

کپڑے ٹھیک کر کے، جانے لگا۔ سیتا نے اسے روکنے کی کوشش کی اور التجا آمیز لہجے میں بولی "کیا کر رہے ہو، چاند؟" ——— اور ریت پر پڑی ہوئی سیتا درباری کے پیروں سے لپٹ گئی جو غصّے سے ہانپ رہا تھا۔

درباری نے اپنے پیر ایک جھٹکے کے ساتھ چھڑا لیے اور بولا ——— BITCH ——— بڑی پاکیزہ بنتی ہے، سمجھتی ہے ———"

"میں کچھ نہیں سمجھتی" سیتا نے وہیں گھٹنوں کے بل گھسٹ کر پھر سے درباری کو پکڑتے ہوئے کہا ——— "میں تمھاری ہوں، چندا ——— نس نس، پور پور تمھاری ہوں۔ پر میں ایک بدھوا ماں کی بیٹی ہوں ——— مجھ سے شادی کر لو، پھر ———"

"کوئی شادی وادی نہیں" ——— درباری بولا "تم سے جو کہہ دیا، کیا وہ کافی نہیں؟ کیا منتر پھیرے ضروری ہیں؟ قانون کی پکڑ، اس کی اوٹ ضروری ہے؟" اور درباری لال رُک گیا جیسے اب بھی اسے امید تھی ———

"ہاں ضروری ہے" سیتا روتے ہوئے بولی "یہ دنیا میں نے، تم نے نہیں بنائی"

درباری کی آخری اُمید بھی ٹوٹ گئی۔ بولا "میں اس پیار کو نہیں مانتا، جس میں بیچ کوئی بھی پردہ، کوئی بھی شرط ہو۔ روحوں کا ملنا ضروری ہے تو جسموں کا ملنا بھی۔ اس میں سوئیم بھگوان ہوتے ہیں۔ ایسا شاستروں میں لکھا ہے"

"لکھا ہوگا" سیتا بولی "سب تمھاری طرح اس بات کو مانتے ہوتے"

"میں کسی کی پروا نہیں کرتا" درباری نے غصّے سے پیر زمین پر مارتے ہوئے کہا، جو ریت میں دھنس گئے اور پھر وہ انھیں کھینچتے، ریت سے نکالتے ہوئے چل دیا۔

سیتا پیچھے لپکی ——— "سنو" ——— ابھی درباری نے دیوار کی حد نہیں پھاندی تھی اب بھی وہ اس کے سہارے بیٹھ سکتے تھے اور اندھیرے

کو گلے لگا سکتے تھے۔

ایک دو لڑکے فضا میں تعجب دیکھ کر رک گئے۔ پھر چنے والا آیا، جس کی پھیری میں آگ، سمندر کی طرف سے آنے والی تیز ہوائیں ہر لحظہ بڑھتی جا رہی تھی ـــــ

اب کے سیتا نے نہ صرف درباری کے پیر پکڑے بلکہ اپنا سر اور بنگالی زلفیں ان پر رکھ دیں اور نم آنکھیں بھی، ہونٹ بھی۔ درباری پیروں تک جل رہا تھا اور اندر کی آگ سے لرز رہا تھا۔ پیر چومتی، ان پر آنسو گراتے ہوئے سیتا نے تھوڑا اٹھ کر درباری کی طرف دیکھا اور کہنے لگی "تم سمجھتے ہو، میں کسی برف، کسی پتھر کی بنی ہوں؟ میرا تم میں گھل مل جانے کو جی نہیں چاہتا؟ تم مجھ سے لگتے ہو تو کیا میرا انگ انگ ٹوٹنے، دُکھنے نہیں لگتا؟ ـــــ پر تم کیا جانو، ایک لڑکی کے دُکھ ـــــ"

اور پھر کسی ان جانے ڈر سے کانپتی ہوئی بولی "میں نہیں کہتی یہ دُکھ تم نے دیے ہیں یہ بھگوان نے دیے ہیں۔ بھگوان ہی نے عورت کے ساتھ بے انصافی کی ہے ـــــ"

"میں سب جانتا ہوں" درباری نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، "مرد سب سہہ سکتا ہے، توہین نہیں سہہ سکتا۔"

"کس کی توہین؟"

درباری نے جواب دینے کی بجائے سیتا کے ٹھوکر ماری اور وہ پیچھے کی طرف جا گری خود وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا روشنیوں کی طرف نکل گیا ـــــ

سیتا ایک ایسے ڈر سے کانپے جا رہی تھی جو اپنی اس مختصر سی زندگی میں اس نے کبھی نہ دیکھا تھا جس کا تجربہ اس نے اپنے پتا کی موت پر بھی نہ کیا تھا۔ ماں کی چھاتی میں منہ چھپا کر وہ سب بھول گئی تھی جیسے جلتے ہوئے پھوڑے کے گرد ہلکی ہلکی انگلیاں پھیرنے سے ایک طرح کا حظ، ایک قسم کا آرام آتا ہے۔ ایسے ہی ماں کے سر پر ہاتھ پھیرنے سے اس کے سارے دُکھ دور ہو گئے تھے ـــــ وہیں ریت پر پڑی پڑی سیتا دبی دبی سسکیاں لیتی رہی بیچ میں کبھی کبھی وہ

سر اٹھا کر دیکھ لیتی۔ کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ مدد کے لیے تو نہیں آ رہا جیسے مصیبت میں پڑی ہوئی عورت کے لیے کوئی نہ کوئی بانکا ضرور چلا آتا ہے ـــــ سامنے دیے کی لو میں کوئی چیز چمکی۔ سیتا نے اٹھائی تو وہ چاندی کی ڈبیا تھی جو نیچے جا گری تھی اور اب ـــــ اس میں ریت چلی آئی تھی ـــــ

ـــــ

یہ حقیقت تھی کہ درباری سیتا سے پیار کرتا تھا، لیکن اتنا نہیں جتنا سیتا کرتی تھی۔ سیتا تو جیسے اس دنیا میں اپنے نام کو بجا ثابت کرنے کے لیے آئی تھی اور اب اشوک باٹیکا میں پڑی دیکھ رہی تھی کہ کوئی اوپر سے سندیسے میں انگوٹھی پھینکے ـــــ لیکن رام جی کے زمانے سے آج تک بیچ میں کیا کچھ ہو گیا تھا۔ اب تو انگریزی "فن" چلا آیا تھا، جس سے درباری پورا لطف اٹھانا چاہتا تھا۔

گھر میں جالی لگ گئی تھی۔ تین دن خوب ہی پریشان کرنے کے بعد سکھ ترکھان چھٹی کر گیا تھا۔ صاف ستھرے برآمدے میں بیٹھے ہوئے، درباری خالی خولی نگاہوں سے سڑک کے اس موڑ کو دیکھ رہا تھا جہاں کبھی کاسنی اور کبھی سردئی، کبھی دھانی اور کبھی جوگیا رنگ لہرایا کرتے تھے۔ پاس درباری کا بھانجا محمو کو یا بنواری سرکنڈے اور ٹین سے بنے ہوئے ایک بد وضع کھلونے سے کھیل رہا تھا جس سے اس کے ہاتھ کے کٹ جانے کا ڈر تھا۔ شاید اسی لیے اندر سے ستونتی یا کنیز بھاگی ہوئی آئی اور آتے ہی بچے سے اس کا کھلونا چھین لیا۔ بچہ رونے مچلنے لگا۔

"ہے ہے ـــــ" درباری نے احتجاج کیا "کیا کر رہی ہو آپا؟"

"تم چپ رہو جی" وہ بولی، "تم سے ہزار بار کہا ہے، مجھے آپا مت کہا کرو۔ دیدی کہتے کیا سانپ سونگھتا ہے؟"

"اچھا جی" درباری بولا "اور اصل بات کی بات ہی نہیں۔ دیکھو تو کیسے رو رہا ہے۔ ایسے تو لارڈ کچنر بھی پورا بیڑا ڈوب جانے پر نہیں رویا ہوگا ـــــ دو اسے کھلونا۔"

"کیسے دوں؟ ـــــ کہیں آنکھ پھوڑ لے ـــــ"

"سب بچے اُلٹے سیدھے کھلونوں سے کھیلتے آئے ہیں۔ کتنوں کی آنکھ پھوٹی ہے؟"

"جتنا یہ شیطان ہے، کوئی اور بھی ہے؟"

"سب ماؤں کو اپنا بچہ اتنا ہی شیطان معلوم ہوتا ہے۔"

اور محمود یا بنواری بڑی بیزاری سے رو رہا تھا۔ گھر بھر کو اس نے سر پر اٹھا لیا تھا۔ درباری نے طاق پر سے جاپانی بلّی اٹھا کر دی جو چابی دیتے ہی بھاگتی اور قلابازیاں لگانا شروع کر دیتی تھی جسے دیکھ دیکھ کر بچے تو کیا بڑے بھی محظوظ ہونے لگتے تھے۔ لیکن بچوں کو تو وہی کھلونا چاہیے جو کسی نے چھینا ہے ـــــ درباری نے بُرے بُرے منہ بنائے کیسے کیسے خوخو، ہاہا کیا، منہ میں انگلی ڈال کر ہنومان بنا۔ پھر جانی واکر، آغا ـــــ لیکن وہ رو رہا تھا۔ اسے اپنا وہی کھلونا چاہیے تھا۔ درباری کا جی چاہا اسے تھپّڑ مار دے۔ اگر بچے کے اور رونے کا ڈر نہ ہوتا تو وہ ضرور مار دیتا۔ درباری نے ایکاایکی جھلّا کر کہا "اب بند بھی کر سالے ـــــ"

اندر سے آواز آئی ـــــ "نہ رونے دے یار۔"

بچہ رو رہا تھا۔ آخر دیدی بھاگی آئی، اُلٹے پیروں ـــــ "ہے رام!"

"ہائے اللہ کیوں نہیں کہتیں؟"

"بھگوان کے لیے ـــــ تم چپ رہو۔"

"خدا کے لیے کہو تو ـــــ"

پھر ستونتی یا کینز جیسے کھلونا چھین کر لے گئی تھی، ویسے ہی لوٹا بھی گئی ـــــ

"لے میرے باپ" اس نے کھلونے کو بچے کے ہاتھ میں ٹھونستے ہوئے کہا اور پھر جیسے اس کی حالتِ زار دیکھ بھی نہ سکتی ہو، اسے اٹھایا، چھاتی سے لگایا، ہلورے دیے۔ قمیص سے اس کا منہ پونچھا، ناک صاف کی، چوما، چاٹا ـــــ

اور اس کے کہنے کے مطابق "بڑی ٹھنڈ پڑی" ـــــ پھر بہت گالیاں اپنے آپ کو دیں "ہائے، مر جائے ایسی ماں ـــــ نہ رہے اس دنیا میں، لال کو کتنا رُلایا ہے۔"

اور پھر اپنے پتی یا شوہر کی طرف دیکھتے ہی برس پڑی "دیکھو تو کیا مزے سے بیٹھے ہیں۔"

وہ اُٹھ کھڑے ہوئے ـــــ خاصے بے مزہ دکھائی دے رہے تھے!

درباری بولا ـــــ "اب چاہے ہاتھ نہیں، گردن بھی کاٹ لے۔"

"کاٹ لے" دیدی بولی "مروں گی میں ـــــ تم لوگوں کو اتنا سا بھی دُکھ نہ ہوگا۔"

"ہوگا یا نہیں" درباری بولا "کہتے ہیں ـــــ نادان بھی وہی کرتا ہے جو دانا کرتا ہے، لیکن ہزار جھک مارنے کے بعد ـــــ پہلے ہی چھیننے کی بے وقوفی نہ کی ہوتی۔"

"ہاں، میں بے وقوف ہوں" دیدی کہتی ہوئی بچے کو اندر لے گئی "ماں ہونا اور عقل بھی رکھنا الگ باتیں ہیں۔"

اور دیدی کے کاندھے پر سر رکھے بدمعاش محمود یا بنواری ہنستا ہوا دکھائی دیا، جیسے اپنی طاقت اور قدرت کو اچھی طرح سے جانتا ہو۔

جبھی سامنے اوروا سینما کی طرف سے آنے والے موڑ پر نارنجی سارنگ دو تین بار لہرایا۔ درباری نے جلدی سے کپڑے ٹھیک کیے، سر پر ٹوپی رکھی اور باہر نکل گیا۔

موڑ پر سیتا کھڑی تھی۔ اس نے ایک بار درباری کی طرف تاکا اور پھر پرے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھیں کچھ اور بھی اندر دھنس گئی تھیں، پلکیں کچھ اور بھی نم ہو گئی تھیں۔

"کیسے حضور ـــــ کیا حکم ہے؟" درباری نے پوچھا۔

سیتا نے کوئی جواب نہ دیا۔ درباری کو یوں لگا جیسے سیتا کچھ کانپ سی رہی ہو۔ درباری کچھ دیر اس کی طرف دیکھتا رہا اور بولا "اگر چپ ہی رہنا ہے، تو پھر ——" اور وہ لوٹنے لگا۔

"سنو" سیتا ایکا ایکی مڑتی ہوئی بولی —— "مجھے چھما کر دو۔ اس دن مجھ سے بڑی بھول ہو گئی۔"

درباری نے رُک کر اس کی طرف دیکھا —— "اب تو نہیں ہو گی؟"

سیتا نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"جہاں کہوں گا، میرے ساتھ چلو گی؟"

سیتا نے اثبات میں سر ہلا دیا اور منہ پرے کرتی ہوئی ساری کے پلو سے اپنی آنکھیں پونچھ لیں۔ درباری کے بدن میں خون کا دورہ جیسے ایکا ایکی تیز ہونے لگا۔ اس نے اپنے کھردرے سے ہاتھ پھیلا گئے اور سیتا کا نرم سا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا —— "تو تو ایسے ہی ڈر رہی سیتے! —— تجھے دیکھ کر مجھے یوں لگتا ہے، جیسے میں بڑا نیچ ہوں۔"

سیتا جیسے یہی سننا چاہتی تھی۔ بولی —— "نہیں —— ایسا کیوں؟"

درباری اور سیتا وہیں پہنچ گئے۔ شیواجی پارک میں، دیوار کے نیچے —— دن ڈوب چکا تھا۔ آج آسمان پر کوئی بادل بھی نہ تھا جو زمین کی گولائیوں سے آسمان پر منعکس ہونے والی روشنی کو ادھر زمین پر پھینک دے۔ اس لیے اندھیرے نے جلدی ہی دنیا کو لپک لیا۔ سامنے مہاتما گاندھی سوئمنگ پول کے اردگرد بنے ہوئے جنگلے، دھاکے بنے اور پھر معدوم ہو گئے۔

درباری کے بڑھتے ہوئے پیار کے سامنے، سیتا منفعل سی بیٹھی رہی۔

درباری ایک دم جھلا اٹھا اور بولا —— "کچھ ہنسو، بولو بھی نا۔" سیتا کو ہنسنا پڑا۔

درباری نے سیتا کی کھوکھلی ہنسی کی نقل اتاری اور سیتا سچ مچ ہی ہنس دی۔

درباری حوصلہ پا کر بولا —— "تمھیں کیا سچ مچ مجھ پر وشواس نہیں؟"

"یہ بات نہیں" سیتا بولی "تم مجھ سے شادی کر بھی لو گے، تو بھی مجھے نفرت کی نگاہ سے دیکھو گے۔ سمجھو گے میں ایسی ہی تھی ——"

"نہیں سیتے، میں نہیں سمجھوں گا —— کبھی نہیں سمجھوں گا!"

واہ!

جبھی کچھ لوگ ہاتھ میں لوہے کی سلاخیں لیے چلے آئے۔ درباری چونکا۔ اس کی تسلّی ہوئی جب انھوں نے سلاخیں بریتے میں مارنی شروع کر دیں۔ وہ بیوڑے کے اس دفینے کو دیکھ رہے تھے جو وہ ایک دن پہلے انھوں نے بریتے میں دبایا ہو گا اور اب سمندر میں جوار آنے سے پہلے اسے برآمد کرنا، استعمال میں لانا چاہتے تھے۔ درباری اور سیتا اُٹھ کر ذرا پرے دیوار کے دوسرے کنارے پر جا بیٹھے۔ مڑ کر دیکھا تو دیوار کے اوپر بمبئی کے برتن مانجھنے والے راما لوگ بیٹھے تھے اور آپس میں ٹھٹھا کر رہے تھے۔ درباری نے دیکھتے ہوئے بھی نہ دیکھنا چاہا۔ سیتا گھبرا رہی تھی لجا رہی تھی، پسینا پسینا ہو رہی تھی۔ وہ مکمل طور پر درباری کے ہاتھوں میں تھی آج اس کا اپنا کوئی ارادہ نہ تھا۔ وہ تو کسی روٹھے کو منانا چاہتی تھی اور اس کے لیے کوئی بھی قیمت دینے کو تیار تھی۔

جبھی کچھ من چلے "اے برے دل کہیں ——" گاتے ہوئے پاس سے گزرے پھر ایک پولیس مین آیا اور درباری جھلا کر اٹھ گیا۔ اس نے خونیں آنکھوں سے اردگرد کے منظر کو دیکھا اور انگریزی میں ایک موٹی سی گالی دی، اور بولا ——

"چلو سیتے" جوہو چلیں گے"

"جوہو!"

"ہاں —— اٹھو کیڈل روڈ سے ٹیکسی لیتے ہیں۔"

سیتا چپ چاپ اُٹھ کر درباری کے ساتھ چل دی۔

سیتا اور درباری جوہو کے بیچ پر ادھر ادھر پھر نہ سکتے تھے۔ کیوں کہ اس میں خطرہ تھا۔ روز کوئی نہ کوئی واردات ہوتی رہتی تھی۔ ابھی چند ہی دن ہوئے ایک قتل ہوا تھا۔ چند غنڈوں نے ایک میاں بیوی کو بحر زندگی کے دو کناروں پر جا کھڑے

کیا تھا۔

لیکن اُس دن جو ہو کے سب ہوٹل سب کا ٹیج گاہکوں سے بھرے پڑے تھے۔
کوئی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد درباری اور سیتا فورٹ کی طرف جا رہے تھے۔
راستے میں سیتا کوئی بات کرتی تھی، درباری کوئی اور ہی جواب دیتا تھا۔ دیتا بھی تھا تو کھڑا کھڑ بے تعلق۔ زبان میں ایک عجیب طرح کی لکنت تھی جیسے کوئی نشے والی چیز منہ میں رکھ لی ہو جس سے زبان پھول گئی ہو۔

ٹیکسی حاجی علی سے ہوتے ہوئے تار دیو میں داخل ہوئی، وہاں سے اوپرا ہاؤس ہوتے ہوئے ہارن بائی روڈ پر جا پہنچی جس کا نام اب مہاتما گاندھی روڈ ہو گیا ہے۔ ایک ہوٹل پر پہنچتے ہوئے درباری نے منیجر سے پوچھا ــــــ "کوئی کمرہ ہے؟"

منیجر نے غور سے درباری کی طرف دیکھا جس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی واردات کر کے آیا ہے، یا کرنے جا رہا ہے۔ پیچھے سیتا کھڑی زمین کی طرف دیکھتے ہوئے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ دونوں گناہ کے عادی نہ تھے۔ خام، بے رحم فطرت کے ہاتھوں گرفتار وہ دیوانے سے ہو رہے تھے۔ جبھی منیجر نے پوچھا ــــــ

"آپ کہاں سے آئے ہیں؟" "جی" درباری نے ایکا ایکی سوچتے ہوئے کہا ــ "اورنگ آباد سے"

"خوب!" منیجر نے پیچھے سیتا کی طرف اور پھر درباری کے سیاہ چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ــــــ "آپ کا سامان کہاں ہے؟"

"جی سامان تو نہیں ہے۔"

"معاف کیجیے" منیجر نے درباری کی طرف یوں دیکھتے ہوئے کہا جیسے وہ کوئی نجس اور لجلجی شے ہو اور بولا ــــــ "اپنے پاس کوئی روم نہیں۔"

"کیا مطلب؟ ابھی تو ٹیلی فون پر ــــــ؟"

بیرا نمبر ۲۷ جو ایک ٹرے پر دلیر، مونگ کی دال، سوڈے کی بوتلیں اور چابی لے کر جا رہا تھا، بول پڑا ــــــ "یہ ہوٹل عزّت والے لوگوں کے لیے ہے، صاحب!"

درباری کچھ نہ کہہ سکا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا، وثوق سے جانتا تھا، اس بیرے کا ٹِپ ایک روپے سے زیادہ نہ تھا اور قبلہ منیجر صاحب کی عزّت پانچ روپے سے ــــ اور آج یہ سب کے سب ایک دم نیکی اور عزّت اور شرافت کے پتلے بن بیٹھے تھے۔ وہ عزّت اور شرافت کے پتلے تھے یا نہیں۔ لیکن، ایک بات طے تھی کہ زندگی میں کچھ بھی کر گزرنے کے لیے مشّاق ہونے کی ضرورت ہے۔ نگاہوں میں ایک پیشہ ورانہ جرأت اور بے باکی اور بے حیائی لانی پڑتی ہے جس کے سامنے مدِ مقابل کا اخلاق، اس کی شرافت اور پارسائی جھوٹی پڑ جاتی ہے ــــــ درباری اپنے اندر کہیں کمزور، کہیں بزدل تھا ــــــ وہ ایک ناتراشیدہ ہیرا تھا ــــــ لوٹتے ہوئے وہ گالیاں بک رہا تھا، انگریزی میں۔ جنھیں وہ ہوٹل کے منتظمین کو سنانا بھی چاہتا تھا اور ان سے چھپانا بھی۔

"چلو سیتا،" درباری نے کہا "پھر کبھی سہی!"

اور دونوں ٹیکسی پر بیٹھ کر گھر کی طرف چل دیے ــــــ

٥ زندگی بے کیف ہو گئی تھی۔ اتنی ہزیمت کا احساس درباری کو کبھی نہ ہوا تھا۔ اس کی نگاہوں میں کئی لوگ ہیرو ہو گئے اور بہت سے ہیرو ہیروں میں آ گرے۔

آج اس کا کہیں جانے کا ارادہ نہیں تھا، کوئی پروگرام نہیں تھا حالانکہ ایک مبہم سے احساس کے ساتھ وہ دفتر سے جلدی چلا آیا تھا۔ تھکا تھکا، ٹوٹا ٹوٹا، مضمحل سا۔ اس شام کی شکست اور بے حرمتی کے بعد ایک تسکین کا سا احساس تھا جو تسکین بھی نہیں تھی۔ یہ آگ ــــ یا تو پیدا ہی نہ ہوتی۔ اسی لیے بڑے خیال کو بہت اہمیت دیتے ہیں یا تو یہ حضرت پیدا ہی نہ ہوں اور اگر ہوں تو آپ انسان کی

اولاد کی طرح انھیں جھٹک نہیں سکتے: ان کا گلا نہیں گھونٹ سکتے کیوں کہ ہر دو صورتوں میں سزا موت ہے۔ یہ دماغ کے کسی کونے میں چپکے دبکے پڑے رہیں گے، اور اس وقت آئیں گے، جب آپ مکمّل طور پر بنتے ہوں گے، بالکل بے دست وپا غسل دی جانے والی میّت کی طرح ــــــ

درباری اس وقت برآمدے میں بیٹھا ڈان باسکو کی دیوار کے ساتھ اُگے ہوئے پیڑوں کو دیکھ رہا تھا جن کی چھاؤں میں محلّے کے امرا کی موٹریں سستا رہی تھیں۔ کچھ تو یہ اُن امیر مزدوروں کی تھیں جو گھر سے دفتر اور دفتر سے سیدھے گھر چلے آتے تھے اور بیوی کے ساتھ جھگڑے ہی سے ان کی پوری تسلّی ہو جاتی تھی اور کچھ ایسے لوگوں کی جنھوں نے انھیں چلتے پھرتے قحبہ خانے بنا رکھا تھا۔ ان کے ڈرائیوروں کو ہر شام گاڑی چمکانے اور مُنہ سی رکھنے کی تنخواہ چپکے سے دے دی جاتی تھی۔ یہ بیرہ نمبر ۲۸ تھے۔

درباری نے کھینچ کھانچ کر اس دن ہوٹل میں پیدا ہونے والی مایوسی کا، کار میں افزایش پانے والی اُمید سے تعلق پیدا کر لیا۔ لیکن کیا فائدہ؟ امید کو چمکانے دمکانے سے کار تھوڑے ملا کرتی ہے؟ باپ گردھاری لال مہتا تو پیسے کو ہوا بھی نہیں لگواتے تھے۔ اگلے جنم میں بھی سانپ بن کر دفینے پر بیٹھ جانے کا ارادہ تھا۔

صالح بھائی یا سرداری لال مع اپنے بیوی بچّوں کے اپنے گھر چلے گئے تھے۔ پیچھے ٹھنٹ سے بازوؤں والی، بے بچّہ بھابی رہ گئی تھی جس کی بھیّا سے بچّہ نہ ہو سکنے پہ تکرار ہی رہتی تھی وہ کہتی تھی ــــــ تم میں نقص ہے، اور وہ کہتے ــــــ تم میں ــــ وہ کہتی تم ڈاکٹر کو دکھاؤ، وہ کہتے تم اپنا معائنہ کراؤ۔ اور ناپید بچّے مایوسی سے انھیں دیکھتے رہتے اور اپنا سر پیٹ لیتے ــــــ

درباری مکمّل طور پر بور ہو چکا تھا۔ وہ جانتا تھا اور تھوڑی دیر گھر میں رہے گا تو ماں شادی کی باتیں کرنے چلی آئے گی اور وہ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہاں، کچھ دن تو زندگی دیکھ لے۔ آخر تو ایک نہ ایک دن ہر کسی کی شادی ہوتی ہی ہے۔

کس کے ساتھ شادی؟ سیتا لپک کر اس کے دماغ میں آتی تھی۔ سیتا ویسے ٹھیک تھی، لیکن شادی کے سلسلے میں نہیں۔ وہ بہت ایثار والی لڑکی تھی، شکل صورت سے بھی بُری نہ تھی لیکن بیوی ــــــ بیوی کوئی اور ہی چیز ہوتی ہے۔ اسے کچھ تو چلبلا ہونا چاہیے۔ اِدھر اُدھر جھانکنا چاہیے تاکہ مرد کان سے پکڑ کر کہے ــــــ "اِدھر" اور پھر یہ ہوا کی بیٹی؟ ــــــ مرد سے یوں چمٹتی ہے، جیسے وہ اس کا شوہر نہیں، باپ ہے۔

میں کہاں کرائے اگاہتا پھروں گا؟

ہلدر تھوڑی دیر کے پیار کے لیے سیتا سے اچھی کوئی نہیں۔ کیا جسم پایا ہے!

جبھی مصری دکھائی دی اور ببّل دکھائی دیا ــــــ

مصری دور ہی سے "بابو جی" کی طرف انگلی کرتی ہوئی آ رہی تھی اور ببّل وہیں سے غوں غوں غاں غاں کرتا ہوا ہمک رہا تھا۔ "پھر یکایک ببّل میں زندگی اُچھلی، جیسے گیند زمین پر سے اُچھلتی ہے اور مصری کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔"

آج ببّل خدا کے نہیں، انسان کے لباس میں تھا۔ ایک میلی سی بنیان پہن رکھی تھی۔ ہاں، نیچے اللہ ہی اللہ تھا۔

پاس آتے ہی ببّل نے دونوں ہاتھ پھیلا دیے ــــــ "کمینہ! جیسے میں اس کے لیے کرمرا لیے ہی تو کھڑا ہوں" ــــــ جیسے اندر جانا اور باہر آ کر اس کے حضور باجگذاری اس کے صبر کی آخری حد ہے۔

درباری کرمرا لے کر باہر آیا تو آج پہلی بار اسے خیال آیا ــــــ مصری ایک عورت ہے اور ببّل اس کا بچّہ۔ اور یہ سب کتنا مقدّس ہے۔ غریب لوگوں میں باپ ہوتا تو ہے، مگر محض تکلّف کی چیز۔

جبھی درباری کا دماغ تیزی سے چلنے لگا۔ وہ ایک دائرے میں گھومتا تھا اور گھوم پھر کر وہیں آ جاتا تھا۔ پھر کوئی کشف کی سی کیفیت ہونے لگی۔ آنکھیں پھیلنے اور مِٹنے لگیں۔ درباری لال نے آج وہیں سے کرمرا ببّل کو دے دیا تھا۔ جانے کیا

بات تھی جو آج درباری ببّل کو گود میں نہیں لے رہا تھا۔ جیسے وہ ٹھکرا رہا تھا۔ لیکن وہ ربڑ کی گیند ——— ببّل ——— جیسے دیوار کے ساتھ لگ کر پھر لوٹ آتا۔ یہ نہیں کہ آج اسے کرمرا نہیں چاہیے تھا۔ اسے کرمرا بھی چاہیے تھا اور آسمان کی بلند شاہت بھی۔ ببّل حیران ہو رہا تھا ——— آج یہ بابو مجھے لیتا کیوں نہیں؟

"آج تم نے کتنے پیسے بنائے ہیں، مصری؟" درباری نے کچھ جھینپتے ہوئے پوچھا۔

"یہی کوئی چودہ آنے۔"

"کیوں، صرف چودہ آنے کیوں؟"

"آج میرا مرد ناگ پاڑے چلا گیا تھا۔" مصری نے بے باکی سے کہا۔

"تیرا مرد؟" درباری نے حیران ہوتے ہوئے کہا "تم نے کوئی مرد کر لیا ہے؟"

مصری ہنسی اور ببّل کو دونوں بازوؤں میں تھام کر اونچا، درباری لال کے برابر کرتے ہوئے بولی ——— "یہ ہے میرا مرد، میرا کماؤ مرد ——— اسے آج اس کی موسی پارلے کی چونا بھٹّی لے گئی تھی۔ یہ بتیاں دی جو یہ بل کٹ پہنتا ہی نہیں۔ یوں کندھے جھٹکتا ہے، جیسے پوری دھرتی کا بوجھ لاد دیا۔"

درباری سمجھا اور ہنسنے لگا۔ ابھی تک وہ ببّل کو اپنے ہاتھوں میں نہیں لے رہا تھا اور ببّل کرمرا وغیرہ سب بھول کر شور مچا رہا تھا۔

مصری بولی ——— "ننگا رہنے کی عادت پڑ گئی، تو بڑا ہو کر کیا کرے گا؟"

"یہ ایسے ہی اچھا لگتا ہے، مصری۔"

ببّل جیسے ہمک ہمک کر کہہ رہا تھا ——— "جھوٹ! ——— اچھا لگتا ہوں تو پھر مجھے لیتے کیوں نہیں؟" اور اب تو وہ بہت ہی شور مچانے لگا تھا ———

"ہو، ہو، ہو ———"

"ببّل ہوتا ہے تو تم کتنا کما لیتی ہو؟" درباری نے پوچھا۔

"یہ؟" مصری ببّل کو نیچے کرتے ہوئے بولی۔ اس کے بازو تھک گئے تھے۔

"یہ ہوتا ہے تو مجھے تین بھی مل جاتے ہیں، چار بھی ———"

درباری نے اپنی جیب سے دس روپے کا نوٹ نکالا اور مصری کی طرف بڑھایا ———

"یہ کیا بابو جی؟" وہ بولی اور اس کا چہرہ لال ہونے لگا۔

"تم لو نا" درباری بولا۔ اور پھر ادھر ادھر دیکھ کر کہنے لگا "جلدی سے لے لو۔ نہیں کوئی دیکھ لے گا۔"

مصری نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اب تک اس کا چہرہ قرمزی ہو چکا تھا۔ اس نے جلدی سے دس کا نوٹ لیا اور ادھر ادھر دیکھ کر اپنے سینے میں اڑس لیا اور اس فقرے کا انتظار کرنے لگی جواب وہ سال میں مشکل سے تین چار بار سنتی تھی۔ لیکن مصری کا رنگ سیاہ ہو گیا جب اس نے درباری کی بات سُنی ———

"تم تو جانتی ہو، مصری" درباری بولا "میں اس سے کتنا پیار کرتا ہوں ——— ببّل سے ——— اگر تم اسے ایک دن کے لیے مجھے دے دو ———"

مصری کچھ نہ سمجھی ———

درباری نے کہا ——— "میں اسے کلیجے سے لگا کے رکھوں گا، مصری ایک ماں کی طرح، تمھاری طرح یہ مجھے اتنا اچھا لگتا ہے اتنا اچھا لگتا ہے کہ ——— بہت ہی اچھا لگتا ہے" اور درباری نے ہاتھ بڑھا کر ببّل کو لے لیا۔

ببّل ایک دم خوشی سے اُچھل گیا۔ درباری کی گود میں آتے ہی اب وہ کرمروں کے لیے گردن کو یوں اِدھر اُدھر گھمانے لگا جیسے سور چلتے وقت اپنی گردن کو ہلاتا گھماتا ہے ——— پھر اس کے گول گول، گدرائے ہوئے بازو کسی سائکل کی طرح سے چلنے لگے۔ درباری نے کرمرے کے کچھ دانے ببّل کے منہ میں ڈالے۔ جنھیں لیتے ہی وہ عام طور پر ماں کی طرف لپکا کرتا تھا۔ لیکن آج وہ درباری ہی کے بازوؤں میں شیطانی حرکتیں کرتا رہا کبھی کہتا چھوڑ دو، نیچے اُتار دو۔ کبھی پکڑ لو، چھاتی سے لگا لو ——— بیچ میں اس نے ماں کی طرف دیکھا ہنسا بھی لیکن

منہ درباری کی طرف کرلیا۔ ماں کو چڑانے لگا، جیسے درباری کو چڑایا کرتا تھا۔

مصری ابھی تک بھونچکی کھڑی تھی اور غیر یقینی انداز سے باپ بیٹے کی سی دونوں ہستیوں کو دیکھ رہی تھی۔

"کہیں آپ کے کپڑے خراب کردیے تو؟"

"تو کیا ہوا؟" درباری نے کہا "بچّوں کی ہر چیز امرت ہوتی ہے۔"

مصری کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ پہلے اس نے سوچا تھا۔ زندگی میں بہت ہی نایاب چیز تھوڑی دیر کے لیے اسے مرد مل گیا۔ اب اس نے سوچا، میرے بچّے کا باپ مل گیا اور پہلی چیز سے دوسری بہت بڑی تھی۔

"میں اسے کھلاؤں گا، پلاؤں گا، مصری" درباری نے وعدہ کیا "تم رات دس بجے کے قریب اسے لے جانا۔"

"اچھا" ——— مصری نے سر ہلا دیا۔

مصری چلی۔ پھر رک گئی۔ مڑ کر بچّے کی طرف دیکھا جو درباری کے بازوؤں میں کھیل رہا تھا۔ اور اپنے ارد گرد درباری کی بند مٹھی کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور اس کے نہ کھلنے پر جھلّا رہا تھا۔ مصری نے آواز بھی دی، ببّل نے دیکھا بھی۔ مگر اسے آج کسی بات کی پروا نہ تھی۔ باپ کی پروا نہ تھی تو ماں کی بھی نہیں۔

مصری پھر چلی لیکن جیسے اس کا دل وہیں رہ گیا۔ رک کر پھر دیکھنے لگی اور جب اسے اس بات کی تسلّی ہوگئی کہ ببّل رہ لے گا تو وہ جلدی جلدی چلی گئی۔ کچھ دور جاکر اس نے نیفے میں سے دس کا نوٹ نکالا اور اس کی طرف یوں دیکھا جیسے کوئی اپنے شوہر کی طرف دیکھتی ہے۔

درباری ببّل کو لیے اندر آیا۔ ببّل کو کمرے کی بہت سی چیزوں میں دلچسپی پیدا ہوگئی۔ ہر چیز اس کے لیے نئی تھی۔ ہر شے کو وہ منہ میں ڈال کر ایک نیا تجربہ کرنا چاہتا تھا۔ ایسا تجربہ جس کی کوئی حد نہیں۔ ایسا سواد جس کی کوئی سیما نہیں۔ جبھی ماں اندر چلی آئی اور درباری کے ہاتھ میں بچّے کو دیکھ کر حیران ہو اٹھی۔ ناک پر

اُنگلی رکھتی ہوئی بولی ——— "ہائے رام، یہ کیا؟"

"ببّل ماں ——— مصری کا بیٹا" درباری بولا ——— "مجھے بڑا پیارا لگتا ہے۔"

"اس کی ماں کہاں ہے؟"

"گئی ——— میں نے تھوڑی دیر کھیلنے کو لے لیا ہے، اُدھار ——— ایک بار پیدا کردیا، پھر ماں کا کیا کام؟" درباری نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جا رے جا" ماں بولی "بچے آٹھ مہینے تک ہی ماں کی جرورت ہوتی ہے۔ پھر جیسے اپنے آپ تیرے ایسے لوٹھے بن جاتے ہیں۔"

"اچھا ماں" درباری نے کہا "میں اسے پوددار کالج کے سامنے والے میدان میں لے جاؤں گا، جہاں پاس ہی مجھے جگ موہن کی کتابیں بھی لوٹانی ہیں تو ذرا اسے پکڑ۔"

ماں نے جھرجھری لی "ہا ——— گندا" اور ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی "میں تو اسے ہاتھ نہیں لگانے کی۔"

بھابی جو کچھ دیر پہلے آ کھڑی ہوئی تھی، بولی "اتنا ہی شوق ہے تو اپنا ہی کیوں نہیں لے آتے؟ شادی کر لیتے؟"

"نہیں" درباری نے بھابی پر چوٹ کرتے ہوئے کہا ——— "مجھے دوسروں ہی کے اچھے لگتے ہیں۔"

بھابی نے ٹھنڈی سانس لی ——— "اب بھگوان نہ دے تو کوئی کیا کرے؟"

درباری نے ببّل کو نیچے فرش پر بٹھا دیا، جہاں اس کی توجہ جرمن سلور کے ایک چمچے نے اپنی طرف کھینچ لی تھی۔ درباری خود اندر چلا گیا اور ببّل چمچے کو منہ میں ڈالتا، چوستا رہا۔ شاید وہ کچھ اور بھی دانت نکال رہا تھا۔

ایکا ایکی ببّل کو اپنا آپ اکیلا محسوس ہوا۔ اس نے اپنے ہاتھ پہلے ماں، پھر بھابی کی طرف پھیلا دیے۔ ماں تو چھی چھی کرتے ہوئے اندر چلی گئی۔ بھابی ایک لمحے کے لیے ٹھٹکی۔ پھر جیسے اندر کے کسی اُبال نے اسے مجبور کر دیا اور لپک کر

اس نے ببّل کو اٹھا لیا۔ اور اسے سینے سے لگا کر ہلنے لگی، جیسے کسی اپار سُکھ اور شانتی کے جھولے میں پڑی ہے۔ ببّل اسے گندا نہیں لگ رہا تھا۔ من ہی من میں اس نے ببّل کو نہلا دُھلا کر ایک بھکارن کے بیٹے سے کسی رانی کا بیٹا بنا لیا تھا اور اندر ہی اندر اس نے سیکڑوں ریشمی اور سوتی فراک بنا ڈالے تھے اور سوچ رہی تھی اتنا خوبصورت ہے، میں اس کے لیے لڑکیوں والے کپڑے بنواؤں گی ـــــــ

اندر پہنچ کر درباری نے سوٹ کیس نکالا۔ اس میں کچھ کپڑے رکھے اور پھر اس کے اوپر کچھ کتابیں۔ پھر دھپ سے سوٹ کیس بند کیا اور بیٹھک کی طرف آ دڑا۔

بیٹھک میں پہنچا تو ببّل ہمیشہ کی طرح چھاتیوں میں سر دیے ہوئے تھا۔ درباری کے پہنچتے ہی اس نے مُنہ نکالا اور ایک فاتح کی طرح درباری کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اگلے ہی پل، جانے کس جذبے، کس گنتی سے اس نے اپنے پورے پیر درباری کی طرف پھیلا دیے درباری نے بڑھ کر ایک ہاتھ میں ببّل کو اٹھایا، دوسرے میں سوٹ کیس تھاما اور اچھّا بھابی ـــــــ کہہ کر باہر نکل گیا۔

دادر پہنچ کر ریڈی میڈ کپڑوں کی دکان سے درباری نے ببّل کے لیے ایک قمیص خریدی اور ساتھ ایک نکر بھی۔ قمیص تو جیسے تیسے ببّل نے پہن لی لیکن نکر پہنتے وقت اس نے باقاعدہ شور مچانا، چیخنا چلّانا شروع کر دیا تھا۔ جتنی دیر بھی وہ کھڑا رہا۔ برابر اپنی ٹانگوں سے سائکل چلاتا رہا۔ ابھی ہمکا، پھر گرا۔ درباری ایک ہاتھ سے پکڑتا تو وہ دوسرے ہاتھ کی طرف لڑھک جاتا اور پھر مُنہ اٹھا کر درباری کی طرف حیرانی سے دیکھتا جیسے کہہ رہا ہو ـــــــ عجیب آدمی ہو، ایک بچّہ بھی اپکڑنا نہیں آتا۔

پھر ایکا ایکی بجلی کے ایک قمقمے نے اس کی توجّہ اپنی طرف کھینچ لی۔ وہ اوپر

کی طرف ہمکا بجلی کے ڈر سے درباری نے ہاتھ اُوپر کیا ہی تھا کہ ببّل نے پاس چلتے ہوئے ٹیبل فین کی جالی میں اپنی انگلی جا ڈالی، دکاندار نے لپک کر ہاتھ ہٹا لیا، نہیں تو جناب کی انگلی اڑ گئی تھی۔ جھٹکے سے ہاتھ پرے کرنے پر اس نے رونا شروع کر دیا اور جب درباری نے اسے گود میں اٹھایا تو وہ شکایت کے لہجے میں پہلے درباری اور پھر دکاندار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور اس کی طرف ہاتھ اٹھا رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو اس نے مجھے مارا۔

ٹیکسی میں بیٹھتے ہی ببّل کچھ جھلّا سا گیا۔ دراصل اسے نکر کی وجہ سے تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ زندگی بھر یوں کسا نہ گیا تھا۔ درباری نے اسے سیٹ پر بٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ تکلے کی طرح اکڑ گیا۔ جیسے کہہ رہا ہو ـــــــ تم گاڑی پر بیٹھو، میں تم پر بیٹھوں گا۔ نہیں مجھے لے کر چلو ـــــــ بازار میں، جہاں لوگ آ جا رہے تھے۔ پھر اس نے زور سے، اوپر نیچے ہو کر آخر نیکر نکال ہی دی اور اس پر کودتے ہوئے اسے یوں چرمر کر دیا کہ کوئی استری اس کے بل نہ سیدھے کر سکتی تھی اور اب ـــــــ نکر نکال دینے کے بعد وہ خوش تھا۔ ایک عجیب قسم کی آزادی کا احساس ہو رہا تھا اسے، جب وہ کھڑکی میں کھڑا ساری دنیا کو دیکھ اور دکھا رہا تھا!

درباری جب سیتا کے ہاں پہنچا تو وہ گھر پر نہ تھی۔ درباری نے سر پیٹ لیا۔ ماں نے بتایا وہ پربھادیوی میں گُڈ سے ملنے گئی ہے پر بھادیوی کا علاقہ کوئی دور نہ تھا لیکن گُڈ کے گھر کا کیسے پتا چلے؟ پوچھتا تو ماں کہتی ـــــــ کیوں کام کیا ہے؟ اس لیے خاموش ہی رہنا اچھّا تھا۔

اس پہ ایک اور مصیبت ـــــــ ماں بتانے لگی، پہلے ماے پہ رہنے والے سندھی نے "نوسٹ" دے دیا ہے۔ نوٹس دے دیا ہے تو وہ کیا کرے؟ اس وقت تو حالات نے اسے نوٹس دے دیا ہے۔" کچھ دیر بیٹھا وہ ماں کی بوڑھی باتیں سنتا رہا اور بتاتا رہا یہ ببّل اس کا بھانجا ہے۔ بڑا پیارا دلارا بچّہ ہے۔ لیکن ماں

کو جیسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس نے صرف ایک بار کہا۔ کیوں رے، ببّل نے جواب بھی دیا، لیکن ماں نے آگے بات نہ چلائی۔ ببّل کو ماں کی بولی معلوم تھی۔ لیکن ماں ببّل کی بولی بھول چلی تھی۔ وہ پھر اپنے رونے لے بیٹھی ــــــ "کمیٹی کہتی ہے ہر سال اتنے پیسے مرمّت پر لگایا کرو۔ اب بھلا کوئی روٹی کھائے کہ مرمت کروائے کیا! کیا کانون پاس ہو گئے ہیں۔ کانگریس سرکار توڑ دینے کو آئی ہے۔ اشٹ گرہی میں کیا ہوگا؟ میں تو جگادھری مائیکے لوٹ جاتی ہوں ــــــ تم شادی کب کروگے؟"

کوئی ہی دیر میں ماں بور ہوگئی۔ ہاں، ماں بور ہوگئی۔ بولی ــــــ سیتا پتا نہیں آتی ہے کہ نہیں آتی۔ تم ٹیکسی پر تو آئے ہی ہو۔ مجھے ذرا ماہم تک چھوڑ دو۔"

"میں ماہم کی طرف نہیں جا رہا، ماں جی ــــــ"

کدھر جا رہے ہو؟"

"شہر کی طرف۔"

"ٹھیک ہے،" ماں بولی "وہاں بھی پریل کے پاس مجھے کام ہے ــــــ ہنڈوے آ رہے ہیں نا، مجھے موٹی خریدنی ہے۔ موٹی جانتے ہو کیا ہوتی ہے؟"

درباری سٹپٹا کر رہ گیا ببّل تنگ کرنے لگا تھا۔ اس پر باہر ٹیکسی کا میٹر چڑھ رہا تھا۔ اسے کچھ نہ سوجھا تو دل ہی دل میں ماتھے پر ہاتھ مار کر بولا ــــــ "چلو ماں جی، میں آپ کو پاریل چھوڑ دوں راستے میں کمد کا گھر ہے نا؟"

"ہے تو" ماں اُٹھتے ہوئے بولی ــــــ "پر آگ لگے ــــــ یہ بازار بمبئی کے ــــــ بیس بار گئی ہوں تو بیس بار ہی گھر بھول گئی ــــــ"

"چلو، اکیسویں بار بھی بھول جانا۔"

"پر تم ــــــ سیتا کو لے کہاں جا رہے ہو؟"

"دیدی کے پاس ــــــ کیا نا؟"

"سُنا ہے وہ مسلمان ہے؟"

"کیا بات کرتی ہیں، ماں جی؟" درباری نے جیسے کسی گرتے ہوئے پہاڑ کو

تھام لیا ــــــ ستھ نتی نار کسی مسلمان عورت کا نام ہو سکتا ہے؟"

اس سے پہلے کہ ماں پورے طور پر درباری پر مسلّط ہو جائے، سیتا چلی آئی بہار کے ایک جھونکے کی طرح، دامن میں پتّے ہی پتّے، پھول ہی پھول لیے۔ اس نے آٹرن گرے رنگ کی ایک چولی چست کی ہوئی تھی اور بلکی چاولوں کے کلر کی سی ہینڈلوم ساری لپیٹ رکھی تھی، جو جسم کے سارے خطوں کو ایک آزاد، ایک طوفانی سے بہاؤ میں لے آئی تھی۔ خود وہ بہار کا جھونکا تھی، لیکن درباری کے لیے پت جھڑ کا پیغام۔ اس کے اندر کے پھول پتّے ایک ایک کر کے خشک ہونے، گرنے اور کچھ آندھیوں کے ساتھ اڑنے لگے ــــــ اور جو ڈال پہ رہ گئے تھے، سوکھ کر، آپس میں ٹکرانے دل کو دھڑکانے لگے ــــــ

سیتا نے آتے ہی پہلے ببّل کو دیکھا اور آنکھیں پھیلائیں ــــــ "کس کا بچّہ ہے؟" اور پھر لپک کر بچّے کے پاس جا پہنچی "ہے، کتنا پیارا ہے، ببلو سا۔"

"ہاں،" درباری نے کہا "ببّل ہی اس کا نام ہے، تمھیں کیسے پتا چلا؟"

"مجھے کیا معلوم؟" سیتا نے تالی بجاتے، ببّل کو اپنی آغوش میں بلاتے ہوئے کہا ــــــ "ہر بچّے کی شکل سے اس کے نام کا پتا چل جاتا ہے ــــــ تمھیں نہیں چلتا؟"

ببّل نے پہلے شک و شبہہ کی نظر سے سیتا کی طرف دیکھا اور پھر مسکرا دیا۔ جیسے برسوں سے جانتا ہو اور پھر ترازو کے انداز میں بازو اٹھا دیے۔ سیتا نے اسے اٹھا لیا، چھاتی سے لگا لیا اور سب عورتوں کی طرح تھوڑا جھول گئی۔ بس رشتہ قائم ہوتے ہی ببّل نے چھوٹی الماری پر پڑی ہوئی کسی ٹوکری کی طرف اشارہ کیا اور "او ــــــ او ــــــ" کرنے لگا جیسے کہ رو رہا ہو، اس میں کچھ ہے، میرے لیے؟

درباری کی نگاہوں میں خواب تھے اور جب سیتا نے دیکھا تو اس کی نظروں میں سپنے تھے اور بچّے۔ شاید ببّل سیتا کی آنکھوں میں سے منعکس ہو رہا تھا۔

دربار ی نے کچھ اُتاولے ہو کر کہا ——— "گھنٹہ بھر سے میں تمھاری راہ دیکھ رہا ہوں، ڈیڈی نے بلوایا ہے۔"

سیتا نے ماں کی طرف دیکھا ——— "ماں ——— ؟"

"ہاں بیٹا" ——— ماں نے اجازت دیتے ہوئے کہا۔

"ٹھہرو ——— میں اس کے لیے کچھ بسکٹ ——— "

درباری نے اور بے صبری سے کہا ——— "ہوتے رہیں گے، تم چلو ——— میرے پاس اتنا سا بھی وقت نہیں ہے" ——— اور سیتا ببل کے گال رگڑتی ہوئی چل دی، کہتی ہوئی "للے رے تو تو چھوٹا سا، موٹا سا، گوتا سا ببلو ہے ——— "

اور سیتا دل میں اتنا سا بھی وسوسہ لیے بغیر چل دی۔ باہر ٹیکسی کو دیکھتے ہوئے بولی ——— "اس میں چلیں گے؟"

درباری نے سر ہلا دیا۔ ٹیکسی ڈرائیور جو بے کیف ہو رہا تھا، خوش ہو گیا۔ پیچھے کی طرف لپک کر اس نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور ببل اور سیتا اور آخر درباری بیٹھ گئے۔ جبھی سیتا کی نگاہ سوٹ کیس پر پڑی ——— ایک شک کی پرچھائیں اس کے چہرے پر سے گزری "یہ سوٹ کیس ——— ؟"

"ہاں" درباری نے کہا۔

"ڈیڈی کے ہاں جا رہے ہو؟"

"کہیں بھی جا رہا ہوں تمھیں اس سے کیا؟" اور پھر ایک خشمناک نگاہ سیتا پر پھینکتے ہوئے بولا ——— "تم نے کہا نہیں تھا، جہاں بھی لے جاؤ گے، جاؤں گی؟"

سیتا کو کچھ باتیں سمجھ میں آنے لگیں۔ درباری کے چہرے کی رنگت، سوٹ کیس ——— بچہ ——— اس نے ڈر کے عالم میں ببل کو سیٹ پر بٹھا دیا اور نتھنے پھلاتی ہوئی بولی ——— "ہاں، کہا تھا ——— "

سیتا نے پھر ایک تیز سی نظر درباری پر پھینکی اور پھر اپنی نگاہیں چرا لیں۔ اسے اپنا آپ جیسے کچھ گندا لگا۔ ساری کے پلو سے اس نے اپنا لال ہوتا ہوا چہرہ پونچھا۔ درباری نے خمار آلود نگاہ سیتا پر پھینکتے ہوئے کہا ——— "سیتا! تم پھر لگی ہو، اس دن کی طرح کرنے؟"

سیتا ڈر گئی ——— "نہیں تو" وہ بولی۔

ٹیکسی حاجی علی کے پاس سے جا رہی تھی۔ آج سمندر کا وہی رنگ تھا جو مانسون سے پہلے ہوتا ہے۔ میلا کچیلا، گندا اور گیلا ——— شاید دور کہیں برسات شروع ہو چکی تھی اور بے شمار گندے نالے اور ندیاں سمندر میں پڑ رہی تھیں ———

پھر وہی سفر ——— تار دیو، اوپیرا ہاؤس، مہاتما گاندھی روڈ، فلورا فاؤنٹین۔ اور ایک ہوٹل۔ آج وہ ہوٹل نہیں تھا جہاں وہ اس دن گئے تھے۔

سامنے ایک بیرا کھڑا تھا۔ درباری، سیتا اور ببل کو دیکھ کر لپکا۔ بڑی عزت بڑے ہی احترام کے ساتھ اس نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا۔ درباری اترا ٹیکسی والے کو پیسے دیے اور پھر بیرے کو سوٹ کیس اُتارنے کا اشارہ کیا ——— سیتا اتری۔ اس کی آنکھیں جھکی جھکی سی تھیں اور ببل کو اپنے بازوؤں میں لینے سے جیسے اسے کچھ تامل ہو رہا تھا ———

"اٹھاؤ نا" درباری نے ببل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، "بچہ ہمیشہ عورت اُٹھاتی ہے۔"

سیتا نے کچھ بے بسی کے عالم میں ببل کی طرف دیکھا جیسے وہ ابھی اُسے اٹھانا نہ چاہتی تھی۔ لیکن درباری اور اس کے غصے سے ڈرتی تھی۔ مرد اور اس کی وحشت سے خائف تھی۔ اس نے ببل کو اٹھا تو لیا لیکن اس سے پیار نہ کر سکتی تھی ——— اسے کچی کچی، کھٹی کھٹی، گندی گندی ڈکاریں سی آنے لگی تھیں۔

ہوٹل اوپر تھا۔ درباری نے یہ بھی تو نہ پوچھا ——— کمرہ ہے ——— اب کوئی ضرورت نہ تھی۔ وہ اپنی نگاہوں میں وہی پیشہ ورانہ بے باکی پیدا کر چکا تھا، جس کی اب ضرورت بھی نہ تھی۔

سیتا نے دیکھا ——— سیڑھیوں پر جیسے کسی نے تیل اور گھی کے ڈرم کے ڈرم لڑھکا دیے ہیں۔ رستہ جس کی مدد سے نہ جانے کتنے لوگ اوپر گئے تھے ہاتھوں کے لگنے سے میلا اور گندا ہو رہا تھا۔ پوری فضا سے کسی باسی دہی کی بُو آ رہی تھی۔

رستے کو ہاتھ لگائے بغیر ہی سیتا درباری کے پیچھے پیچھے اوپر پہنچ گئی۔

مینجر صاحب نے تینوں کو آتے دیکھا تو ان کے چہرے پر ایک عجیب مقدس سی چمک چلی آئی۔ وہ عجلت سے کونٹر کے پیچھے سے نکلا اور دونوں ہاتھ کمرے کی طرف سویپ کرتے ہوئے بولا ——— "ویلکم سر ———" آج سب کمروں کے دروازے سیتا اور درباری پر کھلے تھے۔

درباری نے مینجر سے کہا ——— ہم بمبئی موراسے آئے ہیں اور اس وقت ٹرانزٹ میں ہیں۔ رات گیارہ بجے والی پنجاب میل سے آگرے جائیں گے۔ جہاں تاج محل دیکھیں گے۔ جو شاہ جہاں نے اپنی چہیتی ممتاز کے لیے بنوایا تھا۔ دراصل اسے ممتاز سے اتنی محبت نہ تھی، جتنا جُرم کا احساس تھا۔ کیوں کہ اس سے اس نے سولہ اٹھارہ بچے پیدا کیے تھے۔ اور اپنی اس زیادتی کا اسے صلہ دینا چاہتا تھا ——— "پر ان باتوں کی ضرورت ہی نہ تھی۔ مینجر "سر، سر" کرتا رہا ضرورت پڑنے پر ہنستا بھی، ضرورت سے زیادہ بھی ہنستا ——— سر بھی ہلاتا، جھک جھک کر آداب بھی بجا لاتا۔

رجسٹر پر دستخط کرنے کے بعد درباری کمرے میں پہنچا تو ببل کے ہاتھ میں بسکٹ تھے۔ "یہ کس نے دیے؟"

"بیرے نے" سیتا بولی۔

"اور یہ ——— آئس کریم کی کون؟"

"پڑوس کا ایک مہمان دے گیا ہے۔"

اور بیرا بچے کے لیے کٹوری میں دودھ لا رہا تھا ——— جیسے وہ صدیوں سے بیکار تھا اور آج ایکا ایکی اسے کوئی کام ایسا روزگار مل گیا تھا جو کبھی ختم ہونے والا نہ تھا جس میں کبھی چھٹنی نہیں ہوتی۔ جس کے سامنے ٹپس کی آمدنی

اور پگار کوئی معنی نہ رکھتے تھے۔ وہ خوش تھا اور دودھ کی کٹوری ہاتھ میں تھامے ہوئے وہ یوں کھڑا تھا، جیسے وہ کسی کو نہیں کوئی اسے ممنون کر رہا ہے۔ وہ جانا، ٹلنا نہ چاہتا تھا ———

"اچھا بیرا" درباری نے بے رحمی سے بیرے کو جھٹکتے ہوئے کہا ——— "ہم تھک گئے ہیں، دیکھو نا، کب سے چلے ہیں۔ اب تھوڑا آرام کریں گے۔"

"جی!" بیرا بولا "میری ضرورت پڑے صاحب ———"

درباری نے کھٹ سے دروازہ بند کر لیا اور اندر سے چٹخنی چڑھا دی وہ سچ مچ تھک گیا تھا۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور جا کر بستر پر بیٹھ گیا۔ اسے سیتا کا ببل کو دودھ پلانا بُرا لگ رہا تھا لیکن وہ کچھ کہہ نہ سکتا تھا۔ کہتا تو برا لگتا، بہت ہی بُرا ———

جبھی اپنے کھلنڈرے پن میں ببل نے کٹوری کو ہاتھ مارا دودھ نیچے گر گیا۔

"ہائے! گندا کہیں کا" سیتا نے کہا اور رومال سے اس کا منہ پونچھنے اور پھر جھاڑن سے فرش صاف کرنے لگی۔ ببل کو ہاتھ لگانے کی دیر تھی کہ وہ سیتا کی باہیں پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ سیتا اندر ہی اندر کانپ رہی تھی، درباری کچھ خجل سا نظر آنے لگا تھا۔

"یہ ہوٹل کوئی اتنا اچھا نہیں" وہ یونہی سی کوئی بات کرنے کے لیے بولا۔

"ٹھیک ہے" سیتا بے پروائی سے بولی۔

پھر درباری نے ناک سکوڑ کر ادھر ادھر سونگھا اور کہنے لگا ——— "کوئی بُو سی آ رہی ہے" ——— اور پھر اس نے پسینے کے قطرے اپنے ماتھے پر سے پونچھ ڈالے اور بولا "تم اب اسے چھوڑو بھی!"

سیتا نے ببل کو بٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ تنکلا ہو گیا۔

درباری نے ایک ایش ٹرے ببل کے پاس لا رکھی اور ببل اسے کھلونا سمجھ کر لپکا۔ وہ بیٹھ گیا اور کھیلنے لگا ——— وہ کیا کرتا!

پھر آگے بڑھ کر درباری نے ایک اناڑی، بے ڈھنگے بھونڈے انداز میں

سیتا کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"بھگوان کے لیے ———" سیتا بولی، اور اس نے بلّو کی طرف اشارہ کیا۔

لیکن درباری کی آنکھوں پر جیسے کوئی چربی چھائی ہوئی تھی۔ اسے کچھ نہ دکھائی دے رہا تھا۔ صرف ایک ہی احساس تھا کہ وہ ہے اور ایک تر و تازہ اور شاداب لڑکی۔ وہ تیزی سے سانس لے رہا تھا۔ اس نے جب اپنے بازو سیتا کے گرد ڈالے تو وہ گوشت پوست کے نہیں، لکڑی کے معلوم ہو رہے تھے اور سیتا کے نرم اور گداز جسم میں کھبے جا رہے تھے۔ سیتا نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ درباری کی بانہوں میں کانپتی ہوئی وہ ہر لحظہ بے دم ہوتی جا رہی تھی ——— آج وہ خود بھی بے سہارا ہو جانا چاہتی تھی ———

بلّو نے ڈر کر دونوں کی طرف دیکھا۔

سیتا کو ابھی تک روتے دیکھ کر درباری کہہ رہا تھا ——— "یہی مطلب ہوا نا۔ تم مجھ سے پیار نہیں کرتیں۔"

"میں تم سے پیار نہیں کرتی؟ ——— میں تم سے ———"

بلّو نے ایش ٹرے کی راکھ منہ پر مل لی تھی اور اب رونے لگا تھا!

"چپ بے" درباری نے نفرت اور غصہ کے ساتھ کہا۔

سیتا چونکی، وہ باہر بھاگ جانا چاہتی تھی، لیکن ——— اس کے ہاتھ بازو جواب دے چکے تھے ———

درباری کی ڈانٹ کے بعد بلّو نے ڈر کر چلّانا شروع کر دیا۔ درباری ایک دم آگ بگولا ہو کر لپکا جیسے اس کا گلا گھونٹ دے گا۔ مرد اور عورت کے بیچ اس بے آہنگ آواز کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دے گا۔ بلّو کے پاس پہنچتے ہی اس نے زور سے ایک تھپڑ بلّو کو مار دیا۔ بلّو لڑھک کر دور جا گرا۔

"شرم نہیں آتی؟" کہیں سے مصری کی آواز آئی۔

درباری نے پلٹ کر دیکھا ——— مصری نہیں سیتا تھی جو کسی انجانی

طاقت کے آجانے سے نیم برہنہ حالت میں اٹھ کر بلّو کے پاس چلی آئی تھی اور اسے اٹھا کر اپنی چھاتی سے لگا لیا تھا۔ بلّو سیتا کی چھاتیوں میں سر دیے رو رہا تھا، سسکیاں لے رہا تھا۔ پھر اس نے اپنا منہ اٹھایا اور بندھی ہوئی گھگھی کے باوجود درباری کی طرف اشارہ کرنے لگا۔ جیسے کہہ رہا ہو ——— اس نے مجھے مارا!

درباری کو محسوس ہوا جیسے اتنے صاف ستھرے کپڑوں میں بھی وہ گندا ہے، وہ سیتا سے اتنا شرمندہ نہ تھا، جتنا بلّو سے ——— لیکن، اپنے آپ کو حق بجانب سمجھنے کی اس کے پاس ابھی بہت سی دلیلیں تھیں۔

جبھی درباری نے اپنا سر جیسے کسی دلدل میں سے اٹھایا اور بلّو کی طرف دیکھنے لگا وہ سیتا کی طرف دیکھ بھی نہ سکتا تھا۔ کیوں کہ وہ ننگی تھی اور بلّو سے اپنے ننگے پن کو چھپا رہی تھی اور درباری کو دیکھ رہی تھی جیسے وہ دنیا کا سفلہ ترین انسان تھا جو اس کمینہ حد تک اتر آیا تھا ——— پھر اس کی نگاہیں خالی تھیں، وہ کچھ بھی نہیں سمجھ رہی تھی!

شرمساری، ندامت اور خجالت سے درباری نے اپنا ہاتھ بلّو کی طرف بڑھایا سیتا کا بس چلتا تو وہ کبھی بلّو کو درباری کے گندے اور نجس ہاتھوں میں نہ دیتی۔ لیکن وہ کیا کرتی۔ بلّو خود ہی بیتاب ہو کر درباری کے بازوؤں پر لپک گیا اور روتے ہوئے الٹا سیتا کی طرف اشارہ کرنے لگا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ اس نے مجھے مارا ——— اب درباری کے پاس کوئی دلیل نہ تھی اور نہ سیتا کے پاس۔ ——— "سیتا" درباری نے کہا ———

سیتا کچھ نہ بولی ——— وہ رو بھی نہ سکتی تھی۔ جلدی سے اس نے ساری کا پلو کھینچا اور اپنا جسم ڈھک لیا۔

"سیتا" درباری پھر بولا ——— "تم کبھی ——— کبھی مجھے معاف کر سکو گی؟" اور پھر شک و شبہے کے انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ——— "ہم پہلے شادی کریں گے۔"

اور پھر اس نے ہمّت کر کے اپنا دوسرا بازو سیتا کے گرد ڈال دیا۔ سیتا نے دریاری کی آنکھوں میں دیکھا اور پھر ایک جست کے ساتھ دریاری سے لپٹ گئی اور اس کے کاندھے پر سر رکھ کر بچّوں کی طرح رونے لگی۔ اس کے آنسوؤں میں دریاری کے آنسو بھی شامل ہو گئے۔ دونوں کے دکھ ایک ہو گئے اور سُکھ بھی ___

ان دونوں کو روتے دیکھ کر ببّل نے رونا بند کر دیا اور حیرانی سے کبھی سیتا اور کبھی دریاری کی طرف دیکھنے لگا ___ جبھی ایکا ایکی وہ ہنس دیا، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں اور اپنے کرمّرے کے لیے دریاری کی مٹھّی کھولنی شروع کر دی!

لمبی لڑکی

آخر جب مُنّی سوہی پانچ فٹ آٹھ انچ کی ہو گئی تو دادی رُقمن نے اپنا سر پیٹ لیا ___ "ارے! ___ میں تیرے لیے بر کہاں سے گھڑا کے لاؤں گی؟" وہ اپنے ڈھائی بال نوچتے ہوئے بولی اور اب کے سچ مچ روتی ہوئی وہ اپنے ڈھیلے ڈھالے، بوڑھے اور بیمار پلنگ میں پیچھے کی طرف یوں جا دھنسی جیسے گھڑے سے پانی چھلک کر کچّی زمین سے کہیں گم ہو جاتا ہے۔

منّی سوہی کیا جواب دیتی؟ اس نے پہلے اپنی طرف دیکھا اور پھر بے بسی میں دادی رُقمن کی طرف۔ جیسے وہ کہہ رہی تھی ___ اس میں میرا کیا قصور؟ منّی تو اپنی لمبان سے آپ شرمندہ تھی جیسے جوانی کی ناگہانی یورش کے بعد ہر کنواری گھبرا اٹھتی ہے۔ کوئی پوچھے جب پیڑ پر پھل لگتے، پکتے ہیں تو کیا پیڑ گھبرانے شرمانے لگتا ہے؟ پلنگ کے پاس اخروٹ کی ایک تپائی رکھی تھی جس پر عقیدت کے رنگوں سے کڑھا ہوا ایرتیکس کا ایک کپڑا پڑا تھا اور اس کے اوپر پانڈووں کے زمانے کی، پرانے چھاپے کی ایک گیتا، جس کے پنّے کھلے ہوئے تھے اور ہوا میں اڑ رہے تھے۔ گیتا ہمیشہ دادی کے سرھانے پڑی رہتی۔ ہاں، دادی کا کیا پتا اب ہو تب نہ ہو۔ بیاسی برس کی عمر تھی اس کی، اور جہاں گھر اور اس تیلی محلے

کے لوگوں کی بے آسی بڑھتی جا رہی تھی، دادی ماں کی امیدیں جوان ہو رہی تھیں۔ وہ کچھ نہیں تو کم سے کم اتنا ہی اور بیاسی سال اور جینا چاہتی تھی جیسے ابھی کوئی سواد نہیں آیا۔ آیا ہے تو ابھی آیا ہے۔ اس کی دھندلی مگر بے چین آنکھیں نہ معلوم اور کس وچتر گھٹنا کو ڈھونڈتی تھیں؟ منہ کس ذائقے چٹخارے کی تلاش میں تھا؟

اس کا چہرہ پیڑ پر سے گرے ہوئے پیپل کے پتے کی طرح تھا، جس میں رگوں اور ریشوں کا ایک جال سا نظر آتا تھا، ہریالی کہیں نام کو نہ تھی۔

دادی رکمن کی ہریالی کہیں نہ کہیں ضرور اٹکی ہوئی تھی۔ دورے کے سمے وہ کھانستی۔ ہوا سے ہوا ہی میں، ہوا کی ہتھیلیاں بھرتی، فضا میں پھواریں چھوڑتی ہوئی، بے دم بے سدھ ہو کر پیچھے کی طرف لڑھک جاتی۔ آنکھوں کی پتلیاں اوپر کی طرف سمٹتی ہوئی وسم ذوار کو دیکھنے لگتیں۔ پران پانچ چکروں میں سے نکل کر چھٹے میں چلے آتے گلے کا گھنگھرو بجنے لگتا۔ بھابی شیلا پیٹی کوٹ ہی میں بھاگی آتی۔ دادی کو آخری سواسوں میں دیکھ کر آنکھیں پھیلاتی، چلاتی — "ہائے! کوئی ان کو خبر کرو" — منی سو ہی دوڑتی۔ — روتی پکارتی ہوئی "باپو! کہاں ہو؟ — دادی گئی!" اور پھر دادی سے لپٹ جاتی — "دادی میں بے ماں کی بیٹی — مجھے چھوڑ نہ جانا —"

اور پھر بھابی شیلا اور منی سو ہی مل کر گیتا کے سترھویں ادھیائے کا پاٹھ شروع کر دیتیں۔ سماپتی کے بعد اس کا پھل داری کے نمت دینے لگتیں تا کہ دادی کی جان آسانی سے نکل جائے۔ ایک تو ویسے ہی موت کے وجود کا احساس، اس پر آوازوں میں ڈرتا، کانپتا ہوا ترنم — پوری فضا میں ایک ڈراونی، گھناونی سی جھنکار پیدا ہو جاتی۔ پھر ایکا ایکی کوئی شونیہ، جس سے گھبرا کر منی پکار اٹھتی — "دادی ی ی ی ی —" اور اس کی آواز چوکٹ گونج جاتی۔ جبھی بھابی بڑھیا کے بھاگ پر جن اٹھتے، کرم ہین ہاتھ اور چرتر ہین شریر پر بلکھ دوڑتے ہوئے کہتی — "گئی!" اور پھر — "ارے کوئی نیچے

اتارو، دیا کرو — بے گتی مر گئی تو خرچہ کون کرے گا؟ کون پنڈتوں کو روپے پوجے گا؟ سترہ روپے نو آنے تو خالی یہاں سے ہردوار کا کرایہ ہے —"

اور دادی کو یوں گھسیٹ کر پلنگ پر سے نیچے پھینکا جاتا، جیسے میلے غلاف کو سرھانے سے اتار کر دھلائی میں پھینکتے ہیں۔ اسے زمین پر ڈالتے ہی منی سو ہی رسوئی کی طرف لپک جاتی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد آٹے کا دیا، دیے میں گھی اور گھی میں رچی بسی روئی کی بتی اور ہاتھ میں ماچس لیے آتی۔ گھبراہٹ اور ہوا میں جلدی جلدی دو چار تیلیاں پھونکتی ہوئی دیا جلاتی۔ دادی کو روشنی دکھاتی تا کہ بھنور گپھا میں بھی جائے تو ٹھوکر نہ کھائے — ہاتھ پر دیا رکھنے کے بعد منی ڈری سہمی ہوئی ایک طرف کھڑی ہو کر بھابی کی آواز میں آواز ملاتے ہوئے ہری اوم، ہری اوم کا جاپ کرنے لگتی اور پھر گائیتری کا سہارا لیتی — اوم بھور بھوا سواہ —

جب شیلا بھابی کو یقین ہو جاتا بڑھیا کے سواس نکل چکے ہیں، تو وہ زبردستی کے آنسو بہانے لگتی۔ ہاں منی کے آنسو سچے موتی ہوتے۔ دادی کے سوا اس کا سہارا تھا کون؟ ماں گئی اب دادی بھی گئی تو اس کی پرتیت کون کرے گا؟ اس کے اس جھوٹ کی گواہی کون دے گا جو ہر عورت، ہر کمزور مرد کو بولنا ہی پڑتا ہے۔ پھر اس کے اٹھتے تریا چرتر پر کون پردے ڈالے گا؟ — شادی تو ہوگی نہیں۔ کون لڑکا دیکھنے کے لیے گلی محلے کے بر آتے جاتے کے پیچھے پڑے گا؟ پھر اتنا لمبا لڑکا ملے گا بھی کہاں سے؟ چھوٹے قد کا کوئی بیاہے گا نہیں۔ بیاہے گا تو نبھائے گا نہیں۔ مگر دادی رہے گی بھی تو کب تک؟

اس سنسار کے بھوساگر کی تو کوئی تھاہ ہی نہیں کوئی دوسرا کنارہ ہی نہیں کون انگلی پکڑے گا؟ کون پار کرائے گا؟

دیو بھیا ہیں تو اپنی ہی موج، اپنی ہی بہار میں رہتے ہیں۔ سنتے ہیں یہاں سے دو تین بازار پرے کرم روگ والے اسپتال میں کوئی نرس ہے،

جس کے ساتھ رات جاگتے ہیں پہلے تو گھر آتے ہی نہیں آتے بھی ہیں تو منہ سے شیر سے بھبھاکے چھوٹ رہے ہیں کچھ شراب کے کچھ ترس کے، یوں بھیا کو نشہ کم ہوتا ہے پر یہ ثابت کرنے میں کہ انھوں نے نشہ کیا ہی نہیں۔ پکڑے جاتے ہیں۔ ہاں، بن پیئے بھلا کون ہے جو یوں دھیرے دھیرے ٹِکا ٹِکا کر پَیر زمین پر رکھتا ہے؟ آدمی، آدمی ہوتا ہے۔ کوئی مور تو نہیں۔ پھر زیادہ ہنستے ہیں، نہ خفا ہوتے ہیں۔ آخر بھابی سے جنگ ہوتی ہے۔ وہ اسے نل کے چوبچے میں پٹخ دیتے ہیں وہ جھوٹے برتنوں میں سے کانسی کا طباق اٹھا کر ان کے سر پر دے مارتی ہے۔ وہ سوال میں مارتے ہیں، یہ جواب میں دانتوں سے کاٹتی، ناخنوں سے نوچتی ہے۔ جانے یہ عورت مرد کا ناتہ ہی مار پیٹ کا ہے ——

پھر برتن گلی میں پھینکے جاتے ہیں۔ جو برتن نہیں رہتے۔ ایک طرح کا نیوتا بن جاتے ہیں۔ کیا بڑے اور کیا چھوٹے، گلی کے سب اس گھر میں آدھمکتے ہیں۔ بڑی بڑی نصیحتیں، بڑے بڑے بھاشن دیتے ہیں۔ لڑائی کیا چکاتے ہیں، اور جھگڑا بڑھاتے ہیں بھلا لڑائی چکانے میں کوئی اپنی آستینیں بھی چڑھاتا ہے؟ اندر سے وہ کتنے خوش ہوتے ہیں، یہ آپ بھی نہیں جانتے۔ پھر کپڑے پھاڑے جاتے ہیں۔ پہلے تو بھابی بے پردہ ہو جانے کے ڈر سے ہار مانتی ہوئی اندر بھاگ جاتی تھی۔ پر ایک دن ایسا آیا کہ وہ سب کے سامنے کھڑی تھی — ننگی! اس پر دونوں ہاتھ کولھوں پر رکھے ہوئے مجسٹریٹ کی طرح — —

ہے رام! ایک پہراوا بھگوان دیتا ہے، دوسرا انسان۔ انسانوں میں رہنا ہے تو ان کا پہراوا پہننا ہی پڑے گا اور بھابی —— انسان میں بھگوان کا پہراوا پہنے کھڑی تھی: —— پڑوس میں جینیو کے دو خاندان ہیں —— شویتامبر جین اور ڈگامبر۔ اس دن شویتامبروں کی دونوں بہوئیں آئی تھیں اور شرم سے پانی پانی ہوتے ہوئے بار بار اپنے منہ دھوتی کے پلو سے ڈھک

رہی تھیں۔ ان تک بات رہتی تو کوئی بات نہ تھی۔ ڈگامبروں کے سوکھم منی بھی وہیں تھے جو بھابی کے اس رعب داب کو دیکھ کر بھاگے۔ لوگ تو سر پر پانو رکھ کر بھاگتے ہیں نا؟ —— سوکھم منی پانو پر سر رکھ کر بھاگے۔ دروازے کی دہلیز کے ساتھ ٹکرائے پھر لوٹ کے آئے —— پھر گئے سو گئے۔ کیڑوں مکوڑوں سے راستہ صاف کرنے والا ان کا بہارو بھی وہیں رہ گیا۔ ناک کا کپڑا بھی گر گیا۔ نہ معلوم کتنے جیو جنتو ان کے پانو تلے آکر ہنسا ہو گئے ہوں گے اور کتنے ناک کے راستے اندر چلے گئے ہوں گے؟ بھابی کو کتنا پاپ لگا ہوگا۔ جب سارے جھگڑے بھول کر دیو بھیا اس پر دری پھینکتے، گھسیٹتے ہوئے اندر لے گئے ——

یہی بھابی پہلے بات بات پر مائیکے کی دھمکی دیا کرتی تھی۔ جھٹ سے لہنگا سنبھالتی، اِکّا منگواتی اور چل دیتی۔ پر انت میں وہ سمجھ گئی۔ اب اِکّا نہیں دھکا بھی ملے تو وہ نہیں جاتی۔ کیوں جائے؟ گھر عورت کا ہوتا ہے۔ مرد مسافر اس بات کو کیا جانیں؟ اس کا باہر ہوتا ہے اس لیے وہی جائے ——

دوسری طرف باپو ہیں۔ جب پولیس میں ڈپٹی تھے تو کیا کھڑکا ڈر کا تھا ان کا! مجال ہے جو گھر میں دیر سے بتی جلے، کھانے میں نمک زیادہ پڑے۔ ایسے میں بھابی سُدرشن چکر کی طرح گھومتی، تُنتُناتی ہوئی آنگن میں ہوتی تھی کٹوریوں سمیت، اور ایسی گالیاں سننے میں آتیں جو چوک میں بھی نہ بکی جاتیں۔ اُدھر ماں گئی، اِدھر باپو کو نہ جانے کیا ہوا؟ ایسی اُداسی پکڑی جس کی کوئی تھاہ نہیں۔ جیسے کوئی بان پرستھ لے لیا۔ عورت کا راج اپنے مرد سے ہوتا ہے تو مرد کا بھی عورت ہی سے ہوتا ہے۔ اب وہ صبح سویرے نکل جاتے ہیں اور سیم والی نہر کے پاس اکھاڑے کے بغل میں ایک بھگل یا پاکھنڈی مہاتما سے تلسی جی کی چوپائیاں سنا کرتے ہیں۔ یا وہ مہاتما ٹھیک سے ارتھ نہیں کر پاتے یا باپو اپنے مطلب کا مطلب نکال لیتے ہیں اور پھر اُداس ہو جاتے ہیں۔ رات گھر آتے ہیں تو چوروں کی طرح۔ پیر سنبھال سنبھال کر زمین پر رکھتے ہوئے گھر بھر میں

ڈر کے مارے کوئی ان سے کچھ نہیں کہتا۔ اکثر تو کوئی کھانا بھی نہیں پوچھتا۔ جب بولا کرجا کرتے تھے تو کوئی جواب بھی دیتا تھا۔ اب وہ چپ ہیں تو سارا سنسار چپ ہے۔ سبھی اس بات سے ڈرتے ہیں کہ یہاں پر سمجھ لیا تو سنیاس بھی لے سکتے ہیں۔ تب پنشن گھر میں نہ آئے تو گزارا کیسے ہوگا؟ —— بھیا کی مائکلوں کی دکان تو چلتی نہیں۔ نرس کے لیے جو بیچ میں گول مال کیا تھا۔ اس کے کارن ایک دن بیٹھے بٹھائے ان کی ایجنسی بند ہو گئی!

بھیا یوں نہیں آتے، باپو گھر میں نہیں رہتے۔ اب یہاں عورتوں کا راج ہے۔ ہم عورتیں سبھی راج کی اچھا کیا کرتی ہیں، پر جب مل جاتا ہے تو سر پیٹ لیتی ہیں۔ نا بابا! ایسا راج کسی کو نہ ملے۔ وہ گھر ہی کیا جس میں مرد نہ آئے، حکم نہ چلائے، ہر روز کوئی نیا جھگڑا فساد نہ مچائے۔ عورت بیرن آخر تو مرد ہی کے نام سے جانی جاتی ہے۔ مرد کیا ہے؟ —— دادی سے پوچھو، بھابی سے پوچھو۔ سامنے والے شاہد میاں کی آپا سے پوچھو، مجھ سے —— پر میرا تو وہ آئے گا ہی نہیں۔ آئے گا بھی تو چلا جائے گا۔ تیاگی جات کی ہم عورتوں کی قسمت ہی ایسی ہے ——

جبھی شیلا بھابی کو دادی ماں کا ماتھا گرم دکھنے لگتا۔

"یہ تو" وہ ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہتی —— "جی رہی ہے۔"

منی سو ہی جھٹپٹا کے لمبے لمبے ہاتھ پیر مارتی ہوئی سوچ بچار کے ہچکولوں سے نکلتی اور لپک کر دادی ماں کے ماتھے پر ہاتھ رکھ دیتی جو اسے اپنی جوانی اور اس کی گرمی کے کارن ویسے ہی برف کا برف معلوم ہوتا اور پھر تھوڑا گرم۔ جبھی دادی کا کانپتا ہوا ہاتھ زندگی کی تائید میں اٹھ جاتا۔ سو ہی مری مری جی اٹھتی، شیلا جیتے جی مر جاتی۔

"دادی کو اوپر ڈالو، شیلا بھابی" منی چلاتی۔

بھابی ماتھے پر سات ٹھیکرے پھوڑتی ہوئی کہتی "تم ڈالو تو ڈالو ——

مجھ سے نہیں اٹھائی جاتی یہ گیلی لکڑی۔"

منی اپنے لمبے چوڑے کلاوے میں دادی کو اٹھاتی اور پھر سے پلنگ پر لٹا دیتی۔ کسی اُس دیر میں رقمن بولنے یوگی ہو جاتی۔ ہوش میں آتے ہوئے جس پہلے شبد کا اچار سنا کرتی وہ "منو" ہوتا جس کے جواب میں منی بھی ہمیشہ بڑھیا کو پچکارتے ہوئے بول اٹھتی —— "وہ دیا!" جبھی ایسا معلوم ہونے لگتا جیسے دادی منی ہے اور منی دادی۔ دراصل منی اور دادی ایک دوسری کی طرف چلتی ہیں تو بیچ میں کہیں ایسے موڑ، ایسے نکڑ پر مل جاتی ہیں۔ جہاں ماں کھڑی ہوتی ہے، جو کبھی اپنے آپ بوڑھی ہو جاتی ہے اور کبھی بچی۔ بچی ہو یا بوڑھی، عورت سے ماں اپنے کا الزام تو مل ہی نہیں سکتا۔ وہ اس کے پل پل موت میں جیتی، اسی میں مر جاتی ہے۔ اور مرد وے یہی سمجھتے ہیں —— اس کی آئی تھی اس لیے چلی گئی ——

"تو نے مجھے پکارا نا" دادی منو سے پوچھتی۔

"نہیں تو" منی جواب دیتی "میں نے تجھے نہیں پکارا!"

دادی سرزنش کے انداز میں انگلی اٹھاتے ہوئے کہتی —— "دیکھ میں نے تیرے باپ کو جنا ہے" اور پھر —— "میں سب جانتی ہوں تیرے چلتر۔ عورت میں چار سو چار چلتر ہوتے ہیں، پر تجھ میں چار سو پانچ ہیں!"

لیکن پیاری سی پھٹکار کے بعد منی تھوڑا اور بھی دادی کے پاس سرک آتی۔

"تیری سَوں دادی" اور پھر ایکا ایکی منی کو یاد آجاتا —— ہاں، ہاں بے بس ہو کر اس نے دادی کو آواز دی تھی۔ شاید —— یہی آواز تھی جو کھنڈروں، برہمنڈوں کو چیرتی ہوئی دادی تک جا پہنچی اور اسے پھر اس سنسار میں لے آئی۔ پر منی جانتی تھی۔ اوپر جاتی ہوئی دادی بھی تو مڑ مڑ کر نیچے دیکھتی ہو گی۔ وہ جانا نہیں چاہتی تھی۔ ابھی کچھ کام تھے جو ادھورے رہ گئے تھے، جنھیں وہ نپٹانا چاہتی تھی۔

منی آخر مان جاتی —— "ہاں دادی! میں نے پکارا تھا —— میری اور سنتا کون ہے؟"

گلی محلّے کی کچھ عورتیں مزاج پُرسی کے لیے آجاتیں۔ شیلا بھابی کچھ دیر کھڑی رہتی اور پھر دادی پوتی کے بیچ یہ انوکھی عشق بازی دیکھ کر، ناک بھوں چڑھاتی ہوئی اندر رسوئی بھنڈارے کی طرف چل دیتی۔

دادی رُقمن پھر اٹھنا چاہتی۔ بڑھاپے میں اور تو سب چیزیں انسان اٹھا لیتا ہے، پر اپنے آپ کو اٹھانا بڑا مشکل ہے۔ اصل میں بوجھ شریر کا نہیں ہوتا، من کا ہوتا ہے ـــــ دادی جو کوئی ہی دیر پہلے مر رہی تھی عورتوں کی مدد لینے سے انکار کر دیتی۔ منّی کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو بھی جھٹک دیتی اور اٹھ کر بیٹھ جاتی اور منّی کی طرف دیکھتے ہوئے کہتی ـــــــــ

"یہی میری دشمن ہے، گلّو کی ماں۔"

گلّو کی ماں قریب ہوتے ہوئے پوچھتی "کیوں ماں ـــ منّی کیسے دشمن ہو گئی؟"

"میں اچھی بھلی جا رہی تھی" دادی رُقمن کہتی "اس سیڑنی نے نہ جانے دیا۔"

پیار سے دی ہوئی اس گالی سے منّی کے سارے چھوٹے موٹے ڈر، سب دُکھ ولدّر دور ہو جاتے۔ ایسے میں دادی دشمن کی بجائے منّی کو سجن کہ دیتی تو کیا ہوتا؟ پھر دادی کو وہ سارے درشن یاد آجاتے جو اس نے تھوڑی دیر کی موت میں دیکھے تھے ـــــــ

"کتنی سندر بانکا تھی، جمنا!" وہ سامنے دیکھتے ہوئے کہتی۔ جیسے اب پھر بانکا دکھائی دے رہی ہو ـــــــ "چہوں اور ہری بھری بیلیں اور ان بیلوں میں پھول ان پھولوں میں پرکاش، جس میں بڑے بڑے رشی منی بیٹھے اکھنڈ کیرتن کر رہے تھے ـــــ"

گلّو کی ماں، جمنا منّی سب شردھا سے سننے لگتیں۔ دادی کبھی آہستہ، کبھی تیز اندر کا سب گیان لٹانے لگتی ـــــ "کروڑوں سورجوں کا اُجیالا ـــــ پھر گرمی نام کو نہیں۔ ایسی ٹھنڈک جو دگدھ سے دگدھ من کو ہرا کر دے۔ ایسا سکھ پہنچانے جو کہنے میں نہ آئے ـ ـــ بس ایک ہی آگ تھی جو بار بار میری اور لپک رہی تھی۔"

"آگ؟ ـــ آگ کیسی ماں؟"

دادی منّی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی "اس نپوتی کی آواج ـــــ"

جمنا بول اٹھتی "پر آواز تو شبد ہوتی ہے، دادی ـــــ"

"مورکھ ہونا" دادی جھلا کر جمنا سے کہتی "اتنا بھی نہیں معلوم؟ انتریں شبد اور سب پرکاش میں کوئی بھید نہیں ہوتا!"

"دھنیہ ہو" جمنا کہتی اور دونوں ہاتھ جوڑ کر نمسکار کر دیتی۔

"دھنیہ ہو دادی" باقی کی بھی پکار اٹھتیں۔

اور پھر دادی برابر بولتی جاتی جیسے کوئی چابی لگ گئی یا جیسے کوئی دیر پہلے کی چُپ کا گھاٹا پورا کر رہی ہو۔ پھر اس عمر میں جب کوئی کسی کی نہیں سنتا۔ جمنا اور گلّو کی ماں کے سے شروتا مل جائیں تو اور کیا چاہیے؟ ان سب کو زور زور سے سر ہلاتے دیکھ کر منی ڈر جاتی۔ پہلے بھائی اور بھابی کے جھگڑے کے کارن گھر بھر لوگوں کی آدھار کا کیندر بنا ہوا تھا، اب دادی کے دیوی بن جانے کی وجہ سے۔ جب اور بھی عورتیں آنے لگتیں تو چار سو پانچ چلتّر والی منّی دادی کی بات کاٹ دیتی

"اچھا دادی ـــــــ وہاں سورگ میں تجھے دادا نہ ملے؟"

ایکا ایکی دادی کے ڈال پر سے گرے ہوئے سوکھے پتّے کے رگوں اور ریشوں میں ہریالی دوڑ جاتی۔ اور نو بیاہتا کی طرح وہ شرماتے ہوئے کہتی ـــــ "ملے کیوں نہیں ری منّی؟"

یک دم پانسا پلٹ جاتا۔ وہی عورتیں ایک دوسرے کے کندھے میں ٹہوکے دینے لگتیں اور اشارے اشارے میں کہتیں "سنو، سنو ـــــ"

"تب وہ کیا بولے؟" منّی پوچھتی۔

"پیٹھے کی لیتی مانگ رہے تھے۔"

منّی جمنا اور گلّو کی ماں اور دوسری عورتوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہتی "دادا جی کو بہت پسند تھی پیٹروں کی لیتی" اور پھر دادی سے بولتی "کیا وہاں سورگ میں پیٹرے بھی نہیں دیا؟"

"پیڑے بھی نہیں، کھٹی کڑھی بھی نہیں۔"

کھٹی کڑھی دادی کو بہت پسند تھی!

"ایسے سورگ میں جانے کا کیا فائدہ؟" منی کہتی۔

"وہی تو" دادی اپنے بھولپنے میں جواب دیتی "کل تم دیول کے پجاری جی کو نیوتا دینا اور ساتھ پنڈت رلیا رام کو بھی۔ خوب کھانا کھانا اور پیٹ بھر کے پیڑوں کی لسی پلانا ——"

عورتیں اپنی ہنسی دباتیں۔ منی کہتی "ہاں دادی —— یہ کوئی سورگ تھوڑے ہے جہاں پیڑے بھی نہ ہوں ——"

اور دادی سامنے دیکھتے ہوئے بولتی جاتی "کیسے سامنے آکر کھڑے ہو گئے —— مندر کی ہیروں جواہروں سے جڑت مڑت چو کھٹ میں۔ ویسے ہی شیر جوان، یہ چوڑی چکلی چھاتی، لَٹ لَٹ کرتا ہوا چہرہ۔ اس پر یہ بڑے بڑے مونچھوں کے کالے گچھے ——"

"کالے گچھے؟" منی کہتی "ابھی تک ان کی مونچھیں کالی ہیں؟"

دادی پوپلے منہ کے ساتھ تھوڑا ہنس دیتی —— "پاگل ہے نا —— کال بھگوان کی مار وہاں تک نہیں پہنچتی منو۔ وہاں جوان بوڑھے نہیں ہوتے۔ میں نے دیکھا ان کے پاس ایک سندر سجیل لڑکی تھی۔ کیا روپ تھا اس پر ——"

"کیا بات کر رہی ہو دیا؟" منی بول اٹھتی "وہاں بھی دادا ——؟"

"ہاں —— یہ بھی تو پوچھ وہ تھی کون؟"

"ک —— کون"

"وہ میں تھی —— جب بیاہی آئی تھی۔"

اس پر سب ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہونے لگتیں۔ ان کی ہنسی نہ سنائی دیتی تو دادی کو۔ اور وہ کہے جاتی میرا ہاتھ پکڑ کر بولے —— "تم آجاؤ —— رمن —— اب نہیں رہا جاتا ——"

یہ عورتوں کے صبر کی حد تھی۔

دادی بولتی —— "میں نے ہاتھ چھڑا لیا۔ کہا، میں ابھی نہیں آسکتی، جگن کے پتا بلکہ کوئی دیر اور میری راہ دیکھو، مجھے دنیا میں بڑے کام ہیں ——" اور دادی کے چہرے پر کی نہروں اور جھیلوں میں جھر جھر بہتے پانی کو دیکھ کر عورتیں ایک دم چپ ہو جاتیں۔ دادی ایک ہاتھ تپائی پر پڑی ہوئی گیتا پہ رکھ دیتی اور دوسرے سے دھوتی کا پلو تھامتی آنکھیں پونچھتی ہوئی، ایک جیوتی ہیں نگاہ منی پر ڈالتی اور بلبلا اٹھتی۔

"ہائے ری سوہی —— تو کیسے سوئے گی؟"

اسی ایک ہی بات میں باقی کی عورتوں کا اندر بھی پانی ہو کر آنکھوں میں چلا آتا۔ آخر وہ اٹھتیں، ہاتھ جوڑ کر نمسکار کرتیں "دھنیہ ہو دھنیہ ہو ماں" کہتی ہوئی ایک ایک کر کے چل دیتیں۔

جگن ناتھ تیاگی اور ان کے بیٹے دیویندر تیاگی کے مکان ڈپٹی بھون میں کالے بھی آئے اور گورے بھی آئے۔ پر منی سوہی کے رنگ کا ایک نہ آیا۔ اس کے قد کاٹھ کا کوئی نہ پہنچا۔

منی سوہی خالی خولی لمبی ہی نہ تھی، بدن بھی بھرا ہوا تھا اور اس کا رنگ اپنے ہی لہو کی آگ میں جلتے رہنے سے تانبے کا سا ہو گیا تھا۔ کبھی تو وہ کونارک کے مندر کی، تانترک شلپیوں کے ہاتھ سے بنی ہوئی، بڑی سی یکشی معلوم ہونے لگتی اور کبھی ایک بڑی سی دیگ، بیاہ شادیوں میں جس میں حلوہ یا اُڑد پکائے جاتے ہیں اور جس کے نیچے برابر کی آنچ کے لیے منوں ہی لکڑیاں ڈالنی پڑتی ہیں اور پھر کیا حلوہ بنتا ہے، کیا اُڑد ہوتے ہیں —— گلی بازار میں نکلتی سوہی تو اپنے آپ سے بھی ایک فٹ آگے چلتی جیسے کہ رہی ہو —— ہٹ جاؤ، میں آرہی ہوں۔ لوگ راستہ دے دیتے، پچھاڑیں کھا کھا کر پیچھے گرتے جیسے ڈپٹی جگن ناتھ کی نہیں، کسی راجا کی بیٹی ہو!

تیاگی کل کی سب بیٹیاں ایسی ہی ہوئیں چھے چھے فٹ کی اور بیٹے چھوٹے اور بے بضاعت سے۔ سب بیٹیوں کی شادی میں یہی مصیبت ہوئی یہی خلجگن۔

اور پر تین چار پشت میں کوئی ایسی ہوا آئی کہ پورے کُل کی تباہی لے آئی۔ ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ رُکنے کا نام ہی نہ لیا۔ دادا پہلے آدمی تھے۔ جنھوں نے خاندان کو اس بربادی سے بچانے کی کوشش کی۔ دادی چھوٹے قد کی لائے، مطلب، اپنی بیوی۔ منّی کی دادی خود منّی کی ماں بیچ کے قد کی تھی۔ دیویندر کی بیوی شیلا بھی ناٹی بلکہ بونی۔ دادا کے حساب سے اس پشت میں اولاد کے ٹھیک ہونے کی امید تھی۔ پر شیلا نے موتی تو دبوچ ہی لیے لعل بھی نہ اُگلا۔ سب ڈرتے بھی تھے ناکہ بیٹیاں چھوٹے قد کی ہوئیں تو بیٹوں کا کیا ہوگا! پر اس وقت تو منّی کا سوال تھا جو اب پانچ فٹ نو انچ کی ہو گئی تھی۔

کئی گرمیاں آئیں اور گئیں۔ کتنی سردیوں نے شل کیا۔ بہاریں گئیں اور پت جھڑیں بھی۔ سامنے شاہد بھیّا کے مکان کے پاس جو کچنار کا پیڑ لگا تھا اس نے کئی ہرے اودے کوٹ پہنے اور اُتار بھی دیے۔ ڈپٹی بھون کے باہر بڑھائچ کے نیچے جو شہتیری ڈالی تھی اس میں جھڑیاں بھی چلی آئیں۔ برسات آٹھ آٹھ، سولہ سولہ، بتیس بتیس آنسو روئی اور نئے مکانوں پر ہری اور کالی کائی چھوڑ کر جیسے اپنی سسرال چلی گئی۔ پر منّی وہیں تھی — رنیلی محلّے کی رونق، شام گلی کا مذاق — اب کے سال جو گرمی پڑی تو حد ہی ہو گئی۔ برسوں میں ایسا اُمس کبھی نہ ہوا تھا۔ جمنا کی دونوں گایوں کا دودھ تھنوں میں سوکھ گیا۔ پہاڑوں پر چلے جانے کے کارن، الگو کی ماں کے گھر اُلّو بولنے لگے۔ دن کی روشنی میں اڑنے لگے — دھرتی سے غبار اٹھتے اور اپنے دماغ، آسمان پر چھا جاتے۔ بادل آتے بھی تو بے برسے بنا ہی نکل جاتے جیسے کسی بگیا کی سیر کرنے آئے ہوں۔ ایک دھول سی تھی۔ جو ہر وقت چھائی اور عقل کو ماؤف کیے رہتی۔ اس مٹی اور گرد سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دھرتی آسمان کی طرف اچھل رہی ہے اور آسمان دھرتی کی طرف لپک لپک جاتا ہے۔ اس حبس اور حبس میں ایسی لپک جھپک سے یہ پتا چلتا جیسے پوری کائنات کو اختناق ہو رہا ہے۔

اور تو اور آپا فردوس، شاہد کی بہن جو دو سال سے بھائی کے گھر بیٹھی تھی، چلی گئی — دولھا بھائی نے پیر پکڑے، معافیاں مانگیں، توبہ میں کان لال کیے اور

آپا کو لے گئے۔ شاہد کوئی ایسے کھوڑے ہی بھیجنے والے تھے۔ بیچ میں اس قاضی کو بھی لے آئے جس نے نکاح پڑھایا تھا اور حق مہر باندھا تھا۔ آپا فردوس کے رخصت ہوتے وقت منّی اتنا روئی کہ تالاب بھر گئے۔ آپا نے بہت پیار کیا، بہت تسلّی دی اور کہا — "میں پھر آؤں گی منّو — تیری شادی پر تو انشاءاللہ ضرور آؤں گی۔" منّی سوہی نے فریادی نظروں سے آپا فردوس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا — "تب تو آلی آپا!" ڈگامبروں کی بہو ترمبکا بائی نے کہا — "سہیلی کے جانے پہ تھوڑی کوئی اتنا روتا ہے؟" جب منّی نے اپنے آنسوؤں کو خون بنایا اور پی گئی — پردادی بھی جو خون کو آنسو بناتی رہتی۔ شیلا اب اس سے تنگ آ چکی تھی۔ اس لیے بھی کہ دادی اب پلنگ ہی پر چادر گیلی کر دیتی۔ دیویندر کتنا بھی شرابی کبابی تھا مگر دادی سے پیار کرتا تھا۔ پیار مردوں کو سستا پڑتا ہے، اس لیے کہ مرنا نہیں پڑتا۔ بس خالی خولی ہمدردی جتائی، دنیا کی نظروں میں، اپنی نگاہوں میں اچھے بنے اور چل دیے۔ دادی کے پلیت کیے ہوئے کپڑے منّی دھوتی تھی۔ اس پر بھی شیلا ناک پہ دوپٹا رکھے ہوئے اندر آتی، باہر جاتی۔ دیویندر کو یہ نظارہ بہت نک چڑھا معلوم ہوتا۔ ایک دن وہ بولا۔

"تم چاہتی ہو دادی مر جائے؟"

"ہاں" شیلا بے جھجک بولی۔

"اس کا ایک ہی طریقہ ہے۔"

"کیا طریقہ؟"

"منّی کا بیاہ کر دو۔"

شیلا سٹپٹا گئی: "میں تو کہتی ہوں، دادی بھی جائے اور اس کی پوتی بھی۔ مجھ سے اب کسی کے مرنے نہیں مرے جاتے۔" اور پھر بولی "کل بہن تمھاری اونچی ایڑی کا جوتا دیکھ رہی تھی — میں تو کہتی ہوں پہنے، سر بادلوں میں چھپائے کہیں اوپر کی اوپر چلی جائے۔"

دیویندر چپ رہا۔

"اور نہیں تو کیا" شیلا پھر بولی "دونوں کے لیے جم راج کیا مجھے ڈھونڈنے ہیں؟"

جم راج ڈھونڈنے کی ذمّے داری چونکہ دیویندر کی تھی، اس لیے وہ کچھ نہ بول سکا۔

وہ طبیعت ہی سے کام چور تھا۔ ہر قسم کی ذمّے داری سے گھبراتا تھا۔ جو کام اپنے آپ ہو جائے سو ہو جائے۔ اپنے پتا جگن ناتھ کی طرح وہ بھی اپنی اس کاہلی اور بے عملی کے سلسلے میں شاستروں اور پرانوں کی مدد لیتا ــــ "تمھارا سب جتن بیکار ہے۔ بھگوان نے کہا ہے۔ تم پورے طور پر اپنے آپ کو میرے حوالے کر دو۔ تمھارے سب کارج سدھ ہو جائیں گے"

کام ہو گا یا نہیں ہو گا۔ اس لیے پچاس فی صدی کے تناسب سے ایسے لوگوں کے کارج سدھ ہو بھی جاتے ہیں۔

دیویندر برآمدے سے اٹھا، صحن میں آیا۔ ایک نظر آسمان کی طرف دیکھا جہاں بادل گھر آئے تھے۔ کیوں نہ آتے؟ یہ موسموں کا چکّر بھی ایک سائکل ہوتا ہے سردی کے بعد گرمی، گرمی کے بعد برسات۔ اوپر بھی کبھی کسی گول مال سے ایجنسی بند ہو جاتی ہے۔ ادھر برسات کی پہلی بوند گری، ادھر گوتم، دیویندر کے بچپن کا دوست کلکتے سے چلا آیا، جہاں اس کے پاس بند سائکلوں کی ایجنسی تھی اور اب یہاں دینا پور میں سب ایجنسی قائم کرنے آیا تھا۔

گوتم قد کے اعتبار سے مشکل سے پانچ فٹ دو انچ کا ہو گا۔ لیکن تن و توش کے اعتبار سے اچھا تھا۔ آکا باکا سا چہرہ۔ لال رنگ معلوم ہوتا تھا گالوں میں دو ٹماٹر دبا کے رکھے ہیں۔ بات بات پر اچھلتا جیسے نہ جانتا ہو۔ اس صحت کا کیا کرنا ہے؟ دیویندر نے گوتم کو چائے پر گھر بلایا۔

شیلا کے کان گوتم کی باتیں سنتے سنتے پک گئے تھے۔ شیلا نے اسے دیکھا نہ تھا۔ شاید اس سے پہلے گوتم اس گھر میں کبھی آیا بھی نہ تھا۔ اس لیے بھابی تو سپنے میں بھی نہ دیکھی تھی۔ شیلا اس سے یوں تپاک سے ملی جیسے برسوں سے جانتی ہو۔ دیویندر نے شیلا کو چائے لانے کے لیے کہا اور پھر اٹھ کر اس کے کان میں کھسر پھسر کرتے ہوئے اندر بھیج دیا۔

بس یہی غلطی ہوئی۔ شیلا اندر گئی تو چائے بناتے ہوئے منّی سے کہہ دیا "منّی اندر

بیٹھک میں نہ جائیو"

"کیوں؟" منّی نے پوچھا "وہ آگئے، بھیّا کے ــــ؟"

"ہاں"

اور پھر شیلا خود کیتلی و تیلی نکالنے لگی۔

بھابی منع نہ کرتی تو شاید منّی کو کچھ نہ ہوتا۔ لیکن اب ــــ اس کے تن بدن میں کوئی آگ سی لپک آئی۔ وہ اب اس حالت کو پہنچ گئی تھی جس میں لڑکیاں آنکھیں بند کر کے صرف آوازیں سنا کرتی ہیں اور پھر بے دم ہو کر گر جاتی ہیں۔ منّی سو ہی کے لیے شاید آواز کافی نہ تھی۔ بھابی کے اندر جاتے ہی وہ برآمدے کی طرف لپکی اور سیڑھیوں پر سے ہوتی ہوئی نیم چھتّے پر جا پہنچی۔ جہاں ایک روشندان بیٹھک کے اندر کھلتا تھا ــــ

شیلا ٹرے میں چائے اور کچھ دال موٹ وغیرہ لیے بیٹھک میں آئی۔ دیویندر نے اچھلتے ہوئے کہا "ٹھہرو ــــ میں کچھ پیڑے لے آؤں"

"ارے نہیں بھائی ــــ" گوتم نے روکا۔

"ایک منٹ میں آتا ہوں" دیویندر نے کہا "میں جانتا ہوں تم پیڑے بہت پسند کرتے ہو" اور اس سے پہلے کہ دیویندر کو کوئی روکے، وہ نکل گیا تھا۔

منّی روشندان سے دیکھ رہی تھی۔ گوتم آگے بڑھ بڑھ کر بھابی شیلا سے دیور کا رشتہ جگا رہا تھا۔ دیور بھابی کا رشتہ جو ایک طرح سے ہر دیور کے لیے شادی کی ریہرسل ہوتا ہے ــــ جس میں ادب کی حد سے پرے اور ننگے پن کی سیما سے ورے کی باتیں ہوتی ہیں ــــ بھابی چیز بھی ایسی ہوتی ہے کہ اس کی ہر نس اس کا ہر پور چھیڑنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ گوتم شیلا سے کہہ رہا تھا "کوئی زور لگاؤ، بھابی ــــ ایک بیٹا جن دو، نہیں تو یہ بھیّا میرا دوسری شادی کرے گا"

دیویندر ابھی آئے نہیں تھے۔ بھابی نے دال موٹ والی پلیٹ سامنے رکھ کر چائے انڈیلی اور کہا ــــ "ہاں دیور جی ــــ ــــ یہ کہہ بھی رہے تھے"

"کیا کہہ رہے تھے؟"

"یہی کہ اگلی بیساکھی تک کچھ نہ ہوا تو ـــــــ دوسرا بیاہ کر لیں گے" اور شیلا نے جان بوجھ کر منہ پرے کرایا۔ جیسے رونے لگی ہو ـــــــ

گوتم لپک کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا ـــــــ "سچ بھابی؟" ـــــــ اور اس کے ہاتھ لجانے ہی میں آستینیں چڑھانے لگے جبھی اسے ایک کھلی سنائی دی ـــــــ بھابی ہنس رہی تھی!

گوتم سمجھ گیا۔ ایک تسکین کی سانس لیتے ہوئے بولا "وہ بھابی ـــــــ تو نے تو میری جان ہی نکال لی" اور پھر چارپائی پر دھم سے بیٹھ گیا جو صوفے کے طور پر استعمال کی جاتی تھی۔ بے وقوف تو گوتم بن ہی گیا تھا لیکن اس ہزیمت سے بچنے کے لیے برابر ہاتھ پیر مارتا رہا۔ ظاہر ہے گھر آنے سے پہلے دونوں دوستوں میں کچھ تو راز و نیاز کی باتیں ہوئی ہوں گی۔ چائے کی پیالی تھامے ہوئے وہ شیلا کے قریب ہو گیا اور کان کے پاس منہ کرتے ہوئے بولا "مذاق کی بات نہیں بھابی! سنا ہے دیویندر بھیا نے ایک نرس رکھی ہے ـــــــ"

شیلا کے من میں آگ کا ایک بھبھوکا سا اٹھا۔ سارے بدن میں آگ لگ گئی۔ اب وہ نہ مذاق کر سکتی تھی اور نہ سن سکتی تھی۔ اس کے ہم، کو ٹھیس لگی تھی۔ اسی میں اس نے گوتم ہی کا تختہ کر دیا۔ ایک دم ناک پھلاتے ہوئے بولی ـــــــ "ٹھیک ہے ـــــــ مرد ہے تو رکھتا ہے نا اور کیا تم سا چوہا عورت رکھے گا؟"

دیویندر پیڑے لے کر آیا تو گوتم رومال سے اپنے ماتھے پر سے پسینا پونچھ رہا تھا!

منی کی تلاش میں دادی رسوئی میں گھستی ہوئی نیم چھتے پر آئی تو دیکھا ـــــــ منی بے ہوش پڑی ہے۔ دادی نے سر پیٹتے ہوئے آوازیں دیں، شیلا آئی، پھر گاؤں کی ماں اور سب نے مل کر ایک چمچے سے منی کی دندن کھولی۔ ہاتھ اور پیر مل کر سیدھے کیے۔ بڑا ڈراما ہوتا مگر گوتم جب تک رخصت ہو چکا تھا ـــــــ

کچی پکی جگہ، سایہ آسیب کی باتیں ہونے لگیں لیکن صحیح سے سب جانتی تھیں۔ یہ سب کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟ منی ہوش میں آئی تو شرمندہ تھی، اپنے آپ سے شرمندہ ـــــــ

"نہ جانے مجھے کیا ہو جاتا ہے؟" وہ بولی اور دادی کی گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

شام تک منی ٹھیک ہو چکی تھی اور گھر کا کام کاج کر رہی تھی ـــــــ آج شیلا نے سبزی اور دال دونوں میں غلطی سے دو بار نمک ڈال دیا تھا۔ اب وہ اور منی دونوں ڈر رہی تھیں۔ باپو آئے تو کیا ہوگا؟ وہ تو عام نمک سے بھی کم پسند کرتے ہیں۔ کہیں پرانے جلال پہ آئے تو تھالی کٹوری سب باہر پٹخ دیں گے۔

رات باپو آئے ہمت کر کے منی نے کھانا پروسا اور باپو نے کھانا شروع کیا۔ شیلا اور منی دونوں کی آنکھیں باپو کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ پہلا ہی گراس باپو جی کے منہ میں رکا۔ پھر انھوں نے یوں اندر نگل لیا جیسے روٹی نہیں، حلوہ کھا رہے ہوں

شیلا نے معذرت کرتے ہوئے کہا ـــــــ

"آج نمک کچھ زیادہ ہی پڑ گیا ہے، باپو جی"

باپو جی نے ایسے کہا جیسے انھیں کچھ پتا ہی نہیں۔ بولے "ہیں؟ ـــــــ نہیں تو بیٹیا ـــــــ نمک تو ٹھیک ہے، بالکل ٹھیک ہے ـــــــ"

دو چار نوالے اور منہ میں ڈالتے ہوئے بولے ـــــــ "دراصل آج مجھے بھوک ہی نہیں ہے ـــــــ مہاتما جی نے دوپہر بہت سا دے دیا نا"

منی نے اپنی آنکھیں پونچھیں اور دوڑ کر جمنا کے ہاں سے تھوڑی دال لے آئی اور باپو کے سامنے رکھی۔ باپو جب تک تھالی پرے سرکا چکے تھے۔ شیلا اندر بستر ٹھیک کرنے کے لیے چلی گئی تھی منی نے کٹوری تھالی میں رکھ کر اسے قریب کرتے ہوئے کہا ـــــــ

"کھانا پڑے گا، باپو جی"

باپو جی کو بھوک تو لگی تھی۔ چپکے سے نوالہ توڑ کر دال میں بھگوتے اور منہ میں رکھتے ہوئے اندر کی طرف دیکھا اور بولے ـــــــ "بہو دیکھے گی تو ـــــــ" اور پھر اندر سونے والے کمرے کی طرف جہاں بہو گئی تھی، دیکھتے ہوئے کھاتے رہے ـــــــ

دوسرے دن گوتم کو آنا تھا ـــــــ لڑکی دیکھنے!

منی کو تو کوئی امید نہ تھی۔ بھابی نے جو اس کی درگت بنائی تھی۔ اس کے بعد تو

کوئی بھی مرد اس گھر میں نہ گھستا۔ پر اس بات کا نتیجہ الٹا نکلا۔ بھابی کے شبدوں نے گوتم میں کلمرداور بھی تندہی سے جگادیا۔

بیٹھک میں آج باپو تھے، دیویندر بھی اور دادی بھی۔ منّی کو سادہ مگر خوبصورت کپڑے پہنا کر ایک طرف بٹھا رکھا تھا اور اسے کڑی ہدایت تھی کہ اٹھے نہیں، ورنہ سب معاملہ چوپٹ ہو جائے گا۔

گوتم آیا۔ اس کی پگڑی کو بہت کلف لگا تھا۔ شملہ سر پر ایک فٹ اوپر اُٹھا ہوا تھا اور اپنے ناٹے قد کے باوجود لمبا معلوم ہو رہا تھا۔ آتے ہی اس نے منّی کی طرف دیکھا اور سمجھ گیا۔ منّی کی مجبوب نگاہیں زمین پر گڑی ہوئی تھیں اور وہ کانپ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو رہے تھے۔

ایکا ایکی گوتم کچھ اُکھڑی باتیں کرنے لگا۔ پھر اس نے منّی کی طرف دیکھا اور دیویندر سے بولا ——— "بھیا! ——— تم بھی پانی پیو گے؟"

"ارے ارے! پانی کیوں؟" دیویندر نے کہا "کوئی شربت لاؤ شیلا ———"

شیلا کی بجائے خود حکم لینے کی عادی منّی ایکا ایکی اٹھی۔ دادی نے دھپ سے ایک ہاتھ منّی کے سر پر مارا ——— "بیٹھی رہ ——— تو کہاں جا رہی ہے؟"

اور منّی جو آدھی ہی اٹھی تھی۔ بیٹھ گئی۔ لیکن آدھی ہی میں وہ ساری معلوم ہو رہی تھی ——— اسے کچھ یاد آیا، کچھ بھول گیا ———

اس شام محلے بھر کے منہ میٹھے ہونے لگے۔ بدھائیاں ملنے لگیں ——— گوتم نے منّی سوہی کو پسند کر لیا تھا ——— !

سب کو یقین ہو گیا تھا کہ منّی سوہی جا رہی ہے۔ ایک نہیں یقین آ رہا تھا تو دادی رقمن کو ——— میں تو اس دن مانوں گی جس دن سچّی یہ ڈپٹی بھون کی

دہلیز چھوڑے گی۔ اور ڈولی میں بیٹھے ہوئے پوری ایک پائلی چاولوں کی اپنے سر کے اوپر سے پھینکے گی ——— اور پھر جیسے شادی میں ہونے اور نہ ہونے والی باتیں دادی رقمن اپنے سامنے دیکھ رہی تھی ——— "دیکھ بہو، گوتم کا باپ ڈولی پر سے کھوٹے پیسے بھی پھینکے تو انھیں تم یہیں سمجھنا ———" پھر اس بات کا ڈر کہ جس بات سے ڈرو، آخر وہی ہوتی ہے ———

دادی نے دیول میں مورتی کے لیے دستروں کی منت تومانی ہی تھی، بڈھن شاہ کی درگاہ پر حلوے کی دیگ بھی مان آئی۔ ساتھ وہ شاہد کی ماں کو بھی لے گئی تھی جیسے رشوت کے طور طریقوں کو اچھی طرح سے جاننے والا کسی بچاؤ کے لیے کسی واقف کار کو ساتھ لے لیتا ہے تاکہ قانون کہیں الٹا ہی نہ پڑے ———

اب بیاہ کے سلسلے میں چاروں طرف سے منّی کو ہدایتیں ہونے لگیں۔ جو جانتی تھیں وہ بھی اور جو الھڑ تھیں وہ بھی اپنے اپنے طریقے سے مرد کو مطیع کرنے کے طریقے بتانے لگیں اور پھر دادی ——— جس کے مرد کو گئے ہوئے پچاس سال سے اوپر ہونے کو آئے تھے اور جس کے پہلاووں میں مرد اس کی آنکھوں کی طرح دھندلا سا ہو کر رہ گیا تھا، بولی ——— "دیکھ بیٹیا" ——— میں تیرے نکٹ ہوں گی بھی اور نہیں بھی، ہاں، جہاں سہاگن کھڑی ہو سکتی ہے، وہاں بدھوا تو نہیں ہو سکتی ——— یہی ہے ساری دنیا کی ریت۔ یہی شاستر پان بھی کہتے ہیں۔ ٹھیک ہی کہتے ہیں ——— پھر وہ ایک ٹھنڈی سانس بھرتی۔ آنکھیں پونچھتی ہوئی شروع کرتی ——— "اور سن! جب پھیرے ہوں گے نا۔ تو جھک کے چلنا۔ بہت جھک کے بیرن! نہیں کیا کرایا سب دھرا رہ جائے گا ——— دیکھ، یوں ——— اور پھر دادی رقمن سر پر اپنے بیٹے جگن کی بندھی بندھائی پگڑی رکھ لیتی اور ہاتھ میں کرپان کی جگہ کپڑے دھونے والی تھپکی اور دولھا بنی ہوئی اپنی طرف سے اکڑ اکڑ کر چلتی۔ عورتیں ہنستیں، لڑکیاں لوٹ پوٹ ہوتی ہوئی ایک دوسرے کے دوہتڑ مارنے لگتیں۔ منّی شرماتی روتی، پر دادی اسے برابر پیچھے جھک کر آنے کے لیے کہتی۔

گلو کی ماں پکار اٹھتی ——— "چھے پھیرے لینا اماّں ——— ساتواں مت لینا"

——— گلو کی ماں کا مطلب تھا سات پھیرے ہوئے تو منّی کی دادی کے ساتھ شادی ہو جائے گی۔ ایسی شادی جسے وید شاستر تو کیا سویم بھگوان بھی نہیں توڑ سکتے۔

جب منّی پیچھے آتی ہوئی تھوڑا کم جھکتی، دادی مڑ کر دھپ سے ایک ہاتھ اس کے سر پر مارتی ——— "نیچی اور نیچی ——— " منّی درد سے بلبلاتی ہوئی روتی بھی اور ہنستی بھی۔ "بھاڑ میں جائے ایسا دولھا" وہ دادی کی طرف دیکھتے ہوئے کہتی "جب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا" دادی اسے پھٹکارتی ——— "نصیبوں جلی، عورت نہ جھکے تو اس دنیا کا چکر نہیں چلتا ——— تو بھی سوگوار ہوئے ——— جو نیچا ہوتا ہے، آخر وہی اونچا ہوتا ہے اور پھر تو؟ تجھے تو اور بھی نیچی ہو کر چلنا چاہیے جسے سویم بھگوان نے اونچی بنایا ——— مرد کا سواگت کرنا ہی پڑتا ہے۔ وہ جاچک ہوتا ہے نا ہمیشہ کوئی دان مانگتا ہے جو دینا ہی اچت ہے۔ کبھی دیوی بھی بچاری پر اپنے کواڑ بند کرتی ہے؟"

یہ دادی کو بھی نہ معلوم تھا کہ دیکھنے میں یہ سرکش لڑکی وقت آنے پر جھک کے چلنا تو ایک طرف رینگنے، لیٹ جانے کو بھی تیار ہو گی۔

شیام گلی میں ایکا ایکی بیسیوں ہی لڑکیاں پیدا ہو گئیں۔ وہ آج تھوڑی ہی پیدا ہوئی تھیں؛ تھیں وہ یہیں ——— برسوں، صدیوں سے۔ بس بیاہ کا شبد اچارن کرنے کی دیر تھی کہ وہ جیسے کسی جادو، کسی جنتر کے زور سے بے اختیار، بے بس، ایک دوسری پر گرتی پڑتی ہوئی کہیں سے کہیں آ گئیں۔ جیسے آموں کے موسم میں بڑی بڑی، ہری نیلی مکھیاں کہیں سے اپنے آپ چلی آتی ہیں اور جب تک کوئی آم چوستا رہے، وہ اردگرد منڈلاتی بھنبھناتی رہتی ہیں ——— آتے ہی وہ کوئی ڈھولک ہاتھ میں لے لیتی ہیں اور ایسے ایسے نورانی گانے گاتی ہیں جو دادی کی آنکھوں کی طرح کی دھندلی صدیوں سے ان کے گلے میں اٹکے ہوتے ہیں ——— پھر ایک جیجا ار کرنے کو ملتا ہے ——— جیسے ہر عورت کو بدن سہلوانے، دبوانے سے ایک عجیب طرح کا سکھ ملتا ہے۔ ایک خاص قسم کا حظ آتا ہے، ایسے ہی ان لڑکیوں کو بھی، جب

کوئی جیجا یا بارات میں آیا ہوا کوئی منچلا ان کے چٹکی کاٹ لیتا ہے اور یا کریں اس جگہ کو چھو لیتا ہے جہاں بجلی کے سیکڑوں، ہزاروں کلوواٹ جمع ہوتے ہیں ———

باہر تو کوئی ڈر کے مارے ان کی طرف انگلی اٹھانے کی ہمت کرتا ہے اور نہ یہ اٹھانے دیتی ہیں لیکن شادی بیاہ میں ان باتوں کی کھلی چھٹی ہوتی ہے۔ بڑے چھوٹے سب دیکھتے ہیں اور مسکرا کر چپ ہو جاتے ہیں ——— جیجے کو بھی تو سالیاں ملتی ہیں ——— ایک ایک سالی، آدھی گھر والی اتنی لڑکیوں کا جھرمٹ چھیڑنے، پیار کرنے کو پھر زندگی میں کہاں ملتا ہے؟ ——— اور یہ سالیاں، اپنے روپ کی کوئی جھلک دکھا کر، قدم قدم پر کوئی انگیخت پیدا کرتی ہوئی کہیں چھپن، کوئی الوپ ہو جاتی ہیں۔ جیسے یوگیشوروں اور تپیشوروں کے من کی مینکائیں، اللہ والوں کی حوریں جو انہی کے داخلی تخیل کی پیداوار ہوتی ہیں جس کے کارن ان آسمانی عورتوں کے بدن پر ایک بھی تو خط غلط نہیں لگا ہوتا۔ اگر یوگی تپلی عورت کو پسند کرتا ہے تو وہ تپلی ہوتی ہیں۔ بھری پری کا گرویدہ ہے تو وہ بھری پری اور یوگیشور انہی کے ساتھ تمسکن! انہی کے ساتھ پریم کھیلن کے لیے مچل جاتا ہے اور آگے بڑھنے، اوپر جانے سے انکار کر دیتا ہے۔ یوگیشور کو پکارتے پکارتے شبدروپی گورو کا گلا بیٹھ جاتا ہے اور جیوتی سروپ ایشور کی آنکھوں سے جوت جاتی رہتی ہے ——— اور یہ اپسرائیں، یہ حوریں یوگیوں اور صوفیوں کو اپنے اپنے رتبے، اپنے اپنے مقام سے گرا گرا کر اس خلوت صحیح سے تلبیسر کے لیے غلط ہو جاتی ہیں ———

——— مگر یہ دنیا کتنی پیاری جگہ ہے۔ جہاں کے لوگ خدا نے بنائے اور پھر فرشتوں سے کہا ——— ان کو سجدہ کرو ——— سالیوں کے چلے جانے کے بعد آخر ایک دن، ایک رات، عظیم "وہ" سامنے بیٹھی ہوتی ہے۔ ویدوں کے منتر اور شاستروں کے ارتھ جس کی طرف کبھی واضح اور کبھی مبہم سے اشارے کرتے ہیں بیاہ شادی کے گیت جس کے لیے مرتعش اور بھٹوں میں جس کے لیے اینٹیں پکتی ہیں۔ مل میں کام کرنے والا مزدور جس کے لیے پان بیڑی کی دکان پر پہنچ کر اپنی جیب کی آخری دونی سے آنکھ لگاتا ہے اور

سبھاؤں میں شور جس کے لیے بڑھتا ہی جاتا ہے۔ جسے اس کے بچّوں کی ماں ہونا ہے۔ ــــــ اس لیے وہ اس دھرتی کی طرح ڈرتی، سمٹتی ہے جس میں کسان آتا ہے ــــــ ہل کاندھے پر ڈالے، جس کا تیز اور تیکھا پھل ابھی ابھی کسی لوہار نے تیز آنچ والی بھٹی میں ڈھالا ہے ــــــ سر پر پگڑی باندھے کلغی سجائے وہ راجا جنک معلوم ہونے لگتا ہے جو دھرتی کو الٹائے گا تو نہ جانے کب سے اس میں دبی ہوئی کوئی مٹکی پھوٹ جانے گی اور اس میں سے بڑے ہی صبر، بڑے ہی ایثار، بڑے ہی پیار والی، جنک دلاری سیتا پیدا ہوگی ــــــ جس کے لیے اس کا عظیم "وہ" آتا ہے۔ ایک ہاتھ میں مقدّس کتاب، دوسرے میں شراب لیے ــــــ تاریخ کے دھندلے ادوار میں وہ اَن گنت گوپیوں سے کھیلا ہے۔ ان کے ساتھ بے شمار راسیں رچائی ہیں۔ اور اب اس کی آنکھوں میں ڈر ہے اور محبّت اور بہیمیت۔ وہ سمجھتا ہے اس بار کی تر و تازہ، حسین و جمیل دوشیزہ کے بدن پر قبضہ جمائے گا، بار بار اپنائے گا، بے ہوش ہو ہو جائے گا۔ اور نہیں جانتا وہ محض ایک تنکا ہے، زندگی کے بحرِ زخار میں۔ صرف ایک بہانہ ہے تخلیق کے اس لامتناہی عمل کو ایک بار چھیڑ دینے، ایک بار حرکت میں لے آنے کا اور پھر بھول جانے کا ــــــ دنیا بھر کے گوداموں میں بھرا ہوا اناج کسی وقت ایک دانہ محض تھا جو شاید اب اس دانے کو بھی معلوم نہیں کیوں کہ موت اسے لوٹ چکی ہے۔ زندگی ایک بار اس کے ہاتھوں سے چھوٹ چکی ہے ــــــ کاش انسان کو یہ معلوم ہو جائے تو وہ ایک بھوکے کی طرح عورت کی طرف ہاتھ نہ بڑھائے۔ پھر عورت بھی خواہ مخواہ اپنی عصمت نہ بچائے، اس پر سونے چاندی کے ورق نہ لگائے۔

شادی کے کچھ ہی دن رہ گئے تو پتا چلا گوتم نے سائکلوں کی ایجنسی چھوڑ دی ہے اور آسام میں ڈیما پور سے پچاس ساٹھ میل دُور، کسی جنگل میں کوئی ٹھیکہ لے لیا ہے جہاں مہینے ایک کے بعد کہیں چِٹھی پہنچتی تھی جیسے ہوائی ڈاک، ریل گاڑی سے نہیں، پیدل چل کر جاتی ہو ــــــ شادی ایک غیر معیّن عرصہ کے لیے ملتوی ہو گئی۔

دادی کی تو جان ہی نکل گئی۔ اسے پسینے آنے لگے ــــــ ٹھنڈے پسینے،

جن کا باہر کی سردی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس سے پہلے جب بھی گوتم کی چِٹھی آئی، دادی رُقمن نے منّی سوہی کو بلایا اور اس کا سر چوم لیا۔ بلایا اب کے بھی لیکن چومنے کی بجائے زور کا ایک دو ہتڑ اس کے سر پہ جڑ دیا ــــــ یہ لڑکی ہی منحوس تھی، کسی منحوس گھڑی میں پیدا ہوئی، کوئی منحوس ماں باپ کے گھر جنم لیا۔ اور اب جہاں بھی جائے گی تباہی اور بربادی لائے گی ــــــ دنیا پور اور ڈیما پور تو کیا پورے بہار، پورے بنگال، آسام، دیس میں کھلبلی مچ جائے گی ــــــ پھر گیتا کے پنّے کھلے، پھر سترھویں ادھیائے کا پاٹھ ہوا، پھر دادی مری، پھر جی اٹھی کیوں کہ پاٹھ کی سماپتی کے ساتھ ہی گوتم کی چِٹھی چلی آئی تھی جس میں لکھا تھا اگلے سال مئی کی بیس تاریخ کا ساہا نکلا ہے ــــــ دادی سمجھ بیٹھی تھی، گوتم نے کہیں منّی کو چلتے ہوئے دیکھ لیا ہے اور سوچ لیا ہے لیکن اسے کیا معلوم منّی بیٹھی ہوئی منّی کی کثافت نے گوتم کے پورے ذہن کا کچھ یوں احاطہ کر رکھا تھا کہ وہاں اب کسی اور لطیف سی سوچ اور سمجھ کی گنجائش ہی نہ تھی۔ التوا تو ایک مجبوری تھا!

دادی ایک بار پھر مہینے اور دن گننے لگی جیسے بیوہ چھت کی کڑیاں اور رنڈوا آسمان کے تارے گنتا ہے۔ پھر ایکا ایکی انسان تو کیا وہ بھگوان، آگ، پانی، ہوا سب کو گالیاں دینے لگی۔ اس میں صبر تو حد درجے کا تھا لیکن شکر نام کو نہیں ــــــ جب تک منّی پانچ فٹ سوا دس انچ کی ہو چلی تھی۔ اس کی کہانی اس قصّے کی طرح ہو گئی تھی جس میں قصّہ کہنے والا اپنا سر بچانے کے لیے بادشاہ کو ایسی کہانی سناتا ہے جو ختم نہیں ہو سکتی ــــــ سوراخ میں سے چڑیا آئی۔ اور دانہ لے گئی۔ چڑیا پھر آئی اور ایک دانہ اور لے گئی ــــــ اور کوٹھڑی دانوں سے بھری پڑی تھی، آسمان ستاروں سے اٹا ہوا تھا۔ شاہد میاں کے گھر کے پاس کچنار میں ہزاروں لاکھوں کونپلیں پھوٹ رہی تھیں ــــــ معلوم ہوتا تھا کہ بیاہ اور صرف بیاہ ہی اس طولانی عمل کو روک سکتا ہے ورنہ کوئی ہی دن میں منّی کا سر آکاش میں ہوگا اور وہ اوپر کی اوپر چلی جائے گی جیسے کنس کے نیچے پٹخنے سے مہامایا بجلی بن کر آسمان کی

طرف لپک گئی تھی ——————

"جب تک توگو تو بھی لمبا ہو چکا ہوگا" دادی کہتی.

"کیا پتا میا؟" جمنا کہتی. پھر ڈگا مبروں کی بہو ترمبکا بائی ایک قدم آگے بڑھ کر بول اٹھتی: "ہو سکتا ہے اپنے دو پانچ چھوٹا بھی ہو گیا ہو" اور پھر وہ ایک دوسرے کو ٹھوکے دیتے ہوئے مسکرانے لگتیں.

"ارے!" دادی ترمبکا بائی کو پھٹکارتی "میں اتنا بھی نہیں سمجھتی، پنوتی! ایک بار جو بڑھ جائے، پھر نہیں گھٹتا" اور پھر —— "میں بوڑھی جرور ہو گئی ہوں، ترمبکا! پر عقل میں تجھ پہ بیس ہوں، بیس۔"

پھر گلو کی ماں حساب کر کے بتاتی: "اگر لڑکے کا قد اتنا ہی رہے، دادی! اور لڑکی کا چار پانچ گرہ، دو تین انگل بڑھ جائے تو وہ آپی چھوٹا ہو گیا کہ نہیں ہو گیا؟"

اتنا حساب دادی کو کہاں آتا تھا؟ منی سوہی کے دو تین انگل اور لمبی ہو جانے کے خیال ہی سے خون اس کے خشک چہرے کی رگوں اور ریشوں میں دوڑنے لگتا. یوں معلوم ہوتا جیسے پیپل سے گرا ہوا پتا پھر اپنے ڈال پہ جا لگا ہے اور دوسرے پتوں سے ٹکرا رہا ہے شور مچا رہا ہے. وہ ترمبکا کو یا گلو کی ماں کو گالیاں دینے لگتی —— "چھوٹا ہو تیرا باپ، چھوٹا ہو تیرا بھائی، چھوٹا ہو تیرا خصم ——" اور عورتیں یہ سمجھتی ہوئی کہ دیوی دادی کی گالیوں سے گرہ کھلے، ہنستی کھیلتی اپنے گھر چلی جاتیں جہاں انھیں اپنے مرد، کیا باپ اور کیا بھائی اور کیا شوہر ایکا ایکی چھوٹے معلوم ہونے لگتے!

منی سوہی اب تک اپنی ہرنس، اپنے ہر پور سے نفرت کرنے لگی تھی. وہ شادی بیاہ کے نام ہی سے خائف ہونے لگی. کیا شادی بیاہ ہی رہ گیا ہے، اس دنیا میں؟ اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں؟ کہیں بھی جانا ہو وہاں پہنچنے کے لیے بیسیوں سڑکیں، سیکڑوں پگڈنڈیاں ہوتی ہیں. بیاہ کے لیے کیا ایک ہی جرنیلی سڑک ہے؟ آخر تھک ہار کر منی لیٹ جاتی. سو جاتی جہاں اسے خواب میں دو ٹھے ہی دو ٹھے دکھائی دیتے.

ایک دن دیویندر انگریزی تصویر "مولاں روش" دیکھ آیا جس میں اداکار ،

جوزے فیرارا اپنے پیر پیچھے باندھ کر فرانس کا بونا مصور لوترک بنتا ہے. پہلے تو دیویندر نے نوکروڑ گالیاں اپنے دیش بھارت کو دیں جس میں اتنا زور لگانے پر بھی صنعتی ترقی نہیں ہوتی، جہاں سائکل کے کچھ پرزے ابھی تک ولایت سے آتے ہیں. جہاں میک اپ کا آرٹ اتنا بھی نہیں پنپ سکا جس سے لمبے قد کا ایک آدمی ٹھگنا اور بونا لگ سکے اور اس بات کو وہ بھول ہی گیا کہ وہ پہلے ہی ٹھگنا ہے اس سے اور ٹھگنا نہیں ہو سکتا.

اس پر بھی دیویندر نے جوزے فیرار کی طرح اپنے پیر پیچھے کی طرف باندھے اور گھٹنوں کے بل چل کر منی کو دکھانے لگا —— "ایسے ہی پیر باندھ لینا، منی! تب گوتم کے ساتھ ٹھیک سے پھیرے لے سکی گی ——"

"اگر رسی کھل گئی تو" منی کی سہیلی گوراں پوچھتی.

"تو چپ کرنا" دیویندر اسے ڈانٹ دیتا "منی کا تو پھر بھی بیاہ ہو جائے گا ڈہائی فٹی —— تیرا کبھی ہوگا ہی نہیں!"

اور چھوٹے قد کی گوراں دیویندر کو دانت دکھاتے ہوئے "ای ای ای" کرتی اور پھر ایک طرف چھپ کر رونے لگتی اور پھر آپ ہی اپنے آپ کو منا کر منی کے پاس آجاتی اور کہتی —— منا! کہیں ایسا نہیں ہو سکتا کہ تو اپنا کچھ قد مجھے دے دے اور میرا کچھ آپ لے لے ——"

"ایسا ہو جائے تو پھر —— دنیا ہی نہ بس جائے" منی جواب دیتی.

—— اور پھر دونوں مل کر اس اُجڑی ہوئی دنیا کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگتیں. جہاں ابھی تک دیویندر، اپنی ہیکڑی میں گھٹنوں کے بل چل کر منی کو دکھا رہا تھا اور کہہ رہا تھا —— "ایسے ایسے —— کسی کو پتا بھی نہ چلے گا۔" اپنے الٹے طریقے سے وہ اس لمبی لڑکی کو وہی بات سمجھا رہا تھا جو آج سے صدیوں پہلے ارسطو نے عورت کے نیچے گھوڑا بنتے ہوئے سکندر کو سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن پوری طرح سے سمجھا نہ پایا تھا —— اس ادھورے کام کو دیویندر پورا کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا. اسے اذیت ہو رہی تھی لیکن کرب کا کوئی بھی اثر وہ اپنے چہرے پر نہ آنے

دیتا۔ خاصی دیر تک وہ چلتا رہا۔ منّی کر اس کے گھٹنے چھل گئے ـــــ نرمبکا اور جمنا اس کی طرف دیکھ کر ایک دوسرے کو کہنیاں مار رہی تھیں اور ہنس رہی تھیں اور پکار رہی تھیں ـــــ "شیلا ـــــ اری او شیلا ـــــ"

آخر ایک دن برات آ ہی گئی، پھیرے بھی ہو ہی گئے۔

پھیروں میں منّی دہری، تہری ہو کر چل رہی تھی۔ لیکن اب اس بات کا کیا علاج اتنے نیچی ہوتے ہوئے بھی وہ گوتم سے لمبی لگ رہی تھی؛ نرمبکا کا خیال صحیح تھا گوتم کا قد اور بھی چھوٹا ہو گیا تھا اور یا ـــــ منّی کا بڑا۔ پل پل کے بعد پھیرے لیتی ہوئی منّی کے کان میں کوئی کہ دیتا ـــــ "نیچی اور نیچی" ـــــ منّی نے دھرتی میں گھس جانے کی کوشش کی۔ لیکن دھرتی نے ساتھ نہ دیا۔ وہ آسمان کی طرف لپک سکتی تھی، دھرتی میں نہ سما سکتی۔

آشیرواد کی جگہ کئی بار دادی کے گپ چپ دھپّے منّی کے سر پر پڑے، جس سے اس کا سر بول اُٹھا۔ وہ تو اسے اپنی آخری مصیبت سمجھی تھی لیکن دادی کا خیال ایسا نہ تھا جو جھوٹ اس نے اور اس کے بیٹے، پوتے اور تیلی محلّے کے سب مرد عورتوں نے مل کر بولا تھا، آخر تو اسے کھلنا تھا۔ دادی چاہتی تھی کھلے تو کھلے پر ابھی نہ کھلے ـــــ ایک بار شادی ہو جائے پھر اسے انسان تو کیا بھگوان بھی نہ توڑ سکیں گے۔ لیکن ـــــ آخر وہ پھر منّی کو اونچا ہو کر چلتی ہوئی دیکھتی تو اپنے کلیجے میں مکّا مارتے ہوئے کہتی ـــــ "ہائے رانڈ، تو نہ بسے گی!"

پنڈت لوگ منتر پڑھتے رہے، جن کا مطلب تھا ـــــ "تم جانوروں کی طرح سے نہیں رہو گے ـــــ بے موسم کا بھوگ بلاس نہیں کرو گے ـــــ تم بیمار اور فاترالعقل بچّے اس دنیا میں نہیں لاؤ گے ـــــ" اور ارد گرد کے لوگ بیمار اور فاتر العقل بچّوں ہی کی طرح سے بیاہ کی رسم کو دیکھ رہے تھے۔ شاید اس لیے کہ وہ شلوکوں کی زبان، سنسکرت سے واقف نہ تھے!

بیاہ ہو جانے کے بعد جب بھی گوتم اندر، ڈپٹی بھون کی بیٹھک میں آیا، اس نے منّی کو بیٹھے ہوئے پایا۔ منّی کو اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے کی سخت مناہی تھی

جس سے اس کے بدن کی ہڈیاں تک اکڑ گئیں۔ اتنی دیر بیٹھے رہنے سے اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ پیدا ہی نہیں ہوئی، ابھی تک ماں کی کوکھ میں پڑی ہے ـــــ اور باہر آنے، ہاتھ پیر پھیلانے کے لیے تڑپ رہی ہے ـــــ

سوکھم منّی نے گوتم کو اپنا داماد اور منّی کو اپنی بیٹی جانتے ہوئے اپنے گھر کھانے پر بلایا لیکن دیویندر نے اسے سمجھا بجھا کر لوٹا دیا۔ شام کے قریب گوتم نے سینما دیکھنے کا پروگرام بنا لیا۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ جانا، کوئی موج اڑانا چاہتا تھا لیکن دادی نے انکار کر دیا۔ وہ خود تو کچھ نہ بولی لیکن اپنے بیٹے جگن ناتھ کو اشارہ کر دیا۔ جس نے بڑے پیار کے ساتھ گوتم سے کہا ـــــ "یہاں نہیں بیٹا ـــــ ہم تیاگی ذرا پرانے خیال کے لوگ ہیں۔ تو اسے گھر لے جانا، پھر جو جی چاہے کرنا!"

اور گوتم خاموش ہو گیا۔

اگلی سویر کو گوتم کا باپ، گوتم اور برات میں آئے ہوئے سب آدمی ڈیا پور جانے کے لیے روانہ ہونے والے تھے۔ پہلے کلکتہ جانا تھا۔ اس میں ریت تھی کیوں کہ بھائی ہونے کے ناطے دیویندر ہی کو منّی کو ڈولی میں ڈالنا تھا ـــــ کسی کتاب میں لکھا ہے کہ مرد کو شادی اس وقت کرنی چاہیے جب وہ عورت کو اپنے پٹھوں کے زور سے ایک ہی ہاتھ سے اٹھا سکتا ہو۔ دیویندر شادی شدہ آدمی تھا لیکن اس سے کنواری بہن کو اٹھایا نہ گیا۔ منّی یوں اس سے لپٹی ہوئی ڈولی میں جا بیٹھی کہ اس کے اٹھائے ہونے کا گمان ہو۔ حالانکہ وہ بیچ بیچ میں چلتی جا رہی تھی۔ منّی نے ایک ہی مٹھی چاولوں کی سر کے اوپر سے پھینکی۔ لیکن دادی جو تھی ـــــ جس نے پوری بوری خالی کر دی۔ پھر ڈولی اٹھی، سسر نے ڈولی کے اوپر سے نئے پیسوں کی چھوٹ کی۔ چونکہ وہ خود جا کر بینک سے دس روپے کے نئے نئے پیسے لایا تھا، اس لیے وہ ڈولی پر سے گرتے ہوئے سورج کی روشنی میں چمک رہے تھے اور سچ مچ کی چھوٹی چھوٹی مہریں معلوم ہو رہے تھے ـــــ گلی بازار کے بچّے پیسے اٹھانے، ڈولی کی راہ روکنے لگے ـــــ دادی رو رہی تھی اور بچّوں سے کہ بھی رہی تھی ـــــ

بچو، شہیدو ــــ جانے دو، ارے ڈولی کو تو جانے دو" جیسے ڈولی اب بھی واپس آسکتی تھی۔

دادی کے اشارے پر دیویندر بچّوں کو مار مار کر راستے سے ہٹانے لگا۔ ایک چھوٹ اور بھولی اور لرزتے ہوئے پیسے سامنے زمین پر گرے۔ دیویندر کے من کا بچّہ ابھر آیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بھی لپکے اور چمکتے دمکتے ہوئے پیسے اٹھالے اور ان پیسوں کو لگی ہوئی مٹی اور دھول سے صاف کر کے جیب میں ڈال لے۔ لیکن ــــ اندر ہی اندر وہ مسکرا دیا!

شیلا حسب معمول جھوٹ موٹ کے آنسو بہا رہی تھی۔ اس کے آنسوؤں سے سچے تو تُوران، گلّو کی ماں، جمنا اور تر مبکا کے آنسو تھے، جو اپنے اپنے من میں چھوڑے ہوئے یا چھوڑے جانے والے بھائیوں اور باپوں کو دیکھ رہی تھیں ــــ پھر بہنوں کو، بھابیوں کو۔ جیسے سسرال کے سب رشتے جھوٹے ہوں۔ کیا نندیں اور کیا ساسیں اور کیا سسرے ــــ شادی کے وقت وہ سب کیسے لپک لپک کر ذہن میں آرہے تھے ــــ

شیلا کو اندر ایک بہت ہی تسکین ایک بہت بڑی چھٹّی کا احساس ہوا۔ جبھی اس کی نظر دادی پر پڑی جو ہتھڑے پر کھڑی اپنی دھندلی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر ڈولی کو دور ہی دور، نگاہوں سے دور، دل سے دور، بھیجنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دادی کو دیکھتے ہی اس کے ماتھے پر تیور آگئے۔ اور اس نے کہا ــــ "یہ دوسری ڈولی نہ جانے کب اٹھے گی؟"

دیویندر نے دادی کی طرف دیکھا نہ جانے اس کے من میں کیا آئی کہ وہ دوڑ کر اس سے لپٹ گیا اور بولا ــــ "ماں!" اور پھر وہ بچّوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر بلک بلک کر رونے لگا۔ دادی نے اسے چھاتی میں چھپا لیا۔ وہ گرنے ہی والی تھی کہ دیویندر نے دادی کو اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا اور کسی ڈولی کی طرف لے کر چل نکلا ــــ

منّی کیا گئی کہ شیام گلی اور تیلی محلّے کی رونق بھی ساتھ ہی لیتی گئی۔ ہر چھوٹا بڑا پوچھتا تھا ــــ منّی کی کوئی چِٹھی آئی ہے یا نہیں اور ہمیشہ جواب ملتا ــــ آئی تو نہیں، پر آجائے گی۔ مہینے دو مہینے کے بعد تو وہاں چِٹھی پہنچتی ہے۔

لیکن دادی رمن بھیتے سے ڈری ہوئی تھی ــــ وہاں ضرور جھگڑے

ہو گئے ہوں گے۔ ضرور انھوں نے میری منّی کو گھر سے نکال دیا ہوگا اور وہ کہیں جنگلوں میں خاک چھانتی پھر رہی ہوگی۔ ان جنگلوں میں جہاں سانپ جتنی بڑی جونکیں ہوتی ہیں۔ پیروں سے چمٹ جاتی ہیں اور ہولے ہولے یوں خون چوستی ہیں کہ انسان کو پتا بھی نہیں چلتا۔ وہ یونہی جیسے تھک کر آرام کرنے کے لیے بیٹھتا ہے تو پھر نہیں اٹھتا ــــ

ضرور منّی کو کوئی شیر چیتا کھا گیا ہوگا۔ ورنہ مہینوں سے چِٹھی نہ لکھنے کا کیا مطلب؟ اور پھر بیچ میں ایک آدھ چِٹھی آہی جاتی جسے دادی پہلے دیویندر سے پڑھواتی۔ پھر شاید میاں اور پھر سوکھم ڈگامبر سے ــــ تب کہیں جا کے اس کی تسلّی ہوتی۔ تسلّی کہاں؟ اگر منّی لمبا خط لکھتی تو دادی کو یوں معلوم ہوتا جیسے کوئی رونے رو رہی ہے، الفاظ جن کا ساتھ نہیں دیتے اگر چھوٹی لکھتی تو کہتی ــــ دیکھا نا! میں تو پہلے ہی کہتی تھی، اسے کوئی منہ نہیں لگائے گا۔ کوئی ایسی بات ہے جو منّی چھپا رہی ہے ورنہ مجھے ایسے دو اکھر لکھ کے بھیج دیتی؟ ــــ یہی ہے نا، اپنے دیش کی بیٹیوں کا۔ مرتی مر جاتی ہیں پر شکایت کا لفظ بھی منہ پہ نہیں لاتیں ــــ ہے رام! اب کیا ہوگا؟ کہیں میں اڑ کر ڈبیا پور چلی جاؤں۔ ایک بار میں اپنی سوہنی کو ہنستے بستے ہوئے دیکھ لوں۔ تم سب جھوٹ کہتے ہو۔ ضرور وہاں کوئی گڑبڑ ہے پر میری بیٹی کو جس نے تنگ کیا، بھگوان اس کا بھی بھلا نہیں کرے گا ــــ میں مرنا چاہتی تھی۔ ہاں، اب اس دنیا میں رہ ہی کیا گیا ہے؟ لیکن یہ مجھے مرنے، آرام سے جانے بھی نہیں دیتی۔ ہے بھگوان! انسان دنیا میں جس کو سجن سمجھتا ہے، وہ کتنا بڑا دشمن ہوتا ہے ــــ

اور پھر ــــ یہ ہو کیسے سکتا ہے، چھے فٹ کی لڑکی سے کوئی پانچ فٹ کا لڑکا بیاہ کرلے؟ اور پھر اسے بسا بھی لے؟ ــــ اب تک تو گوگو کو پتا بھی چل گیا ہوگا اور دادی یوں بات کرتی جیسے شاید نہ بھی پتا چلا ہو۔ وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتی اور من ہی من میں کئی پرارتھنائیں کرتی۔ ہے بھگوان! کیا یہ نہیں ہو سکتا جب گوگو منّی کی طرف دیکھے تو وہ اسے چھوٹی لگے؟ ــــ

ایک دن جگن ناتھ گھر میں آیا تو کچھ دیر سے ــــ شاید دیر تک شاستر ارتھ

ہوتے رہے۔ گھر پہنچنے پر شیلا سو رہی تھی۔ جگن ناتھ چپکے دبکے رسوئی میں گیا تاکہ بہو کو جگانا نہ پڑے۔ انھوں نے اوپر نیچے ہاتھ مارے، سر بھی چھینکے سے ٹکرا کر لہو لہان کیا لیکن کہیں کھانا ہوتا تو ملتا۔ اس بات کا علم نہ دادی کو ہوا اور نہ دیویندر کو۔ سب یہی سمجھتے رہے کہ شیلا نے حسبِ معمول کھانا پکایا ہوگا اور طاق میں رکھ دیا ہوگا ـــــــ

طاق میں پانی کا ایک گلاس پڑا تھا جو جگن ناتھ کا ہاتھ لگنے سے گرنے لگا۔ لیکن جگن ناتھ نے سنبھال لیا اور وہ سمجھ گیا۔ اس نے گلاس اٹھایا اور ایک ہی سانس میں پینے کے بعد بولا ـــــــ "تیرا شکر ہے مالک!"

اور پھر وہ اندر جا کر لیٹ گیا۔ پانی اس کے کلیجے کو لگ گیا تھا۔ اتفاق کی بات۔ جگن ناتھ نے صبح سے کچھ نہ کھایا تھا۔ بھوکے پیٹ ہی وہ شاستر ارتھ کرتا رہا۔ حالانکہ شاستروں ہی نے شریر کو ہری مندر قرار دے کر اس کی رکھشا مانس کا پرم دھرم لکھا ہے ــــ دراصل جگن ناتھ تیاگی پرم اوداس ہو چکا تھا اور دنیا کی کوئی چیز اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہ لا سکتی تھی۔ اپنی سمجھ میں وہ بھگوان کی پرستش کر رہا تھا لیکن بھگوان تو سمجھتے تھے کہ وہ انسان کی پوجا کر رہا ہے ـــــــ اپنی مرحوم بیوی کی، جسے محبت اور صرف محبت کی وجہ سے وہ پیٹا کرتا تھا۔ لیکن اس پر بھی بھگوان نے جگن ناتھ کی حاضری لگا لی۔ بھگوان جانتے تھے ناکہ اُن تک پہنچنے کے لیے جس بُت کی پوجا کی جاتی ہے، وہ خود کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ صرف مجھ تک پہنچنے کا ایک بہانہ ہے۔

پیٹ میں درد ہونے کے باوجود جگن ناتھ دھیان میں بیٹھ گئے۔ تبھی دادی کی آواز آئی ـــ "بیٹا!"

جگن ناتھ نے اندھیرے ہی میں منہ آواز کی طرف کر دیا اور بولا ـــــــ "ہاں ماں"

"نیند نہیں آتی؟"

"ہاں ماں ـــــ نیند نہیں آتی!"

"کھانا کھا لیا؟"

"ہاں ماں ـــــ بہت کھا لیا ـــــ"

"کوئی چورن بھی لا دوں، بہو کو جگاؤں؟"

"نہیں ماں ـــــ میں ایسے ہی سو جاؤں گا۔"

اور جگن ناتھ ایسے ہی سو گیا۔

سویرے بہت شور مچا۔ شیلا تو جانتی تھی کہ اس نے جاتے سمے سسر جی کو کھانا بھی نہیں کھلایا۔ اس لیے وہ سب سے زیادہ اونچی آواز میں بین کر رہی تھی اور بار بار اپنے مرے ہوئے سسر کے پیروں پر سر پٹخ رہی تھی۔ درحقیقت اس بات کا علم شیلا کو بھی نہ تھا کہ اس کے پتی دیو کے پتا اتنی سی بات پر اتنے خفا ہو جائیں گے۔ چھوٹی سی بھول کی اتنی بڑی سزا دیں گے۔ وہ ہرگز یہ نہیں چاہتی تھی کہ گھر میں آیا ہوا پنشن کا پیسا بند ہو جائے۔ پتا نہیں بھگوان نے کس کی کرنی کی سزا کس کو دی۔ اس کی رمزیں وہی جانے ـــــ شیلا جسے اس دنیا سے بھیجنا چاہتی تھی وہ تو جی رہی تھی ـــــــ

دادی کی وہی حالت ہوئی جو ماں کی ہو سکتی ہے۔ جب جگن ناتھ تیاگی کو لے جانے لگے اور ارتھی اٹھائی گئی۔ تو دادی یہ کہتے ہوئے بے ہوش ہو گئی ـــــ "ارے تجھے شرم نہ آئی جگنا۔ میں بوڑھی تیرے کاندھے پر سوار ہو کر جاتی۔ تو جوان ہو کر میرے کندھوں پہ جا رہا ہے!"

گلی کا ایک آدمی جو دیکھ رہا تھا، شاہد سے بولا ـــــــ

"کیا فقرہ ہے ـــــ کوئی لکھ دے تو لوگ رو رو کر پاگل ہو جائیں!"

شاہد نے ایک ٹکٹکی نظر سے اس آدمی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ـــــ

"کیسے لکھ دیں بھائی ـــــ اس فقرے کو لکھنے کے لیے بیٹا دینا پڑتا ہے!"

شیلا تو سمجھی ہوگی، سسر تو گئے، اب دادی بھی نہ بچ سکے گی۔ دادی کئی دن سکتے میں رہی۔ دیویندر گھر سے نہ گیا۔ اسے دکھانے کے لیے تو شیلا کو بڑھیا کی دیکھ ریکھ کرنا ہی پڑتی تھی۔ پہلے تو شیلا نے پاٹھ کرنے کی پروا نہ کی۔ لیکن جب اس نے دادی کا زندہ مُردہ گلے پڑتے دیکھا تو پاٹھ بھی کیا۔ لیکن دادی پھر وہیں کی وہیں تھی۔ شاید اس منزل پر پہنچ چکی تھی جہاں گیتا کے پاٹھ بھی اثر نہیں کرتے۔

ہوش میں آتے ہی جو پہلا سوال دادی نے کیا، وہ تھا ـــــ "منّی کی چٹھی آئی ہے؟"

دیویندر نے دادی کے سر پر ہاتھ پھیرتے، پچکارتے ہوئے کہا "نہیں دادی، آجائے گی تو کیوں فکر کرتی ہے؟"

واقعی وہی ہوا۔ پتا کے مرنے کی خبر منّی سوہی کو کہیں ایک ڈیڑھ مہینے کے بعد ملی جب کر داہ سنسکار تو ایک طرف ہڈیاں بھی گنگا میں بہائی جا چکی تھیں۔ شاید اسی لیے ابھی بھاگ کر کالے کوسوں سے دنیا پور آنا اور آسام کی جونکیں لانا، بیکار کی بات تھی۔ اور جب باپ کی موت کے بعد، مہینوں بعد تک بھی منی نہ آئی تو دادی نے ہنکارتے ہوئے کہا ——

"ارے منّی ہو تو آئے —— " جیسے وہیں کسی نے منّی کا گلا گھونٹ ڈالا۔

دادی کو دل کی اندرون ترین گہرائیوں سے اس بات کا یقین تھا کہ منّی اور گوتم کی لمنل، بے جوڑ شادی کبھی نبھ ہی نہیں سکتی منّی ابھی لوٹ کے آئی کہ آئی۔ روتی، چلاتی، سر پیٹتی ہوئی ——

برسات ہو کے ہٹی تھی۔ سورج کی گرمی کے راستے میں ایک بھی تو خاکی ذرّہ حائل نہ ہوتا تھا۔ کرنیں زمین کھود کھود کر اس میں سے بھمبیں نکال رہی تھیں۔ کچنار کا پیڑ تو سامنے مکان کے سائے میں تھا۔ اس لیے اس پہ گرمی کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ برسات کی پہلی ریزش اور آخری ریزش بھی پیڑ پر لگے ہوئے پھولوں کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ الٹا اس نے کلیوں کے منہ بھی کھول دیے اور اب پورا کچنار ہنستا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کی ایک ڈال سامنے کھتریوں کے مکان کی کھڑکی میں جا گھسی تھی جہاں لال شنیل کا سوٹ پہنے کھتریوں کی بہو کھڑی تھی، جسے چند ہی دن پہلے وہ لکھنؤ سے بیاہ کر لائے تھے۔ لال لال کپڑے، مخملی سوٹ پہنے ہوئے وہ بیر بہوٹی معلوم ہو رہی تھی جو برسات اور اس کے بعد کے تڑاکے میں سے کہیں سے اپنے آپ نکل آتی ہے۔

شاہد کی بہن، فردوس منّی کی شادی پر تو نہ آسکی تھی۔ اب آئی تو منّی کے بارے میں پوچھ پوچھ کر اس نے سب کا جینا حرام کر دیا۔ فردوس دادی رقمن کے پاس بیٹھی ہوئی اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہی تھی کہ گوراں بھاگی آئی ۔۔

"دادی —— دادی" وہ بولی "منّی آگئی!"

شیام گلی پوری کی پوری اُلٹ پڑی اور منّی کو لینے کے لیے آگے بڑھی۔ منّی تانگے پر سے اتری اور گوتم کے ساتھ ڈپٹی بھون کی طرف آنے لگی۔ اب وہ چھے فٹ کی تھی اور اس کے ساتھ اس کا پتی گوتم جو سچ مچ، تمیکا اور گلّو کی ماں کے کہنے کے مطابق پہلے سے بھی ٹھگنا اور بونا معلوم ہو رہا تھا —— وہ دنوں آ رہے تھے —— ایک دوسرے کے وجود سے بے خبر، کسی بھی احساس ذات سے عاری۔ جبھی منّی اپنے گھر کے پاس پہنچی تو دھپ سے ایک ہاتھ اس کے سر پر پڑا ——

"نیچی، موٹی —— نیچی"

اور منّی نے بلبلا کر دیکھا —— دادی تھڑے پر کھڑی تھی اور اس کا عضو عضو کانپ رہا تھا۔ منّی نے ایکا ایکی چلاتے ہوئے کہا —— "دادی ی ی ی"

اور اس سے لپٹ گئی اور بھینچتے ہوئے بولی —— "باپو کہاں بھیج دیے دادی؟"

دادی نے جگن ناتھ کے بارے میں کچھ نہ سنا۔ بولی "گوتم آیا ہے؟"

جبھی گوتم نے آ کر دادی کے پیروں پر سر رکھ دیا۔

دادی رقمن نے منہ قریب کر کے، آنکھیں سکوڑ کر دیکھا اور بولی —— "جیتے رہو، جیتے رہو بیٹا، پرماتما ——" اور پھر اندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگی "آؤ —— آؤ میں واری، آؤ ——"

ماتم تو کچھ ہی دیر میں ختم ہو گیا —— دراصل ماتم بھی اُداس ہو گیا تھا اور اب ڈپٹی بھون میں قہقہے لگ رہے تھے۔ صرف شیلا تھی جسے سسر کی موت کے بعد اتنی جلدی ہنسنا اچھا نہ لگتا تھا۔

دادی نے دیکھا، منّی خوش، بہت خوش ہو رہی تھی۔ گوتم، اس کی ماں، اس کے باپ اسے ہاتھوں سے چھانو کرتے تھے، ہاں، چھانو کرنے کے لیے انھیں سیڑھی ضرور لگانا پڑتی تھی۔ دادی کو یہ بھی پتا چلا منّو کو ساتواں مہینہ ہے۔

گوتم جتنے دن بھی رہا۔ بہت خوش، بہت ہنستا رہا۔ وہ دادی کے ساتھ مذاق کرتا رہا۔ نہ لمبے ہونے کی بات سامنے آئی، نہ چھوٹے ہونے کی —— اور

پھر وہ منّی کو زچگی کے لیے ــــ مائیکے چھوڑ کر، دادی ماں کے پیر چھوتا ہوا چلا گیا۔

دادی کی بیماری لوٹ آئی۔ ایک دن رات کے دو بجے کھانسی جو آئی تو کتنی دیر تک دم ہی واپس نہ آیا شیلا اور منی پھر دوڑے، شیلا تو اب ان سب باتوں کو بے کار سمجھتی تھی لیکن منّی سوامی کا بھگوان پر پورا وشواس تھا۔ اس نے گوراں کی مدد سے دادی کو نیچے فرش پر اتارا اور اس کے کان کے پاس منہ کر کے بڑی شردھا کے ساتھ نہ صرف گیتا کا سترھواں ادھیائے بلکہ مہاتم بھی پڑھا۔ اور اس کا پورا پھل دادی کے نمت دیا لیکن دادی ابھی تک جی رہی تھی ــــ اس کے چہرے پر ایک عجیب قسم کی نورانی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ پھر بچّوں کی سی شرارت چلی آئی۔ اس نے مرگھلے سے انداز میں دائیں اور دیکھا جس طرف منّی بیٹھی تھی جو گیتا کو تپائی پر رکھتے ہوئے بڑے غور سے دادی کی سبک سی پرواز دیکھ رہی تھی ــــ

"منّی" دادی نے خفیف سی آواز میں کہا۔

"ہاں دادی ماں" منّی بولی اور دادی کے منہ کے پاس کان کر دیا۔

دادی نے کچھ کہا منّی ایک دم شرمائی اور پیچھے ہٹ گئی۔ شیلا پاس کھڑی تھی بائیں طرف گوراں ــــ

"کیا پوچھا دادی نے؟" گوراں بولی۔

"کچھ نہیں" منّی نے کہا اور پھر اور بھی شرما گئی۔ رنگ لال ہو گیا۔

گوراں نے ضد پکڑی تو منّی بولی، کہہ رہی تھی ــــ "ہائے ری منّو! وہ تجھ سے پیار کیسے کرتا ہوگا؟"

اور پھر سب نے مڑ کر دیکھا، دادی رتن جیسے پہلے مسکرا رہی تھی، ویسے ہی اب بھی مسکرا رہی ہے ــــ

اس کے بعد واتاورن میں ہوا کا تنتو پربل ہو گیا اور تپائی پر پڑی ہوئی گیتا کے پنّے اڑنے لگے اور اڑتے اڑتے وہاں آکر رک گئے جہاں شبد ساپت لکھا ہوتا ہے۔

اپنے دُکھ مجھے دے دو

شادی کی رات بالکل وہ نہ ہوا جو مدن نے سوچا تھا۔

جب چکلی بھابی نے پھسلا کر مدن کو بیچ والے کمرے میں دھکیل دیا تو اندو سامنے شال میں لپٹی ہوئی اندھیرے کا بھاگ بنی جا رہی تھی۔ باہر چکلی بھابی، دریا آباد والی پھوپی اور دوسری عورتوں کی ہنسی، رات کے خاموش پانی میں مصری کی طرح دھیرے دھیرے گھل رہی تھی۔ عورتیں سب یہی سمجھتی تھیں، اتنا بڑا ہو جانے پر بھی مدن کچھ نہیں جانتا۔ کیوں کر جب اسے بیچ رات کے نیند سے جگایا گیا تو وہ ہڑبڑا رہا تھا ــــ

"کہاں، کہاں لیے جا رہی ہو مجھے؟"

ان عورتوں کے اپنے دن بیت چکے تھے۔ پہلی رات کے بارے میں اُن کے شریر شوہروں نے جو کچھ کہا اور مانا تھا اس کی گونج تک اُن کے کانوں میں باقی نہ رہی تھی۔ وہ خود رس بس چکی تھیں اور اب اپنی ایک اور بہن کو بسانے پر تلی ہوئی تھیں۔ دھرتی کی یہ بیٹیاں مرد کو یوں سمجھتی تھیں جیسے بادل کا ٹکڑا ہو، جس کی طرف بارش کے لیے منہ اٹھا کر دیکھنا ہی پڑتا ہے۔ نہ برسے تو منتیں ماننی پڑتی ہیں، چڑھاوے چڑھانے پڑتے ہیں، جادو ٹونے کرنے پڑتے ہیں۔ حالاں کہ مدن کالکا جی کی اس نئی آبادی میں گھر کے سامنے کھلی جگہ پر پڑا اسی وقت کا منتظر تھا۔ پھر شامتِ اعمال پڑوسی سبطے

کی بھینس اس کی کھاٹ ہی کے پاس بندھی تھی جو بار بار پھنکارتی ہوتی مدن کو سونگھ لیتی اور وہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر اسے دور رکھنے کی کوشش کرتا۔ ایسے میں بھلا نیند کا سوال ہی کہاں تھا؟

سمندر کی لہروں اور عورتوں کے خون کو راستہ بنانے والا چاند، ایک کھڑکی کے راستے اندر چلا آیا تھا اور دیکھ رہا تھا، دروازے کے اس طرف کھڑا مدن اگلا قدم کہاں رکھتا ہے؟ مدن کے اپنے اندر ایک گھن گرج سی ہو رہی تھی اور اسے اپنا آپ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے بجلی کا کھمبا ہے، جسے کان لگانے سے اسے اندر کی سنسناہٹ سنائی دے جائے گی۔ کچھ دیر یونہی کھڑے رہنے کے بعد اس نے آگے بڑھ کر پلنگ کو کھینچ کر چاندنی میں کر دیا تاکہ دُلھن کا چہرہ تو دیکھ سکے۔ پھر وہ ٹھٹھک گیا۔ جبھی اس نے سوچا ـــــــ اندو میری بیوی ہے، کوئی پرائی عورت تو نہیں جسے نہ چھونے کا سبق بچپن ہی سے پڑھتا آیا ہوں۔ شالو میں لپٹی ہوئی دلھن کو دیکھتے ہوئے اس نے فرض کر لیا، یہاں اندو کا منہ ہوگا اور جب ہاتھ بڑھا کر اس نے پاس پڑی گٹھڑی کو چھوا تو وہیں اندو کا منہ تھا۔ مدن نے سوچا تھا وہ آسانی سے مجھے اپنا آپ نہ دیکھنے دے گی، لیکن اندو نے ایسا کچھ نہ کیا، جیسے پچھلے کئی سالوں سے وہ بھی اسی لمحے کی منتظر ہو۔ اور کسی خیالی بھینس کے سونگھتے رہنے سے اسے بھی نیند نہ آ رہی ہو۔ غائب نیند اور بند آنکھوں کا کرب اندھیرے کے باوجود سامنے پھڑپھڑاتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ٹھوڑی تک پہنچتے ہوئے عام طور پر چہرہ لمبوترا ہو جاتا ہے۔ لیکن یہاں تو سبھی گول تھا۔ شاید اسی لیے چاندنی کی طرف گال اور ہونٹوں کے بیچ ایک سایہ دار کھوہ سی بنی ہوئی تھی، جیسی دو سرسبز اور شاداب ٹیلوں کے بیچ ہوتی ہے۔ ماتھا کچھ تنگ تھا لیکن اس پر سے ایکاایکی اٹھنے والے گھنگریالے بال ـــــــ

جبھی اندو نے اپنا چہرہ چھڑا لیا۔ جیسے وہ دیکھنے کی اجازت تو دیتی ہو لیکن اتنی دیر کے لیے نہیں۔ آخر شرم کی بھی تو کوئی حد ہوتی ہے۔ مدن نے ذرا سخت ہاتھوں سے یوں ہی سی ہوں ہاں کرتے ہوئے دلھن کا چہرہ پھر سے اوپر کو اٹھا لیا اور شرابی کی سی آواز میں کہا ـــــ "اندو!"

اندو کچھ ڈر سی گئی۔ زندگی میں پہلی بار کسی اجنبی نے اس کا نام اس انداز سے پکارا تھا اور وہ اجنبی کسی خدائی حق سے رات کے اندھیرے میں آہستہ آہستہ اس اکیلی بے یار و مددگار عورت کا اپنا ہوتا جا رہا تھا۔ اندو نے پہلی بار ایک نظر اوپر دیکھتے ہوئے پھر آنکھیں بند کر لیں اور اتنا سا کہا ـــــ "جی" ـــــ اسے خود اپنی آواز کسی پاتال سے آتی ہوئی سنائی دی۔

دیر تک کچھ ایسا ہی ہوتا رہا اور پھر ہولے ہولے بات چل نکلی۔ اب جو چلی سو چلی۔ وہ تھمنے ہی میں نہ آتی تھی۔ اندو کے پتا، اندو کی ماں، اندو کے بھائی، مدن کے بھائی بہن، باپ، ان کی ریلوے میل سروس کی نوکری، ان کے مزاج، کپڑوں کی پسند، کھانے کی عادت سبھی کچھ کا جائزہ لیا جانے لگا۔ بیچ بیچ میں مدن بات چیت کو توڑ کر کچھ اور ہی کرنا چاہتا تھا لیکن اندو طرح دے جاتی تھی۔ انتہائی مجبوری اور لاچاری میں مدن نے اپنی ماں کا ذکر چھیڑ دیا جو اسے سات سال کی عمر میں چھوڑ کر دق کے عارضے سے چلتی بنی تھی۔ "جتنی دیر زندہ رہی بچاری" مدن نے کہا۔ "بابوجی کے ہاتھ میں دوائی کی شیشیاں ہی رہیں۔ ہم اسپتال کی سیڑھیوں پر اور چھوٹا پاشی گھر میں چیونٹیوں کے بل پر سوتے رہے اور آخر ایک دن ـــــ ۲۸ مارچ کی شام ـــــ" اور مدن چپ ہو گیا۔ چند ہی لمحوں میں وہ رونے سے ذرا ادھر اور گھگھی سے ذرا اُدھر پہنچ گیا۔ اندو نے گھبرا کر مدن کا سر اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ اس رونے نے پل بھر میں اندو کو بھی اپنے پن سے ادھر اور بیگانے پن سے اُدھر پہنچا دیا تھا ـــــ مدن اندو کے بارے میں کچھ اور بھی جاننا چاہتا تھا لیکن اندو نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے اور کہا ـــــ "میں تو پڑھی لکھی نہیں ہوں جی۔ پر میں نے ماں باپ دیکھے ہیں، بھائی اور بھابیاں دیکھی ہیں، بیسیوں اور لوگ دیکھے ہیں۔ اس لیے میں کچھ سمجھتی بوجھتی ہوں ـــــ میں اب تمھاری ہوں۔ اپنے بدلے میں تم سے ایک ہی چیز مانگتی ہوں۔"

روتے وقت اور اس کے بعد بھی ایک نشہ سا تھا۔ مدن نے کچھ بے صبری اور کچھ دریادلی کے ملے جلے شبدوں میں کہا۔

"کیا مانگتی ہو؟ تم جو بھی کہوگی میں دوں گا۔"

"پکّی بات؟" اندو بولی۔

مدن نے کچھ اتاولے ہو کر کہا ——— "ہاں، ہاں ——— کہا جو پکّی بات۔"

لیکن اس بیچ میں مدن کے من میں ایک وسوسہ آیا ——— میرا کاروبار پہلے ہی مندا ہے اگر اندو کوئی ایسی چیز مانگ لے جو میری پہنچ ہی سے باہر ہو تو پھر کیا ہوگا؟ لیکن اندو نے مدن کے سخت اور پھیلے ہوئے ہاتھوں کو اپنے ملائم ہاتھوں میں سمیٹتے اور ان پر اپنے گال رکھتے ہوئے کہا،

"تم اپنے دُکھ مجھے دے دو۔"

مدن سخت حیران ہوا۔ ساتھ ہی اُسے اپنے آپ پر سے ایک بوجھ بھی اترتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے پھر چاندنی میں ایک بار اندو کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ نہ جان پایا۔ اس نے سوچا یہ ماں یا کسی سہیلی کا رٹا ہوا فقرہ ہوگا جو اندو نے کہہ دیا۔ جبھی ایک جلتا ہوا آنسو مدن کے ہاتھ کی پشت پر گرا۔ اس نے اندو کو اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا "دیے۔" لیکن ان سب باتوں نے مدن سے اس کی بہیمیت چھین لی تھی۔

مہمان ایک ایک کر کے سب رخصت ہوئے۔ چکلی بھابی دو بچّوں کو انگلیوں سے لگائے سیڑھیوں کی اونچ نیچ سے تیسرا پیٹ سنبھالتی ہوئی چل دی۔ دریاآباد والی پھوپی جو اپنے نو لکھے ہار کے گم ہو جانے پر شور مچاتی، واویلا کرتی ہوئی بے ہوش ہو گئی تھی اور جو غسل خانے میں پڑا مل گیا تھا، جہیز میں سے اپنے حصّے کے تین کپڑے لے کر چلی گئی۔ پھر چاچا گئے جن کو ان کے جے پی ہونے کی خبر تار کے ذریعے سے مل گئی تھی جو شاید بدحواسی میں مدن کی بجائے دلھن کا منہ چومنے چلے تھے۔

گھر میں بوڑھا باپ رہ گیا تھا اور چھوٹے بہن بھائی۔ چھوٹی دلاری تو ہر وقت

بھابی کی بغل ہی میں گھسی رہتی۔ گلی محلّے کی کون سی عورت دلھن کو دیکھے یا نہ دیکھے، دیکھے تو کتنی دیر دیکھے، یہ سب اس کے اختیار میں تھا۔ آخر یہ سب ختم ہوا اور اندو آہستہ آہستہ پرانی ہونے لگی لیکن کالکا جی کی اس نئی آبادی کے لوگ آج بھی آتے جاتے مدن کے سامنے رک جاتے اور کسی بھی بہانے سے اندر چلے آتے۔ اندو انھیں دیکھتے ہی ایک دم گھونگھٹ کھینچ لیتی لیکن اس چھوٹے سے وقفے میں انھیں جو کچھ دکھائی دے جاتا وہ بنا گھونگھٹ کے دکھائی ہی نہ دے سکتا تھا۔

مدن کا کاروبار گندے بروزے کا تھا۔ کہیں بڑی سپلائی والے دو تین جنگلوں میں چیڑ اور دیودار کے پیڑوں کو جنگل کی آگ نے آلیا تھا اور وہ دھڑ دھڑ جلتے ہوئے خاک سیاہ ہو کر رہ گئے تھے۔ میسور اور آسام کی طرف سے منگوایا ہوا بروزہ مہنگا پڑتا تھا اور لوگ اسے مہنگے داموں خریدنے پر تیار نہ تھے۔ ایک تو آمدنی کم ہو گئی تھی۔ اس پر مدن جلد ہی دکان اور اس کے ساتھ والا دفتر بند کر کے گھر چلا آتا ——— گھر پہنچ کر اس کی ساری کوشش یہی ہوتی کہ سب کھائیں پییں اور اپنے اپنے بستروں میں دُبک جائیں۔ جبھی وہ کھاتے وقت خود تھالیاں اٹھا اٹھا کر باپ اور بہن کے سامنے رکھتا اور ان کے کھا چکنے کے بعد جھوٹے برتنوں کو سمیٹ کر نل کے نیچے رکھ دیتا۔ سب سمجھتے بہو ——— بھابی نے مدن کے کان میں کچھ پھونکا ہے اور آج وہ گھر کے کام کاج میں دلچسپی لینے لگا ہے۔ مدن سب سے بڑا تھا۔ کندن اس سے چھوٹا اور پاشی سب سے چھوٹا۔ جب کندن بھابی کے سواگت میں سب کے ایک ساتھ بیٹھ کر کھانے پر اصرار کرتا تو باپ دھنی رام وہیں ڈانٹ دیتا ——— "کھاؤ تم" ——— وہ کہتا۔ "وہ بھی کھا لیں گے" اور پھر رسوئی میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا اور جب بہو کھانے پینے سے فارغ ہو جاتی اور برتنوں کی طرف متوجہ ہوتی تو بابو دھنی رام اسے روکتے ہوئے کہتے "رہنے دو بہو برتن صبح ہو جائیں گے۔" اندو کہتی "نہیں بابوجی، میں ابھی کیے دیتی ہوں" جھپاکے سے۔ تب بابو دھنی رام ایک لرزتی ہوئی آواز میں کہتے ——— "مدن کی ماں ہوتی بہو، تو یہ سب تمھیں کرنے دیتی؟" ——— اور اندو ایک دم اپنے ہاتھ روک لیتی۔

چھوٹا پاشی بھابی سے شرماتا تھا۔ اس خیال سے کہ دلھن کی گود جھٹ سے ہری ہو، چُلبلی بھابی اور دریاآباد والی پھوپی نے ایک رسم میں پاشی ہی کو اندو کی گود میں ڈالا تھا۔ جب سے اندو اسے نہ صرف دیور، بلکہ اپنا بچہ سمجھنے لگی تھی۔ جب بھی وہ پیار سے پاشی کو اپنے بازوؤں میں لینے کی کوشش کرتی تو وہ گھبرا اٹھتا اور اپنا آپ چھڑا کر دو ہاتھ کی دوری پر کھڑا ہو جاتا، دیکھتا اور ہنستا، پاس آتا نہ دور ہٹتا۔ ایک عجیب اتفاق سے، ایسے میں بابو جی ہمیشہ وہیں موجود ہوتے اور پاشی کو ڈانٹتے ہوئے کہتے —— "ارے جانا —— بھابی پیار کرتی ہے، ابھی سے مرد ہو گیا ہے تو؟" —— اور دلاری تو پیچھا ہی نہ چھوڑتی۔ اس کے "میں تو بھابی کے ساتھ ہی سوؤں گی" کے اصرار نے بابو جی کے اندر کوئی جنار دھن جگا دیا تھا۔ ایک رات اسی بات پر دلاری کو زور سے چپت پڑی اور وہ گھر کی آدھی کچی آدھی پکی نالی میں جا گری۔ اندو نے لپکتے ہوئے پکڑا تو سر پر سے دوپٹا اڑ گیا بالوں کے پھول اور چڑیاں، مانگ کا سیندور، کانوں کے کرن پھول سب ننگے ہو گئے۔ "بابو جی!" اندو نے سانس کھینچتے ہوئے کہا —— ایک ساتھ دلاری کو پکڑنے اور سر پر دوپٹا اوڑھنے میں اندو کے پسینے چھوٹ گئے۔ اس بے ماں کی بچی کو چھاتی کے ساتھ لگائے ہوئے اندو نے اسے ایک بستر میں سلا دیا جہاں سرہانے ہی سرہانے، تکیے ہی تکیے تھے۔ نہ کہیں پائنتی تھی نہ کاٹھ کے بازو۔ چوٹ تو ایک طرف، کہیں کوئی چبھنے والی چیز بھی نہ تھی۔ پھر اندو کی انگلیاں دلاری کے پھوڑے ایسے سر پر چلتی ہوئی اسے دکھا بھی رہی تھیں، اور مزا بھی دے رہی تھیں۔ دلاری کے گالوں پر بڑے بڑے اور پیارے سے گڑھے پڑتے تھے۔ اندو نے ان گڑھوں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا —— "ہائے ری منّی! تیری ساس مرے۔ کیسے گڑھے پڑ رہے ہیں تیرے گالوں پر ——!" منّی نے منّی ہی کی طرح کہا، "گڑھے تمھارے بھی تو پڑتے ہیں بھابی!"

"ہاں منّو!" اندو نے کہا اور ایک ٹھنڈا سا سانس لیا۔

مدن کو کسی بات پر غصہ تھا۔ وہ پاس ہی کھڑا سب کچھ سن رہا تھا۔ بولا —— "میں تو کہتا ہوں ایک طرح سے اچھا ہی ہے۔"

"کیوں، اچھا کیوں ہے؟" اندو نے پوچھا ——

"ہاں۔ نہ آگے بانس نہ بجے بانسری —— ساس نہ ہو تو کوئی جھگڑا ہی نہیں رہتا۔" اندو نے ایکا ایکی خفا ہوتے ہوئے کہا —— "تم جاؤ جی سو رہو جا کے، بڑے آئے ہو —— آدمی جیتا ہے تو لڑتا ہے نا؟ مرگھٹ کی چپ چاپ سے جھگڑے بھلے۔ جاؤ نا، رسوئی میں تمھارا کیا کام؟"

مدن کھسیانا ہو کر رہ گیا۔ بابو دھنی رام کی ڈانٹ سے باقی بچے تو پہلے ہی سے اپنے اپنے بستروں میں یوں جا پڑے تھے جیسے ڈاک گھر میں چٹھیاں سارٹ ہوتی ہیں، لیکن مدن وہیں کھڑا رہا۔ احتیاج نے اسے ڈھیٹ اور بے شرم بنا دیا تھا لیکن اس وقت جب اندو نے بھی اسے ڈانٹ دیا تو وہ روبانسا ہو کر اندر چلا گیا۔

دیر تک مدن بستر میں پڑا کسمساتا رہا۔ لیکن بابو جی کے خیال سے اندو کو آواز دینے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اس کی بے صبری کی حد ہو گئی جب منّی کو سلانے کے لیے اندو کی لوری سنائی دی: "تو آ نندیا رانی، بورائی مستانی۔"

وہی لوری جو دلاری منّی کو سلا رہی تھی، مدن کی نیند بھگا رہی تھی۔ اپنے آپ سے بیزار ہو کر اس نے زور سے چادر کھینچ لی۔ سفید چادر کے سر پر لینے اور سانس کے بند کرنے سے خواہ مخواہ ایک مردے کا تصور پیدا ہو گیا۔ مدن کو یوں لگا جیسے وہ مر چکا ہے اور اس کی دلھن اندو اس کے پاس بیٹھی زور زور سے سر پیٹ رہی ہے، دیوار کے ساتھ کلائیاں مار مار کر چوڑیاں توڑ رہی ہے، اور پھر گرتی پڑتی، روتی چلاتی رسوئی میں جاتی ہے اور چولھے کی راکھ سر پر ڈال لیتی ہے، پھر باہر لپک جاتی ہے اور باہیں اٹھا اٹھا کر گلی محلے کے لوگوں سے فریاد کرتی ہے —— "لوگو! میں لٹ گئی۔" اب اسے دوپٹے کی پروا نہیں، قمیص کی پروا نہیں، مانگ کا سیندور، بالوں کے پھول اور چڑیاں سب ننگے ہو چکے ہیں، جذبات اور خیالات کے توتے تک اڑ چکے ہیں۔

مدن کی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو بہہ رہے تھے۔ حالانکہ رسوئی میں اندو ہنس رہی تھی۔ پل بھر میں اپنے سہاگ کے اجڑنے اور پھر بس جانے سے بے خبر ——

مدن جب حقائق کی دنیا میں آیا تو آنسو پونچھتے ہوئے اپنے اس رونے پر ہنسنے لگا ـــــــ ادھر اندو ہنس تو رہی تھی لیکن اس کی ہنسی دبی دبی تھی۔ بابو جی کے خیال سے وہ کبھی اونچی آواز میں نہ ہنستی تھی، جیسے کھلکھلاہٹ کوئی ننگا پن ہے، خاموشی دوپٹا اور دبی ہنسی ایک گھونگھٹ۔ پھر مدن نے اندو کا ایک خیالی بت بنایا اور اس سے بیسیوں باتیں کر ڈالیں۔ یوں اس سے پیار کیا جیسے ابھی تک نہ کیا تھا ـــــــ وہ پھر اپنی دنیا میں لوٹا جس میں ساتھ کا بستر خالی تھا۔ اس نے ہولے سے آواز دی "اندو" ـــــ اور پھر چپ ہو گیا۔ اس ادھیڑ بن میں وہ بورانی مستانی ندیا اس سے بھی لپٹ گئی۔ ایک اونگھ سی آئی لیکن ساتھ ہی یوں لگا جیسے شادی کی رات والی پڑوسی بسطے کی بھینس منہ کے پاس پھنکارنے لگی ہے۔ وہ ایک بے کلی کے عالم میں اٹھا، پھر رسوئی کی طرف دیکھتے، سر کو کھجاتے دو تین جماہی لے کر لیٹ گیا ـــــــ سو گیا۔

مدن جیسے کانوں کو کوئی سندیسا دے کر سویا تھا۔ جب اندو کی چوڑیاں بستر کی سلوٹیں درست کرنے کے لیے کھنک اٹھیں تو وہ بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ یوں ایک دم جاگنے میں محبت کا جذبہ اور بھی تیز ہو گیا تھا۔ پیار کی کروٹوں کو توڑے بغیر آدمی سو جائے اور ایکا ایکی اٹھے تو محبت دم توڑ دیتی ہے۔ مدن کا سارا بدن اندر کی آگ سے پھنک رہا تھا اور یہی اس کے غصے کا کارن بن گیا جب اس نے کچھ بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا ـــ

"سو تم ـــــ آ گئیں؟"

"ہاں!"

"منی ـــــــ سو مر گئی؟"

اندو جھکی جھکی ایک دم سیدھی کھڑی ہو گئی ـــــــ "ہائے رام!" اس نے ناک پر انگلی رکھتے، ہاتھ ملتے ہوئے کہا ـــــــ "کیا کہہ رہے ہو؟ ـــــ مرے کیوں بے چاری؟ ـــــ ماں باپ کی ایک ہی بیٹی!"

"ہاں! ـــــ" مدن نے کہا: "بھابی کی ایک ہی نند۔" اور پھر ایک دم تحکمانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولا ـــــــ "زیادہ منہ مت لگاؤ اس چڑیل کو۔"

"کیوں، اس میں کیا پاپ ہے؟"

"یہی پاپ ہے" مدن نے اور چڑتے ہوئے کہا "پیچھا ہی نہیں چھوڑتی تمھارا۔ جب دیکھو جونک کی طرح چمٹی ہوئی ہے، دفان ہی نہیں ہوتی۔"

"ہا ـــــــ" اندو نے مدن کی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا: "بہنوں اور بیٹیوں کو یوں تو دھتکارنا نہیں چاہیے۔ بچاری دو دن کی مہمان۔ آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں ایک دن چل ہی دے گی۔" اس کے بعد اندو کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن وہ چپ ہو گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اپنی ماں، باپ، بھائی بہن، چچا، تایا سبھی گھوم گئے۔ کبھی وہ بھی ان کی دلاری تھی جو پلک جھپکتے ہی نیاری ہو گئی اور پھر دن رات اس کے نکالے جانے کی باتیں ہونے لگیں، جیسے گھر میں کوئی بڑی سی بانبی ہے جس میں کوئی ناگن رہتی ہے۔ اور جب تک وہ پکڑ کر پھنکوائی نہیں جاتی گھر کے لوگ آرام کی نیند سو نہیں سکتے۔ دور دور سے کیلنے والے، نتھن کرنے والے، دانت، پھوڑنے والے ماندری بلوائے گئے۔ بڑے بڑے دھنونتری اور موتی ساگر ـــــ آخر ایک دن اتر پچھم کی طرف سے لال آندھی آئی جو صاف ہوئی تو ایک لاری کھڑی تھی جس میں گوٹے کناری میں لپٹی ہوئی ایک دلھن بیٹھی تھی۔ پیچھے گھر میں، ایک سر پر بجتی ہوئی شہنائی بین کی آواز معلوم ہو رہی تھی۔ پھر ایک دھچکے کے ساتھ لاری چل دی ـــــــــــ

مدن نے کچھ برافروختگی کے عالم میں کہا ـــــــ "تم عورتیں بڑی چالاک ہوتی ہو ابھی کل ہی اس گھر میں آئی ہو اور یہاں کے سب لوگ تمھیں ہم سے زیادہ پیارے لگنے لگے؟"

"ہاں!" اندو نے اثبات سے کہا۔

"یہ سب جھوٹ ہے ـــــ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔"

"تمھارا مطلب ہے میں ـــــــ"

"دکھاوا ہے یہ سب ـــــ ہاں!"

"اچھا جی؟" اندو نے آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے کہا: "یہ سب دکھاوا ہے میرا؟" اور اندو اٹھ کر اپنے بستر پر چلی گئی اور سرھانے میں منہ چھپا کر سسکیاں بھرنے

لگی۔ مدن اُسے منانے ہی والا تھا کر اندو خود ہی اٹھ کر مدن کے پاس آگئی اور سختی سے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی ——— "تم جو ہر وقت جلی کٹی کہتے رہتے ہو ——— ہوا کیا ہے تمھیں؟"

شوہرانہ رعب داب کے لیے مدن کے ہاتھ بہانہ آگیا ——— "جاؤ جاؤ ——— سو جاؤ جا کے" مدن نے کہا ——— "مجھے تم سے کچھ نہیں لینا۔"

"تمھیں کچھ نہیں لینا، مجھے تو لینا ہے؟" اندو بولی: "زندگی بھر لینا ہے" اور وہ چھینا جھپٹی کرنے لگی۔ مدن اسے دھتکارتا تھا اور وہ اسے لپٹ لپٹ جاتی تھی۔ وہ اس مچھلی کی طرح تھی جو بہاؤ میں بہہ جانے کی بجائے آبشار کے تیز دھارے کو کاٹتی ہوئی اوپر ہی اوپر پہنچنا چاہتی ہے۔ چٹکیاں لیتی، ہاتھ پکڑتی، روتی ہنستی وہ کہہ رہی تھی ———

"پھر مجھے، پھاپھا کٹنی کہو گے؟"

"وہ تو سبھی عورتیں ہوتی ہیں۔"

"ٹھہرو ——— تمھاری تو ———" یوں معلوم ہوا جیسے اندو کوئی گالی دینے والی ہو۔ اور اس نے منہ میں کچھ منمنایا بھی۔ مدن نے تڑتے ہوئے کہا ——— "کیا کہا؟" اور اندو نے اب کے سنائی دینے والی آواز میں دہرادیا۔ مدن کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ اگلے ہی لمحے اندو مدن کے بازوؤں میں تھی اور کہہ رہی تھی ———

"تم مرد لوگ کیا جانو؟ ——— جس سے پیار ہوتا ہے اس کے سبھی چھوٹے بڑے پیارے معلوم ہوتے ہیں۔ کیا باپ، کیا بھائی اور کیا بہن" اور پھر ایکا ایکی دور دیکھتی ہوئی بولی۔

"میں تو دلاری منّی کا بیاہ کروں گی۔"

"حد ہوگئی" مدن نے کہا "ابھی ایک ہاتھ کی ہوئی نہیں اور بیاہ کی بھی سوچنے لگیں؟"

"تمھیں ایک ہاتھ کی دکھتی ہے نا؟" اندو بولی اور پھر اپنے دونوں ہاتھ مدن کی آنکھوں پر رکھتی ہوئی کہنے لگی ——— "ذرا آنکھیں بند کرو اور پھر کھولو ———" مدن نے سچ مچ ہی آنکھیں بند کرلیں اور پھر جب کچھ دیر تک نہ کھولیں تو اندو بولی ——— "اب کھولو بھی، اتنی دیر میں تو میں بوڑھی ہو جاؤں گی ———" جبھی مدن نے آنکھیں

کھولیں۔ لمحہ بھر کے لیے اُسے یوں لگا جیسے سامنے اندو نہیں، کوئی اور بیٹھی ہے۔ وہ کھو سا گیا۔

"میں نے تو ابھی سے چار سوٹ اور کچھ برتن الگ کر ڈالے ہیں اس کے لیے۔" اندو نے کہا اور جب مدن نے کوئی جواب نہ دیا تو اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولی ——— "تم کیوں پریشان ہوتے ہو؟ ——— یاد نہیں اپنا وچن؟ ——— تم اپنے دُکھ مجھے دے چکے ہو۔"

"ایں؟" مدن نے چونکتے ہوئے کہا اور جیسے بے فکر سا ہوگیا لیکن اب کے جب اس نے اندو کو اپنے ساتھ لپٹایا تو وہ ایک جسم ہی نہیں رہ گیا تھا، ساتھ ساتھ ایک روح بھی شامل ہوگئی تھی۔

مدن کے لیے اندو روح ہی روح تھی۔ اندو کے جسم بھی تھا لیکن وہ ہمیشہ کسی نہ کسی وجہ سے مدن کی نظروں سے اوجھل ہی رہا۔ ایک پردہ تھا۔ خواب کے تاروں سے بنا ہوا، آہوں کے دھوئیں سے رنگین، قہقہوں کی زرتاری سے چکاچوند، جو ہر وقت اندو کو ڈھانپے رہتا تھا۔ مدن کی نگاہیں اور اس کے ہاتھوں کے دوشاسن صدیوں سے اس دروپدی کا چیر ہرن کرتے آئے تھے جو کہ عرفِ عام میں بیوی کہلاتی ہے لیکن ہمیشہ اسے آسمانوں سے تھانوں کے تھان، گزوں کے گز کپڑا ننگاپن ڈھانپنے کے لیے ملتا آیا تھا۔ دوشاسن تھک ہار کے یہاں وہاں گرے پڑے تھے لیکن دروپدی وہیں کھڑی تھی۔ عزت اور پاکیزگی کی سفید ساری میں ملبوس وہ دیوی لگ رہی تھی اور ——— مدن کے لوٹتے ہوئے ہاتھ خجالت کے پسینے سے تر ہوتے جنھیں سکھانے کے لیے وہ انھیں اوپر ہوا میں اٹھا دیتا اور پھر ہاتھ کے پنجوں کو پورے طور پر پھیلاتا ہوا ایک تشنج کیفیت میں اپنی آنکھوں کی پھیلتی پھٹتی ہوئی پتلیوں کے سامنے رکھ دیتا۔ اور پھر انگلیوں کے بیچ میں سے جھانکتا ——— اندو کا مرمریں جسم، خوش رنگ اور گداز سامنے پڑا ہوتا۔ استعمال کے لیے پاس، ابتذال کے لیے دور ——— کبھی اندو کی ناکہ بندی

ہو جاتی تو اس قسم کے فقرے ہوتے ———

"ہائے جی! گھر میں چھوٹے بڑے سبھی ہیں، وہ کیا کہیں گے؟"

مدن کہتا۔ ——— "چھوٹے سمجھتے نہیں، بڑے سمجھ جاتے ہیں ———"

اسی دوران میں بابو دھنی رام کی تبدیلی سہارنپور ہو گئی۔ وہاں وہ ریلوے میل سروس میں سلیکشن گریڈ کے ہیڈ کلرک ہو گئے۔ اتنا بڑا کوارٹر ملا کہ اس میں آٹھ کنبے رہ سکتے تھے لیکن بابو دھنی رام اس میں اکیلے ہی ٹانگیں پھیلائے پڑے رہتے۔ زندگی بھر وہ بال بچوں سے کبھی علاحدہ نہیں ہوئے تھے۔ سخت گھریلو قسم کے آدمی، آخری زندگی میں اس تنہائی نے ان کے دل میں وحشت پیدا کر دی لیکن مجبوری تھی۔ بچے سب دلّی میں مدن اور اندو کے پاس تھے اور وہیں اسکولوں میں پڑھتے تھے۔ سال کے خاتمے سے پہلے انھیں بیچ میں سے اٹھانا ان کی پڑھائی کے لیے اچھا نہ تھا۔ بابو جی کو دل کے دورے پڑنے لگے۔

بارے گرمی کی چھٹیاں ہوئیں اور ان کے بار بار لکھنے پر مدن نے اندو کو کندن، پاشی اور دلاری کے ساتھ سہارنپور بھیج دیا۔ دھنی رام کی دنیا چہک اٹھی۔ کہاں انھیں دفتر کے کام کے بعد فرصت ہی فرصت تھی اور کہاں اب کام ہی کام تھا۔ بچے، بچوں ہی کی طرح، جہاں کپڑے اتارتے وہیں پڑے رہنے دیتے اور بابو جی انھیں سمیٹتے پھرتے۔ اپنے مدن سے دور، السائی ہوئی رتی، اندو تو اپنے پہناوے تک سے غافل ہو گئی تھی۔ وہ رسوئی میں یوں پھرتی تھی جیسے کانجی ہاؤس میں گائے باہر کی طرف منہ اٹھا اٹھا کر اپنے مالک کو ڈھونڈا کرتی ہے۔ کام دھام کرنے کے بعد وہ کبھی اندر ٹرنکوں پر لیٹ جاتی۔ کبھی باہر کنیر کے بوٹے کے پاس اور کبھی آم کے پیڑ تلے، جو آنگن میں سیکڑوں ہزاروں دلوں کو تھامے کھڑا تھا۔

ساون بھادوں میں ڈھلنے لگا۔ آنگن میں سے باہر کا دریچہ کھلتا تو کنواریاں،

نئی بیاہی ہوئی لڑکیاں پینگ بڑھاتے ہوئے گاتیں۔ جھولا کن نے ڈارو رے امریاں، اور پھر گیت کے بول کے مطابق دو جھولتیں اور دو جھلاتیں اور کہیں چار مل جاتیں تو بھول بھلیاں ہو جاتیں۔ ادھیڑ عمر کی اور بوڑھی عورتیں ایک طرف کھڑی تکا کرتیں۔ اندو کو معلوم ہوتا جیسے وہ بھی ان میں شامل ہو گئی ہے۔ جبھی وہ منہ پھیر لیتی اور ٹھنڈی سانسیں بھرتی ہوئی سو جاتی۔ بابو جی پاس سے گزرتے تو اسے جگانے اور اٹھانے کی ذرا بھی کوشش نہ کرتے بلکہ موقع پا کر اس کی شلوار کو، جو بہو دھوتی سے بدل آتی اور جسے وہ ہمیشہ اپنی ساس والے پرانے صندل کے صندوق پر پھینک دیتی، اٹھا کر کھونٹی پر لٹکا دیتے۔ ایسے میں انھیں سب سے نظریں بچانا پڑتیں لیکن ابھی شلوار کو سمیٹ کر ہٹتے، تو نگاہ نیچے کونے میں بہو کے محرم پر جا پڑتی تب ان کی ہمت جواب دے جاتی اور وہ یوں شتابی کمرے سے نکل بھاگتے جیسے کہیں سانپ کا بچہ بل سے باہر آ گیا ہو پھر برآمدے میں ان کی آواز سنائی دینے لگتی۔ اوم نمو بھگوتے واسو دیوا ———

اڑوس پڑوس کی عورتوں نے بابو جی کی بہو کی خوبصورتی کی داستانیں دور دور تک پہنچا دی تھیں۔ جب کوئی عورت بابو جی کے سامنے بہو کے پیارے پن اور سڈول جسم کی باتیں کرتی تو وہ خوشی سے پھول جاتے اور کہتے ——— "ہم تو دھنیہ ہو گئے، امی چند کی ماں! شکر ہے ہمارے گھر میں بھی کوئی صحت والا جیو آیا" اور یہ کہتے ہوئے ان کی نگاہیں کہیں دور، پہنچ جاتیں جہاں دق کے عارضے تھے۔ دوائی کی شیشیاں، اسپتال کی سیڑھیاں یا چیونٹیوں کے بل۔ نگاہ قریب آتی تو انھیں موٹے موٹے گدرائے ہوئے جسم والے کئی بچے بغل میں، جانگھ پر، گردن پر چڑھتے اترتے ہوئے محسوس ہوتے اور ایسا معلوم ہوتا جیسے ابھی اور آ رہے ہیں۔ پہلو پر لیٹی ہوئی بہو کی کمر زمین کے ساتھ اور کولھے چھت کے ساتھ لگ رہے ہیں اور وہ دھڑا دھڑ بچے جنتی جا رہی ہے اور ان بچوں کی عمر میں کوئی فرق نہیں۔ کوئی بڑا ہے نہ چھوٹا، سبھی ایک سے جڑواں ——— توام ——— اوم نمو بھگوتے ———

آس پاس کے لوگ سب جان گئے تھے اندو بابو جی کی چہیتی بہو ہے۔ چنانچہ

دودھ اور چھاچھ کے مٹکے دھنی رام کے گھر آنے لگے اور پھر ایک دن سلام دین گوجر نے فرمائش کر دی۔ اندو سے کہا "بی بی! میرا بیٹا آر۔ایم۔ ایس میں قلی رکھوا دو، اللہ تم کو اجر دے گا"

اندو کے اشارے کی دیر تھی کہ سلام دین کا بیٹا نوکر ہو گیا، وہ بھی سارٹر ——— جو نہ ہو سکا اُس کی قسمت! اسامیاں ہی زیادہ نہ تھیں۔

بہو کے کھانے پینے اور اس کی صحت کا بابو جی خاص خیال رکھتے تھے۔ دودھ پینے سے اندو کو چڑ تھی۔ وہ رات کے وقت خود دودھ کو باٹی میں پھینٹ گلاس میں ڈال، بہو کو پلانے کے لیے اس کی کھٹیا کے پاس آ جاتے۔ اندو اپنے آپ کو سمیٹتے ہوئے اٹھتی اور کہتی ——— "نہیں بابو جی! مجھ سے نہیں پیا جاتا"

"تیرا تو سسر بھی پیے گا" وہ مذاق سے کہتے۔

"تو پھر آپ پی لیجیے نا" اندو ہنستی ہوئی جواب دیتی اور بابو جی ایک مصنوعی غصّے سے برس پڑتے ——— "تو چاہتی ہے بعد میں تیری بھی وہی حالت ہو جو تیری ساس کی ہوئی؟"

"ہوں ——— ہوں ———" اندو لاڈ سے روٹھنے لگتی۔ آخر کیوں نہ روٹھتی۔ وہ لوگ نہیں روٹھتے جنھیں منانے والا کوئی نہ ہو۔ لیکن یہاں تو منانے والے سب تھے، روٹھنے والا صرف ایک۔ جب اندو بابو جی کے ہاتھ سے گلاس نہ لیتی تو وہ اسے کھٹیا کے پاس سرہانے کے نیچے رکھ دیتے ——— "اور لے یہ پڑا ہے ——— تیری مرضی ہے پی ——— نہیں مرضی تو نہ پی" ——— کہتے ہوئے چل دیتے۔

اپنے بستر پر پہنچ کر دھنی رام، دلاری منّی کے ساتھ کھیلنے لگتے۔ دلاری کو بابو جی کے ننگے پنڈے کے ساتھ پنڈا گھسانے اور پیٹ پر منہ رکھ کر پھٹکڑا پھلانے کی عادت تھی۔ آج جب بابو جی اور منّی یہ کھیل کھیل رہے تھے، ہنس ہنسا رہے تھے تو منّی نے بھابی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ——— "دودھ تو کھراب ہو جائے گا بابو جی ——— بھابی تو پیتی ہی نہیں"

"پیے گی، ضرور پیے گی بیٹا! ———" بابو جی نے دوسرے ہاتھ سے پاشی کو

لٹاتے ہوئے کہا ——— "عورتیں گھر کی کسی چیز کو خراب ہوتے نہیں دیکھ سکتیں"

ابھی یہ فقرہ بابو جی کے منہ ہی میں ہوتا کہ ایک طرف سے "ہش ——— ہے خصم کھائی" کی آواز آنے لگتی۔ پتا چلتا بہو بلّی کو بھگا رہی ہے ——— اور پھر کوئی غٹ غٹ سی سنائی دیتی اور سب جان لیتے بہو ——— بھابی نے دودھ پی لیا۔ کچھ دیر کے بعد کندن، بابو جی کے پاس آتا اور کہتا ——— "بابو جی ——— بھابی رو رہی ہے"

"ہائیں؟" بابو جی کہتے اور پھر اٹھ کر اندھیرے میں دور اسی طرف دیکھنے لگتے جدھر بہو کی چارپائی پڑی ہوتی۔ کچھ دیر یونہی بیٹھے رہنے کے بعد وہ پھر لیٹ جاتے اور کچھ سمجھتے ہوئے کندن سے کہتے ——— "جا ——— تو سو جا ——— وہ بھی سو جائے گی اپنے آپ"

اور پھر سے لیٹتے ہوئے بابو دھنی رام آسمان پر کھلے ہوئے پرماتما کے گلزار کو دیکھنے لگتے اور اپنے من کے بھگوان سے پوچھتے ——— "چاندی کے ان کھلتے، بند ہوتے ہوئے پھولوں میں میرا پھول کہاں ہے؟" اور پھر پورا آسمان انھیں درد کا ایک دریا دکھائی دینے لگتا اور کانوں میں ایک مسلسل ہا ہو کی آواز سنائی دیتی جسے سنتے ہوئے وہ کہتے ———

"جب سے دنیا بنی ہے انسان کتنا رویا ہے!" اور وہ روتے روتے سو جاتے۔

اندو کے جانے کے بیس پچیس روز ہی میں مدن نے واویلا شروع کر دیا۔ اس نے لکھا۔ میں بازار کی روٹیاں کھاتے کھاتے تنگ آ گیا ہوں، مجھے قبض ہو گیا ہے، گردے کا درد شروع ہو گیا ہے۔ پھر جیسے دفتر کے لوگ چھٹی کی غرضی کے ساتھ ڈاکٹر کا سرٹیفکٹ بھیج دیتے ہیں مدن نے بابو جی کے ایک دوست سے تصدیق کی ہوئی چٹھی لکھوا بھیجی۔ اس پر بھی جب کچھ نہ ہوا تو ایک ڈبل تار ——— جوابی ——— جوابی تار کے پیسے مارے گئے لیکن بلا سے۔ اندو اور بچے لوٹ آئے تھے۔ مدن نے اندو سے دو دن سیدھے منہ بات ہی نہ کی۔ یہ دکھ بھی اندو ہی کا تھا ———

ایک دن مدن کو اکیلے میں پاکر وہ پکڑ بیٹھی اور بولی ـــــ اتنا منہ پھلائے بیٹھے ہو، میں نے کیا کیا ہے؟"
مدن نے اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے کہا ـــــ "چھوڑ ـــــ دور ہو جا میری آنکھوں سے ـ کمینی۔"
"یہی کہنے کے لیے اتنی دور سے بلوایا ہے؟"
"ہاں!"
"ہٹاؤ اب!"
"خبردار ـــــ یہ سب تمھارا کیا دھرا ہے۔ تم جو آنا چاہتیں تو کیا بابوجی روک لیتے؟"
اندو نے بے بسی سے کہا ـــــ "ہائے جی ـــــ تم تو بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ میں بھلا انھیں کیسے کہ سکتی تھی؟ سچ پوچھو تو تم نے مجھے بلوا کر بابوجی پر بڑا ظلم کیا ہے۔"
"کیا مطلب؟"
"مطلب کچھ نہیں ـــــ ان کا جی بہت لگا ہوا تھا بال بچوں میں۔"
"اور میرا جی؟"
"تمھارا جی؟ ـــــ تم تو کہیں بھی لگا سکتے ہو۔" اندو نے شرارت سے کہا، اور کچھ اس طرح سے مدن کی طرف دیکھا کہ اس کی مدافعت کی ساری قوتیں ختم ہو گئیں۔ یوں بھی اسے کسی اچھے سے بہانے کی تلاش تھی۔ اس نے اندو کو پکڑ کر اپنے سینے سے لگا لیا اور بولا ـــــ "بابوجی تم سے بہت خوش تھے؟"
"ہاں!" اندو بولی ـــــ "ایک دن میں جاگی تو دیکھا سرہانے کھڑے مجھے دیکھ رہے ہیں۔"
"یہ نہیں ہو سکتا۔"
"اپنی قسم!"
"اپنی نہیں، میری قسم کھاؤ۔"
"تمھاری قسم تو میں نا کھاتی ـــــ کوئی کچھ بھی دے۔"
"ہاں!" مدن نے سوچتے ہوئے کہا۔ "کتابوں میں اسے سیکس کہتے ہیں۔"
"سیکس؟" اندو نے پوچھا۔ "وہ کیا ہوتا ہے؟"
"وہی جو مرد اور عورت کے بیچ ہوتا ہے۔"

"ہائے رام!" اندو نے ایک دم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ "گندے کہیں کے ـــــ شرم نہیں آئی بابوجی کے بارے میں ایسا سوچتے ہوئے؟"
"بابوجی کو شرم نہ آئی تجھے دیکھتے ہوئے؟"
"کیوں؟" اندو نے بابوجی کی طرفداری کرتے ہوئے کہا۔ "وہ اپنی بہو کو دیکھ کر خوش ہو رہے ہوں گے۔"
"کیوں نہیں۔ جب بہو تم ایسی ہو۔"
"تمھارا من گندا ہے۔" اندو نے نفرت سے کہا۔ "اسی لیے تو تمھارا کاروبار بھی گندے بروزے کا ہے۔ تمھاری کتابیں سب گندگی سے بھری پڑی ہیں۔ تمھیں اور تمھاری کتابوں کو اس کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ ایسے تو جب میں بڑی ہو گئی تھی تو میرے پتا جی نے مجھ سے ادھک پیار کرنا شروع کر دیا تھا تو کیا وہ بھی ـــــ وہ تھا نگوڑا ـــــ جس کا تم ابھی نام لے رہے تھے؟" اور پھر اندو بولی۔ "بابوجی کو یہاں بلا لو۔ ان کا وہاں جی بھی نہیں لگتا۔ وہ دکھی ہوں گے تو کیا تم دکھی نہیں ہو گے؟"
مدن اپنے باپ سے بہت پیار کرتا تھا۔ اسے اچھی طرح سے یاد تھا۔ ماں کے بیمار رہنے کے باعث جب بھی اس کی موت کا خیال مدن کے دل میں آتا تو وہ آنکھیں موند کر پرارتھنا شروع کر دیتا ـــــ اوم نمو بھگوتے واسودیوا۔ اوم نمو ـــــ اب وہ نہیں چاہتا تھا کہ باپ کی چھتر چھایا بھی سر سے اٹھ جائے۔ خاص طور پر ایسے میں جب کہ وہ اپنے کاروبار کو بھی جما نہیں پایا تھا۔ اس نے غیر یقینی لہجے میں اندو سے صرف اتنا کہا ـــــ "ابھی رہنے دو بابوجی کو۔ شادی کے بعد ہم دونوں پہلی بار آزادی کے ساتھ مل سکے ہیں۔"
تیسرے چوتھے روز بابوجی کا آنسوؤں میں ڈوبا ہوا خط آیا۔ میرے پیارے مدن کے تخاطب میں میرے پیارے کے الفاظ شوربا پانی میں دھل گئے تھے۔ لکھا تھا ـــــ "بہو کے یہاں ہونے پر میرے تو وہی پرانے دن لوٹ آنے تھے ـــــ تمھاری ماں کے دن، جب ہماری نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ تو وہ بھی ایسی ہی الھڑ تھی۔ ایسے ہی اتارے ہوئے کپڑے ادھر ادھر پھینک دیتی اور پتا جی سمیٹتے پھرتے۔ وہی صندل

کا صندوق، وہی بیسیوں خلجگن ــــ میں بازار جا رہا ہوں، کچھ نہیں تو وہی بڑے یا رِبڑی لا رہا ہوں۔ اب گھر میں کوئی نہیں۔ وہ جگہ جہاں صندل کا صندوق پڑا تھا، خالی ہے ــــ" اور پھر ایک آدھ سطر اور دھل گئی تھی۔ آخر میں لکھا تھا ــــ دفتر سے لوٹتے سمے یہاں کے بڑے بڑے اندھے کمروں میں داخل ہوتے ہوئے میرے من میں ایک ہول سا اٹھتا ہے ــــ اور پھر ــــ" بہو کا خیال رکھنا، سے کسی ایسی ویسی دایہ کے حوالے مت کرنا۔"

اندو نے دونوں ہاتھوں سے چِٹّھی پکڑ لی، سانس کھینچی، آنکھیں پھیلاتی، شرم سے پانی پانی ہوتے ہوئے بولی ــــ "میں مر گئی، بابوجی کو کیسے پتا چل گیا؟"

مدن نے چِٹّھی چھڑاتے ہوئے کہا ــــ "بابوجی کیا بچے ہیں ــــ دنیا دیکھی ہے۔ ہمیں پیدا کیا ہے۔"

"ہاں مگر" اندو بولی "ابھی دن ہی کے ہوئے ہیں؟"

اور پھر اس نے ایک تیز سی نظر اپنے پیٹ پر ڈالی جس نے ابھی بڑھنا بھی نہیں شروع کیا تھا اور پھر بابوجی یا کوئی اور دیکھ رہا ہو اس نے ساری کا پلو اس پر کھینچ لیا اور کچھ سوچنے لگی۔ جبھی ایک چمک سی اس کے چہرے پر آئی اور وہ بولی ــــ "تمھاری سسرال سے شیرینی آئے گی۔"

"میری سسرال؟ ــــ اوہاں" مدن نے راستہ پاتے ہوئے کہا ــــ کتنی شرم کی بات ہے۔ ابھی چھ آٹھ مہینے شادی کو ہوئے ہیں اور چلا آیا ہے" اور اس نے اندو کے پیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"چلا آیا ہے یا تم لائے ہو؟"

"تم ــــ یہ سب قصور تمھارا ہے۔ کچھ عورتیں ہوتی ہی ایسی ہیں۔"

"تمھیں پسند نہیں؟"

"ایک دم نہیں۔"

"کیوں؟"

"چار دن تو مزے لے لیتے زندگی کے۔"

"کیا یہ جندگی کا مجا نہیں؟" اندو نے صدمہ زدہ لہجے میں کہا "مرد عورت شادی کس لیے کرتے ہیں؟ بھگوان نے بن مانگے دے دیا نا؟ پوچھو ان سے جن کے نہیں ہوتا۔ پھر وہ کیا کچھ کرتی ہیں؟ پیروں فقیروں کے پاس جاتی ہیں۔ سمادھیوں، مجاروں پر چوٹیاں باندھتی، شرم حیا کو تج کر، دریاؤں کے کنارے ننگی ہو کر سرکنڈے کاٹتی ــــ شمشانوں میں مسان جگاتی ــــ"

"اچھا! اچھا!" مدن بولا ــــ "تم نے بکھان ہی شروع کر دیا۔ اولاد کے لیے تھوڑی عمر پڑی تھی؟"

"ہوگا تو!" اندو نے سرزنش کے انداز میں انگلی اٹھاتے ہوئے کہا ــــ "جب تم اسے ہاتھ بھی مت لگانا۔ وہ تمھارا نہیں میرا ہوگا۔ تمھیں تو اس کی جرورت نہیں پر اس کے دادا کو بہت ہے۔ یہ میں جانتی ہوں۔"

اور پھر کچھ خجل، کچھ صدمہ زدہ ہو کر اندو نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ وہ سوچتی تھی پیٹ میں اس ننھی سی جان کو پا لینے کے سلسلے میں اس جان کا ہوتا سوتا تھوڑی بہت ہمدردی تو کرے گا ہی لیکن مدن چپ چاپ بیٹھا رہا۔ ایک لفظ بھی اس نے منہ سے نہ نکالا۔ اندو نے چہرے پر سے ہاتھ اٹھا کر مدن کی طرف دیکھا اور ہونے والی پہلوٹن کے خاص انداز میں بولی "وہ تو جو کچھ میں کہہ رہی ہوں سب پیچھے ہوگا پہلے تو میں بچوں گی ہی نہیں ــــ مجھے بچپن ہی سے وہم ہے اس بات کا۔"

مدن جیسے خائف ہو گیا۔ یہ "خوبصورت چیز" جو حاملہ ہونے کے بعد اور بھی خوبصورت ہو گئی ہے، مر جائے گی؟ اس نے پیٹھ کی طرف سے اندو کو تھام لیا اور پھر کھینچ کر اپنے بازوؤں میں لے آیا اور بولا ــــ "تجھے کچھ نہ ہوگا اندو ــــ میں تو موت کے منہ سے بھی چھین کے لے آؤں گا تجھے ــــ اب ساوتری کی نہیں ستیہ وان کی باری ہے ــــ"

مدن سے لپٹ کر اندو بھول ہی گئی کہ اس کا اپنا بھی کوئی دکھ ہے ــــــــ

اس کے بعد بابو جی نے کچھ نہ لکھا، البتہ سہارنپور سے ایک سارٹر آیا جس نے صرف اتنا بتایا کہ بابو جی کو پھر سے دورے پڑنے لگے ہیں۔ ایک دورے میں تو وہ قریب قریب چل ہی بسے تھے۔ مدن ڈر گیا، اندو رونے لگی، سارٹر کے چلے جانے کے بعد ہمیشہ کی طرح مدن نے آنکھیں موندلیں اور من ہی من میں پڑھنے لگا ــــ اوم نمو بھگوتے ــــ

دوسرے ہی روز مدن نے باپ کو چٹھی لکھی ــــ "بابو جی! چلے آؤ ــــ بچے بہت یاد کرتے ہیں اور آپ کی بہو بھی ــــ" لیکن آخر نوکری تھی۔ اپنے بس کی بات تھوڑی تھی۔ دھنی رام کے خط کے مطابق وہ چھٹی کا بندوبست کر رہے تھے ــــ ان کے بارے میں دن بہ دن مدن کا احساس جرم بڑھنے لگا ــــ "اگر میں اندو کو وہیں رہنے دیتا تو میرا کیا بگڑتا؟ ــــ"

وجے دشمی سے ایک رات پہلے مدن اضطراب کے عالم میں بیچ والے کمرے کے باہر برآمدے میں ٹہل رہا تھا کہ اندر سے بچے کے رونے کی آواز آئی اور وہ چونک کر دروازے کی طرف لپکا۔ بیگم دایہ باہر آئی اور بولی ــــ "مبارک ہو بابو جی ــــ لڑکا ہوا ہے۔"

"لڑکا؟" مدن نے کہا اور پھر متفکرانہ لہجے میں بولا ــــ "بی بی کیسی ہے؟"

بیگم بولی: "خیر مہر ہے۔ میں نے ابھی تک اسے لڑکی ہی بتائی ہے ــــ زچہ زیادہ خوش ہو جائے تو اس کی آنول نہیں گرتی نا؟"

"او ــــ" مدن نے بیوقوفوں کی طرح آنکھیں جھپکتے ہوئے کہا اور پھر کمرے میں جانے کے لیے آگے بڑھا۔ بیگم نے اسے وہیں روک دیا اور کہنے لگی ــــ "تمھارا اندر کیا کام؟" اور پھر ایکا ایکی دروازہ بھیڑ کر اندر لپک گئی۔

مدن کی ٹانگیں ابھی تک کانپ رہی تھیں۔ اس وقت خوف سے نہیں تسلی سے یا شاید اس لیے کہ جب کوئی اس دنیا میں آتا ہے تو ارد گرد کے لوگوں کی یہی حالت ہوتی ہے۔ مدن نے سن رکھا تھا جب لڑکا پیدا ہوتا ہے تو گھر کے در و دیوار لرز نے لگتے ہیں۔ گویا ڈر رہے ہیں کہ بڑا ہو کر ہمیں بیچے گا یا رکھے گا۔ مدن نے محسوس کیا جیسے سچ مچ

ہی دیواریں کانپ رہی تھیں ــــ زچگی کے لیے چکلی بھابی تو نہ آئی تھی کیوں کہ اس کا اپنا بچہ بہت چھوٹا تھا البتہ دریاآباد والی پھوپی ضرور پہنچی تھی جس نے پیدائش کے وقت رام رام۔ رام رام کی رٹ لگا دی تھی اور اب وہی رٹ مدھم ہو رہی تھی ــــ

زندگی بھر مدن کو اپنا آپ اتنا فضول اور بیکار نہ لگا تھا۔ اتنے میں پھر دروازہ کھلا اور پھوپی نکلی۔ برآمدے کی بجلی کی مدھم سی روشنی میں اس کا چہرہ بھوت کے چہرے کی طرح ایک دم دودھیا سفید نظر آ رہا تھا۔ مدن نے اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا ــــ

"اندو ٹھیک ہے نا پھوپی ــــ؟"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، ٹھیک" پھوپی نے تین چار بار کہا اور پھر اپنا لرزتا ہوا ہاتھ مدن کے سر پر رکھ کر اسے نیچا کیا، چوما اور باہر لپک گئی۔

پھوپی برآمدے کے دروازے میں سے باہر جاتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ وہ بیٹھک میں پہنچی جہاں باقی کے بچے سو رہے تھے۔ پھوپی نے ایک ایک کر کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور پھر چھت کی طرف آنکھیں اٹھا کر منہ میں کچھ بولی اور پھر نڈھال سی ہو کر منی کے پاس لیٹ گئی۔ اوندھی۔ اس کے پھڑکتے ہوئے شانوں سے پتا چل رہا تھا جیسے رو رہی ہے۔ مدن حیران ہوا ــــ پھوپی تو کئی زچگیوں سے گزر چکی ہے، پھر کیوں اس کی روح تک کانپ اٹھی ہے ــــ؟

پھر ادھر کے کمرے سے ہرمل کی بو باہر لپکی۔ دھوئیں کا ایک غبار سا آیا جس نے مدن کا احاطہ کر لیا۔ اس کا سر چکرا گیا۔ جبھی بیگم دایہ کپڑے میں کچھ لپیٹے ہوئے باہر نکلی۔ کپڑے پر خون ہی خون تھا جس میں سے کچھ قطرے نکل کر فرش پر گر گئے۔ مدن کے ہوش اڑ گئے۔ اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں ہے، آنکھیں کھلی تھیں پر کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ بیچ میں اندو کی ایک مرگھلی سی آواز آئی "ہا ــــ ئے!" اور پھر بچے کے رونے کی آواز ــــ

تین چار دن میں بہت کچھ ہوا۔ مدن نے گھر کے ایک طرف گڑھا کھود کر آنول کو دبایا کتوں کو اندر آنے سے روکا۔ لیکن اسے کچھ یاد نہ تھا۔ اسے یوں لگا جیسے ہرمل کی بو دماغ میں بس جانے کے بعد آج ہی اسے ہوش آیا ہے۔ کمرے میں وہ اکیلا ہی تھا اور

اندو ـــــ نند اور جسودھا ـــــ اور دوسری طرف نندلال ـــــ اندو نے بچّے کی طرف دیکھا اور کچھ تُوہ لینے کے سے انداز میں بولی ـــــ "بالکل تم ہی پر گیا ہے"

"ہوگا" مدن نے ایک اچٹتی سی نظر بچے پر ڈالتے ہوئے کہا ـــــ "میں تو کہتا ہوں شکر ہے بھگوان کا تم بچ گئیں"

"ہاں!" اندو بولی ـــــ "میں تو سمجھتی تھی ـــــ"

"شبھ شبھ بولو" مدن نے ایک دم اندو کی بات کاٹتے ہوئے کہا "یہاں تو جو کچھ ہوا ہے ـــــ میں تو اب تمھارے پاس بھی نہیں پھٹکوں گا" اور مدن نے زبان دانتوں تلے دبالی۔ "توبہ کرو" اندو بولی۔

مدن نے اسی دم کان اپنے ہاتھوں سے پکڑ لیے ـــــ اور اندو خفیف سی آواز میں ہنسنے لگی۔

بچہ پیدا ہونے کے بعد کئی روز تک اندو کی ناف ٹھکانے پر نہ آئی۔ وہ گھوم گھوم کر اس بچے کو تلاش کر رہی تھی جو اب اس سے پرے باہر کی دنیا میں جاکر اپنی اصلی ماں کو بھول گیا تھا۔

اب سب کچھ ٹھیک تھا اور اندو شانتی سے اس دنیا کو تک رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا اس نے مدن ہی کے نہیں دنیا بھر کے گناہ گاروں کے گناہ معاف کر دیے ہیں اور اب دیوی بن کر دَیا اور کرونا کے پرساد بانٹ رہی ہے ـــــ مدن نے اندو کے مُنہ کی طرف دیکھا اور سوچنے لگا ـــــ اس سارے خون خرابے کے بعد کچھ دبلی ہو کر اندو اور اچھی لگنے لگی ہے ـــــ جبھی ایکا ایکی اندو نے دونوں ہاتھ اپنی چھاتیوں پر رکھ لیے۔

"کیا ہوا" مدن نے پوچھا۔

"کچھ نہیں" اندو تھوڑا سا اٹھنے کی کوشش کر کے بولی ـــــ "اسے بھوک لگی ہے" اور اس نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔

"اسے؟ ـــــ بھوک؟ ـــــ" مدن نے پہلے بچّے کی طرف اور پھر اندو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تمھیں کیسے پتا چلا؟"

"دیکھتے نہیں؟" اندو نیچے کی طرف نگاہ کرتے ہوئے بولی "سب گیلا ہو گیا ہے"

مدن نے غور سے اندو کے ڈھیلے ڈھالے دگلے کی طرف دیکھا۔ جھر جھر دودھ

بہہ رہا تھا اور ایک خاص قسم کی بُو آ رہی تھی۔ پھر اندو نے بچّے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا ـــــ "اسے مجھے دے دو"

مدن نے ہاتھ پنگوڑے کی طرف بڑھایا اور اسی دم کھینچ لیا۔ پھر کچھ ہمت سے کام لیتے ہوئے اس نے بچّے کو یوں اٹھایا جیسے وہ مرا ہوا چوہا ہو۔ آخر اس نے بچّے کو اندو کی گود میں دے دیا۔ اندو مدن کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ـــــ "تم جاؤ ـــــ باہر ـــــ"

"کیوں؟ ـــــ باہر کیوں جاؤں؟" مدن نے پوچھا۔

"جاؤ نا ـــــ" اندو نے کچھ مچلتے، کچھ شرماتے ہوئے کہا "تمھارے سامنے میں دودھ نہیں پلا سکوں گی"

"ارے؟" مدن حیرت سے بولا "میرے سامنے ـــــ نہیں پلا سکے گی؟" اور پھر نا سمجھی کے انداز میں سر کو جھٹکا دے کر باہر کی طرف چل نکلا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر مڑتے ہوئے اس نے اندو پر ایک نگاہ ڈالی ـــــ اتنی خوبصورت اندو آج تک نہ لگی تھی!

بابو دھنی رام چھٹی پر گھر لوٹے تو وہ پہلے سے آدھے دکھائی پڑتے تھے۔ جب اندو نے پوتا ان کی گود میں دیا تو وہ کھل اٹھے۔ ان کے پیٹ کے اندر کوئی پھوڑا نکل آیا تھا جو چوبیس گھنٹے انھیں سولی پر لٹکائے رکھتا۔ اگر منا نہ ہوتا تو بابو جی کی اس سے دس گنا بری حالت ہوتی۔

کئی علاج کیے گئے۔ بابو جی کے آخری علاج میں ڈاکٹر نے ادھنّی کے برابر گولی پندرہ بیس کی تعداد میں روز کھانے کو دیں۔ پہلے ہی دن انھیں اتنا پسینا آیا کہ دن میں تین تین چار چار بار کپڑے بدلنے پڑے۔ ہر بار مدن کپڑے اتار کر بالٹی میں نچوڑتا۔ صرف پسینے ہی سے بالٹی ایک چوتھائی ہو گئی تھی۔ رات انھیں متلی سی ہونے لگی اور انھوں نے پکارا ـــــ

"بہو! ذرا داتن تو دینا ذائقہ بہت خراب ہو رہا ہے" بہو بھاگی ہوئی گئی اور داتن لے آئی۔ بابو جی اٹھ کر داتن چبا ہی رہے تھے کہ ایک ابکائی کیا آئی ساتھ ہی خون کا پرنالا لے آئی۔ بیٹے نے واپس سرھانے کی طرف لٹایا تو ان کی پتلیاں پھر چکی تھیں اور کوئی ہی دم میں وہ اوپر آسمان کے گلزار میں پہنچ چکے تھے جہاں انھوں نے اپنا پھول پہچان لیا تھا۔

منے کو پیدا ہوئے کُل بیس پچیس روز ہوئے تھے۔ اندو نے مُنہ نوچ نوچ کر، سر اور

چھاتی پیٹ پیٹ کر خود کو نیلا کر لیا۔ مدن کے سامنے وہی منظر تھا جو اس نے تصوّر میں اپنے مرنے پر دیکھا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اندو نے چوڑیاں توڑنے کی بجائے اُتار کے رکھ دی تھیں۔ سر پر راکھ نہیں ڈالی تھی لیکن زمین پر سے مٹی لگ جانے اور بالوں کے بکھر جانے سے چہرہ بھیانک ہو گیا تھا۔ "لوگو! میں لٹ گئی" کی جگہ اس نے ایک دلدوز آواز میں چلّانا شروع کر دیا تھا ــــــــ "لوگو! ہم لٹ گئے ــــ"

گھر بار کا کتنا بوجھ مدن پر آ پڑا تھا، اس کا ابھی مدن کو پوری طرح سے اندازہ نہ تھا صبح ہونے تک اس کا دل لپک کر منھ میں آ گیا۔ وہ شاید بچ نہ پاتا اگر وہ گھر کے باہر بدرو کے کنارے سیل چڑھی مٹی پر اوندھا لیٹ کر، اپنے دل کو ٹھکانے پر نہ لاتا ــــ دھرتی ماں نے چھاتی سے لگا کر اپنے بچّے کو بچا لیا تھا۔ چھوٹے بچّے کندن، دلاری منّی اور پاشی یوں چلّا رہے تھے جیسے گھونسلے پر شکرے کے حملے پر چڑیا کے بونٹ چونچیں اٹھا اٹھا کر چیں چیں کرتے ہیں۔ انھیں اگر کوئی پروں کے نیچے سمیٹتی تھی تو اندو ــــــــــ

نالی کے کنارے پڑے پڑے مدن نے سوچا اب تو یہ دنیا میرے لیے ختم ہو گئی۔ کیا میں جی سکوں گا؟ زندگی میں کبھی ہنس بھی سکوں گا؟ وہ اٹھا اور اٹھ کر گھر کے اندر چلا آیا۔

سیڑھیوں کے نیچے غسل خانہ تھا جس میں گھس کر اندر سے کواڑ بند کرتے ہوئے مدن نے ایک بار پھر اس سوال کو دہرایا میں کبھی ہنس بھی سکوں گا؟ ــــــــ اور وہ کھل کھلا کر ہنس رہا تھا حالاں کہ اس کے باپ کی لاش ابھی پاس ہی بیٹھک میں پڑی تھی۔

باپ کو آگ کے حوالے کرنے سے پہلے مدن، ارتھی پر پڑے ہوئے جسم کے سامنے ڈنڈوت کے انداز میں لیٹ گیا۔ یہ اس کا اپنے جنم داتا کو آخری پرنام تھا۔ تس پر بھی وہ رو نہ رہا تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر ماتم میں شریک ہونے والے رشتے دار محلّے والے سن سے رہ گئے۔

پھر ہندو رواج کے مطابق سب سے بڑا بیٹا ہونے کی حیثیت سے مدن کو چِتا جلانی پڑی۔ جلتی ہوئی کھوپڑی میں کپال کریا کی لاٹھی مارنی پڑی ــــ عورتیں باہر ہی سے شمشان کے کنویں پر نہا کر گھر لوٹ چکی تھیں۔ جب مدن گھر پر پہنچا تو وہ کانپ رہا تھا۔ دھرتی ماں نے تھوڑی دیر کے لیے جو طاقت اپنے بیٹے کو دی تھی۔ رات کے

گھر آنے پر پھر سے ہوس میں ڈھل گئی ــــــ اسے کوئی سہارا چاہیے تھا۔ کسی ایسے جذبے کا سہارا جو موت سے بھی بڑا ہو۔ اس وقت دھرتی ماں کی بیٹی، جنک دلاری اندو نے کسی گھڑے میں سے پیدا ہو کر اس رام کو اپنی بانہوں میں لے لیا ــــ اس رات اگر اندو اپنا آپا یوں مدن پر نہ وار دیتی تو اتنا بڑا دکھ مدن کو لے ڈوبتا۔

دس ہی مہینے کے اندر اندر اندو کا دوسرا بچّہ چلا آیا۔ بیوی کو اس دوزخ کی آگ میں دھکیل کر مدن خود اپنا دکھ بھول گیا تھا۔ کبھی کبھی اسے خیال آتا اگر میں شادی کے بعد بابوجی کے پاس گئی ہوئی اندو کو نہ بلا لیتا تو شاید وہ اتنی جلدی نہ چل دیتے لیکن پھر وہ باپ کی موت سے پیدا ہونے والے خسارے کو پورا کرنے میں لگ جاتا ــــــ کاروبار جو پہلے بے توجہی کی وجہ سے بند ہو گیا تھا ــــــ مجبوراً چل نکلا۔

ان دنوں بڑے بچّے کو مدن کے پاس چھوڑ کر، چھوٹے کو چھاتی سے لگائے اندو میکے چلی گئی تھی۔ پیچھے منّا طرح طرح کی ضد کرتا جو کبھی مانی جاتی تھی اور کبھی نہیں بھی۔ میکے سے اندو کا خط آیا ــــ مجھے یہاں اپنے بیٹے کے رونے کی آواز آ رہی ہے، اسے کوئی مارتا تو نہیں ــــ مدن کو بڑی حیرت ہوئی۔ ایک جاہل، اَن پڑھ عورت ــــ ایسی باتیں کیسے لکھ سکتی ہے؟ ــــ پھر اس نے اپنے آپ سے پوچھا ــــ "کیا یہ بھی کوئی رٹا ہوا فقرہ ہے؟"

سال گزر گئے۔ پیسے کبھی اتنے نہ آئے تھے کہ ان سے کچھ عیش ہو سکے لیکن گزارے کے مطابق آمدنی ضرور ہو جاتی تھی۔ دقّت اس وقت ہوتی جب کوئی بڑا خرچ سامنے آ جاتا ــــ کندن کا داخلہ دینا ہے، دلاری منّی کا شگن بھجوانا ہے۔ اس وقت مدن منّہ لٹکا کر بیٹھ جاتا اور پھر اندو ایک طرف سے آتی، مسکراتی ہوئی اور کہتی ــــ "کیوں دُکھی ہو رہے ہو؟" مدن اس کی طرف اُمید بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہتا ــــــ

دکھی نہ ہوں ؛ کندن کا بل۔ اُسے کا داخلہ دینا ہے ——— منّی ——— “ اندو پھر ہنستی اور کہتی ——— “چلو میرے ساتھ ” اور مدن بھیڑ کے بچّے کی طرح اندو کے پیچھے چل دیتا۔ اندو صندل کے صندوق کے پاس پہنچتی جسے کسی کو مدن سمیت ہاتھ لگانے کی اجازت نہ تھی۔ کبھی کبھی اس بات پر خفا ہو کر مدن کہتا ——— “مروں تو اسے بھی چھاتی پر ڈال کر لے جانا” اور اندو کہتی ——— “ہاں لے جاؤں گی” پھر اندو وہاں سے مطلوبہ رقم نکال کر سامنے رکھ دیتی۔

“یہ کہاں سے آ گئے ؟”

“کہیں سے بھی آئے ——— تمھیں آم کھانے سے مطلب ہے کہ ———”

“پھر بھی ؟”

“تم جاؤ اپنا کام چلاؤ ۔”

اور جب مدن زیادہ اصرار کرتا تو اندو کہتی “میں نے ایک سیٹھ دوست بنایا ہے نا ؟” اور پھر ہنسنے لگتی۔ جھوٹ جانتے ہوئے بھی مدن کو یہ مذاق اچھا نہ لگتا۔ پھر اندو کہتی “میں چور لیٹرا ہوں ——— تم نہیں جانتے ؟ ——— سخی لیٹرا ——— جو ایک ہاتھ سے لوٹتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے غریب غربا کو دے دیتا ہے ” ——— اسی طرح منّی کی شادی ہوئی جس پر ایسی ہی لوٹ کے زیور بکے۔ قرضہ چڑھا اور پھر اُتر بھی گیا ———

ایسے ہی کندن بھی بیاہا گیا۔ ان شادیوں میں اندو ہی ہتھ بھرا کرتی تھی اور ماں کی جگہ کھڑی ہو جاتی۔ آسمان سے بابو جی اور ماں دیکھا کرتے اور پھول برساتے جو کسی کو نظر نہ آتے۔ پھر ایسا ہوا، اوپر ماں جی اور بابو جی میں جھگڑا چل گیا۔ ماں نے بابو جی سے کہا “تم بہو کے ہاتھ کی پکی کھائے ہو، اس کا سکھ بھی دیکھا ہے پر میں نصیبوں جلی نے کچھ بھی نہیں دیکھا” ——— اور یہ جھگڑا وشنو، مہیش اور شو تک پہنچا انھوں نے ماں کے حق میں فیصلہ دیا ——— اور یوں ماں، مات لوک میں آ کر بہو کی کوکھ میں پڑی ———

اور اندو کے ہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی ———

پھر اندو ایسی دیوی بھی نہ تھی۔ جب کوئی اصول کی بات ہوتی تو نند دیور تو کیا خود مدن سے بھی بھڑ جاتی ——— مدن راست بازی کی اس پتلی کو خفا ہو کر ہریش چندر

کی بیٹی کہا کرتا تھا۔ چونکہ اندو کی باتوں میں الجھاو ہونے کے باوجود سچائی اور دھرم قائم رہتے تھے اس لیے مدن اور کنبے کے باقی سب لوگوں کی آنکھیں اندو کے سامنے نیچی ہی رہتی تھیں۔ جھگڑا کتنا بھی بڑھ جائے مدن اپنے شوہری زعم میں کتنا بھی اندو کی بات کو رد کر دے لیکن آخر بھی سر جھکائے ہوئے اندو ہی کی شرن میں آتے تھے اور اسی سے چھما مانگتے تھے۔

نئی بھابی آئی۔ کہنے کو تو وہ بھی بیوی تھی۔ لیکن اندو ایک عورت تھی جسے بیوی کہتے ہیں۔ اس کے الٹ چھوٹی بھابی رانی ایک بیوی تھی جسے عورت کہتے ہیں۔ رانی کے کارن بھائیوں میں جھگڑا ہوا اور جے پی چاچا کی معرفت جایدات تقسیم ہوئی جس میں ماں باپ کی جایدات تو ایک طرف، اندو کی اپنی بنائی ہوئی چیزیں بھی تقسیم کی زد میں آگئیں اور اندو کلیجا مسوس کر رہ گئی۔

جہاں سب کچھ مل جانے کے بعد اور الگ ہو کر بھی کندن اور رانی ٹھیک سے نہیں بس سکے تھے وہاں اندو کا اپنا گھر دنوں ہی میں جگمگ کرنے لگا۔

بچّی کی پیدائش کے بعد اندو کی صحت وہ نہ رہی۔ بچّی ہر وقت اندو کی چھاتیوں سے چمٹی رہتی تھی۔ جہاں بھی گوشت کے اس لوتھڑے پر تھو تھو کرتے تھے وہاں ایک اندو تھی جو اسے کلیجے سے لگائے پھرتی۔ لیکن کبھی خود بھی پریشان ہو اٹھتی۔ اور بچّی کو سامنے جھلنگے میں پھینکتے ہوئے کہہ اٹھتی ——— “تو مجھے جینے بھی دے گی ——— ماں ؟” ——— اور بچّی چلّا چلّا کر رونے لگتی۔

مدن اندو سے کٹنے لگا۔ شادی سے لے کر اس وقت تک اسے وہ عورت نہ ملی تھی جس کا وہ متلاشی تھا۔ گندہ بروزہ بکنے لگا اور مدن نے بہت سا روپیا اندو سے بالا ہی بالا خرچ کرنا شروع کر دیا۔ بابو جی کے چلے جانے پر کوئی پوچھنے والا بھی تو نہ تھا۔ پوری آزادی تھی۔

گویا پڑوسی سبطے کی بھینس پھر مدن کے منہ کے پاس پھنکارنے لگی، بار بار پھنکارنے لگی۔ شادی کی رات والی بھینس تو بک چکی تھی۔ لیکن اس کا مالک زندہ تھا۔ مدن اس کے ساتھ ایسی جگہوں پر جانے لگا جہاں روشنی اور سایے عجیب بے قاعدہ سی شکلیں بناتے ہیں۔ نکڑ پر کبھی اندھیرے کی تکون بنتی ہے کہ اوپر کھٹ سے روشنی کی ایک چوکور آ گرا ہے

کاٹ دیتی ہے. کوئی تصویر پوری نہیں بنتی. معلوم ہوتا ہے بغل سے ایک پاجامہ نکلا اور آسمان کی طرف اڑ گیا یا کسی کوٹ نے دیکھنے والے کا منہ پوری طرح سے ڈھانپ لیا اور کوئی سانس کے لیے تڑپنے لگا. جبھی روشنی کی چوکور ایک چوکھٹا سی بن گئی اور اس میں ایک صورت آکر کھڑی ہوگئی. دیکھنے والے نے ہاتھ بڑھایا تو وہ آر پار چلا گیا اور وہاں کچھ بھی نہ تھا. پیچھے کوئی کتا رونے لگا. اوپر طبل نے اس کی آواز ڈبو دی ــــــ

مدن کو اس کے تصور کے خدوخال ملے لیکن ہر جگہ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے آرٹسٹ سے ایک غلط خط لگ گیا. یا ہنسی کی آواز ضرورت سے زیادہ بلند تھی اور مدن بے داغ صناعی اور متوازن ہنسی کی تلاش میں کھو گیا.

ببلے نے اس وقت اپنی بیوی سے بات کی جب اس کی بیگم نے مدن کو مثالی شوہر کی حیثیت سے ببلے کے سامنے پیش کیا، پیش ہی نہیں کیا بلکہ منہ پر مارا. اس کو اٹھا کر ببلے نے بیگم کے منہ پر دے مارا. معلوم ہوتا تھا کسی خونیں تربوز کا گودا ہے جس کے رگ و ریشے بیگم کی ناک، اس کی آنکھوں اور کانوں پر لگے ہوئے ہیں. کروڑ کروڑ گالی بکتی ہوئی بیگم نے حافظے کی ٹوکری میں سے گودا اور بیج اٹھائے اور اندو کے صاف ستھرے صحن میں بکھیر دیے.

ایک اندو کی بجائے دو اندو ہوگئیں. ایک تو اندو خود تھی اور دوسری ایک کانپتا ہوا خط جو اندو کے پورے جسم کا احاطہ کیے ہوئے تھا اور جو نظر نہیں آ رہا تھا.

مدن کہیں جاتا بھی تھا تو گھر سے ہو کر ــــــ نہا دھو، اچھے کپڑے پہن، گھی کی ایک، جوڑی جس میں خوشبودار قوام لگا ہوا، منہ میں رکھ کر ــــــ لیکن اس دن جو مدن گھر آیا تو اندو کی شکل ہی دوسری تھی. اس نے چہرے پر پوڈر تھوپ رکھا تھا. گالوں پر روج لگا رکھی تھی. لپ اسٹک کے نہ ہونے پر ہونٹ ماتھے کی بندی سے رنگ لیے تھے اور بال کچھ اس طریقے سے بنائے تھے کہ مدن کی نظریں ان میں اُلجھ کے رہ گئیں.

"کیا بات ہے آج؟" مدن نے حیران ہو کر پوچھا.

"کچھ نہیں" اندو نے مدن سے بچاتے ہوئے کہا ــــــ "آج فرصت ملی ہے."

شادی کے پندرہ برس گزر جانے کے بعد اندو کو آج فرصت ملی تھی! اور وہ بھی

اس وقت جب کہ چہرے پر چھائیاں چلی آئی تھیں. ناک پر ایک سیاہ سی کاٹھی بن گئی تھی اور بلاوز کے نیچے ننگے پیٹ کے پاس کمر پر چربی کی دو تین تہیں دکھائی دینے لگی تھیں. آج اندو نے ایسا بندوبست کیا تھا کہ ان عیوب میں سے ایک بھی چیز نظر نہ آتی تھی. یوں بنی ٹھنی، کسی کسائی وہ بے حد حسین لگ رہی تھی ــــــ "یہ نہیں ہو سکتا" ــــــ مدن نے سوچا اور اسے ایک دھچکا سا لگا. اس نے پھر ایک بار مڑ کر اندو کی طرف دیکھا ــــــ جیسے گھوڑوں کے بیوپاری کسی نامی گھوڑی کی طرف دیکھتے ہیں. وہاں گھوڑی بھی تھی اور لال لگام بھی ــــــ یہاں جو غلط خط لگے تھے، شرابی کی آنکھوں کو نہ دکھ سکے ــــــ اندو سچ مچ خوبصورت تھی. آج بھی پندرہ سال کے بعد پھولاں، رشیدہ، مسز رابرٹ اور ان کی بہنیں اس کے سامنے پانی بھرتی تھیں ــــــ پھر مدن کو رحم آنے لگا اور ایک ڈر!

آسمان پر کوئی خاص بادل بھی نہ تھے لیکن پانی پڑنا شروع ہو گیا. گھر کی گنگا طغیانی پر تھی اور اس کا پانی کنارواں سے نکل نکل کر پوری ترائی اور اس کے آس پاس بسنے والے گاؤں اور قصبوں کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا. ایسا معلوم ہوتا تھا اسی رفتار سے پانی بہتا رہا تو اس میں کیلاش پربت بھی ڈوب جائے گا ــــــ ادھر بچی رونے لگی. ایسا رونا جو وہ آج تک نہ روئی تھی.

مدن نے اس کی آواز سن کر آنکھیں بند کر لیں، کھولیں تو بچی سامنے کھڑی تھی. جوان عورت بن کر. نہیں، نہیں، وہ اندو تھی. اپنی ماں کی بیٹی، اپنی بیٹی کی ماں جو اپنی آنکھوں کے دنبالے سے مسکرائی اور ہونٹوں کے کونے سے دیکھنے لگی.

اسی کمرے میں جہاں ایک دن ہرمل کی دھونی نے مدن کو چکرا دیا تھا، آج خس کی خوشبو نے بوکھلا دیا. ہلکی تیز بارش سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے. اس لیے باہر کا پانی اوپر کسی کڑی میں سے ٹپکتا ہوا اندو اور مدن کے بیچ ٹپکنے لگا ــــــ لیکن مدن تو شرابی ہو رہا تھا. اس نشے میں اس کی آنکھیں سمٹنے لگیں اور تنفس تیز ہو کر انسان کا تنفس نہ رہا.

"اندو ــــــ" مدن نے کہا ــــــ اور اس کی آواز شادی کی رات والی آواز

سے دوسُرا اوپر تھی ـــــ اور اندو نے پرے دیکھتے ہوئے کہا ـــــ "جی" اور اس کی آواز دوسُر نیچے تھی ـــــ پھر آج چاندنی کی بجائے اماوس تھی ـــــ

اس سے پہلے کہ مدن اندو کی طرف ہاتھ بڑھاتا، اندو خود ہی مدن سے لپٹ گئی۔ پھر مدن نے ہاتھ سے اندو کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی اور دیکھنے لگا، اس نے کیا کھویا کیا پایا ہے؟ اندو نے ایک نظر مدن کے سیاہ ہوتے ہوئے چہرے کی طرف پھینکی اور پھر آنکھیں بند کرلیں۔

"یہ کیا؟" مدن نے چونکتے ہوئے کہا ـــــ "تمھاری آنکھیں سوجی ہوئی ہیں؟"

"یونہی" اندو نے کہا اور بچّی کی طرف اشارہ کرتے ہوئی بولی ـــــ "رات بھر جگایا ہے اس چڑیل منیا نے؛"

بچّی اب تک خاموش ہوچکی تھی، گویا دم سادھے دیکھ رہی تھی، اب کیا ہونے والا ہے؟ آسمان سے پانی پڑنا بند ہوگیا تھا۔ مدن نے پھر غور سے اندو کی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ـــــ "ہاں مگر ـــــ یہ آنسو؟"

"خوشی کے ہیں" اندو نے جواب دیا "آج کی رات میری ہے" اور پھر ایک عجیب سی ہنسی ہنستی ہوئی وہ مدن سے چمٹ گئی۔ ایک تلذذ کے احساس سے مدن نے کہا۔

"آج برسوں کے بعد میرے من کی مراد پوری ہوئی ہے، اندو! میں نے ہمیشہ چاہا تھا ـــــ"

"لیکن تم نے کہا نہیں" اندو بولی ـــــ "یاد ہے شادی کی رات میں نے تم سے کچھ مانگا تھا؟"

"ہاں!" مدن بولا ـــــ "اپنے دکھ مجھے دے دو۔"

"تم نے تو کچھ نہیں مانگا مجھ سے؟"

"میں نے؟" مدن نے حیران ہوتے ہوئے کہا ـــــ "میں کیا مانگتا؟ میں تو جو کچھ مانگ سکتا تھا وہ سب تم نے دے دیا۔ میرے عزیزوں سے پیار ـــــ ان کی تعلیم، بیاہ شادی، ـــــ یہ پیارے پیارے بچّے ـــــ یہ سب کچھ تو تم نے دے دیا۔"

"میں بھی یہی سمجھتی تھی" اندو بولی ـــــ "لیکن اب جاکر پتا چلا، ایسا نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"کچھ نہیں" پھر اندو نے رک کر کہا ـــــ "میں نے بھی ایک چیز رکھ لی۔"

"کیا چیز رکھ لی؟"

اندو کچھ دیر چپ رہی اور پھر اپنا منہ پرے کرتی ہوئی بولی ـــــ "اپنی لاج ـــــ اپنی خوشی ـــــ اس وقت تم بھی کہہ دیتے ـــــ اپنے سکھ مجھے دے دو ـــــ تو میں ـــــ" اور اندو کا گلا رندھ گیا۔

اور کچھ دیر بعد وہ بولی ـــــ "اب تو میرے پاس کچھ نہیں رہا ـــــ"

مدن کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ زمین میں گڑ گیا ـــــ

یہ ان پڑھ عورت؟ ـــــ کوئی رٹا ہوا فقرہ ـــــ؟

نہیں تو ـــــ یہ تو ابھی سامنے ہی زندگی کی بھٹّی سے نکلا ہے۔ ابھی تو اس پر برابر ہتھوڑے پڑ رہے ہیں اور آتشیں برادہ چاروں طرف اڑ رہا ہے۔

کچھ دیر کے بعد مدن کے ہوش ٹھکانے آئے اور بولا ـــــ "میں سمجھ گیا اندو" پھر روتے ہوئے مدن اور اندو ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ اندو نے مدن کا ہاتھ پکڑا اور اسے ایسی دنیاؤں میں لے گئی جہاں انسان مر کر ہی پہنچ سکتا ہے ـــــ۔

ٹرمینس سے پرے

پنجاب میل چلی تو خاصی سست رفتاری سے پلیٹ فارم کے احاطے سے باہر نکلی۔ دیر تک موہن جام کو اپنی نازک سی بیوی سومترا کا بدن، ایک سادہ سی ہینڈ لوم کی ساری میں لپٹا ہوا نظر آتا رہا۔ سومترا کمپارٹمنٹ کے دروازے میں کھڑی تھی جب کہ موہن ایک اسٹال کے برابر کھڑا آخر دم تک اپنا رومال ہلاتا رہا۔

گاڑی چلنے سے پہلے سومترا کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ الفاظ ہمیشہ کی طرح بیکار ہو گئے تھے ——— "پیچھے گھر کا خیال رکھنا!" "ہوٹل کی روٹی مت کھانا!" "ہفتے میں ایک نہیں، دو بار خط ضرور لکھنا" یہ سب باتیں آنکھوں کی زبان کے سامنے گونگی ہو گئی تھیں اور انھوں نے موہن جام ایسے آدمی کے دل کو بھی گداز کر دیا تھا ——— ہر بیوی الگ ہونے سے پہلے آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی تائید مانگتی ہے۔ اس وقت تو کوئی جھوٹ بھی بول دے۔ لیکن کچھ لوگ ——— موہن نے کچھ نہ کہا۔ وہ پہلے تیز تیز اور پھر آہستہ آہستہ رومال ہلاتا رہا۔ یہ حرکت ایک رسم بن چکی تھی لیکن اچھی معلوم ہوتی تھی۔ دل کہاں، کیوں اور کس کے لیے دھڑک رہا ہے، یہ تو دکھائی نہیں دیتا البتہ رومال نظروں کے دھندلکے میں حل ہونے تک برابر اس آدمی کو دکھائی دیتا ہے، جو

جا رہا ہے!

یہ سفر ہی بکواس۔ میں تو جب بھی کہیں جانے لگتا ہوں، میری طبیعت گر سی جاتی ہے۔ اسٹیشن پہ ہجوم، محض ہجوم کی وجہ سے آدمی تنہا رہ جاتا ہے۔ پھر آگے جانے کے لیے گاڑی تھوڑا پیچھے ہٹتی ہے۔ پھر کوئی سیٹی، کوئی آواز ——— "ارے ارے، گاڑی چھوٹ گئی، میرا سامان رہ گیا ——— آخر ——— کوئی کسی کا نہیں ——— یہ دنیا ——— جب ایک بار تو جی چاہتا ہے آدمی ٹکٹ وکٹ لوٹا دے اور گھر جا کر مزے سے بیٹھ جائے۔ چاہے بیوی سے لڑے ہی۔

زندگی کی فتحمندی یہی ہے کہ اُداسی کے سایے میں بھی کہیں خوشی کے جذبے رینگتے رہیں اور گاڑی کے چھوٹتے ہی لپک کر سامنے آ جائیں اور ان کی روشنی میں اُداسیاں غائب ہو جائیں۔ کبھی جس کے ساتھ پروگرام بنتے تھے، اب اس کے بغیر بننے لگیں ——— موہن نے ایک گہرا سانس لیا ——— چلو، دو مہینے کی چھٹی۔ کچھ چیزوں کا نہ ہونا ہی ایک طرح کا ہونا ہے۔ سومترا لوٹے گی تو ایک بار اسے بھی پتا چل چکا ہوگا کہ میرے بغیر زندگی کے کیا معنی ہیں؟ ——— پھر سے غارت کرنے کے لیے اس کی صحت بھی اچھی ہو چکی ہو گی۔ پھر وہ کیسے پلٹے گی ——— الٹا مجھی سے کہے گی ——— "تو کہاں چلی گئی تھی، موہنی؟"

موہن وکٹوریہ ٹرمینس کے پلیٹ فارم سے باہر نکلنے کے لیے مڑا تو اسی طرف سے کوئی دوسری گاڑی پلیٹ فارم پہ آ رہی تھی۔ موہن چونک گیا۔ اسے یوں لگا جیسے سومترا اس گاڑی سے گئی اور اس سے لوٹ آئی ہے۔ جبھی اس نے ایک موٹی عورت کو کمپارٹمنٹ کے دروازے میں پھنسے ہوئے دیکھا، مسکرایا اور چل دیا۔ اسے ریڈیو کلب جانا تھا، تاش کے کچھ مداریوں کے ساتھ فلیش کھیلنے کے لیے، جہاں بیچ بیچ میں کبھی کبھی پان کی بیگم زندہ ہو جایا کرتی تھی اور سمندر سے آنے والے جھکڑ میں اس کی عنابی ساری کا پلو کسی نہ کسی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتا تھا، پلو کے ہٹائے جانے تک ساری میں لپٹے ہوئے ایک وجود کے بجائے دو کا احساس ہونے لگتا ———

موہن جا رہا تھا۔ اُن جانے میں گھر اور کار کی چابیاں اس کے بائیں ہاتھ کی انگلی پہ گھوم رہی تھیں۔ دایاں ہاتھ پتلون کی جیب میں تھا جس سے وہ پلیٹ فارم

کا ٹکٹ ٹٹول رہا تھا جبھی اس کی نظر سامنے پڑی۔

"اچّی!" وہ رکتے ہوئے بولا۔

موہن اَچلا کو جانتا تھا لیکن کوئی خاص اتنا بھی نہیں۔ اَچلا کے شوہر رام گدکری کو تو وہ شاید زندگی میں ایک آدھ بار ہی ملا ہوگا لیکن اَچلا سے اکثر مشٹان میں ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں جہاں وہ اپنی ایک اوباش سی سہیلی ـــــ دیبی کے ساتھ ویجی ٹیرین کھانا کھانے آیا کرتی تھی۔ نمستے نمستے کے علاوہ موہن جام اور اَچلا گدکری کے بیچ آٹھ دس نہیں تو بارہ پندرہ فقرے ہوئے ہوں گے جن سے پتا چلا تو صرف اتنا کہ وہ بھی کولابہ میں رہتی ہے۔ فرق یہ تھا کہ موہن کف پریڈ کے ایک اچھے سے فلیٹ میں رہتا تھا۔ اور اچلا کارسوے پر کی ایک پرانی بلڈنگ میں رہتی تھی۔

شاید موہن اسے 'اچّی' کے نام سے نہ پکارتا لیکن دیبی نے موہن کا اس سے تعارف ہی اسی نام سے کروایا تھا۔ دیبی کو موہن اچھی طرح جانتا تھا۔ دیبی سمجھتی بھی تھی کہ پانی مصری کے لیے کتنا خطرناک ہوتا ہے۔ اس پہ بھی وہ چھوتے ہی کسی بھی پرایے مرد سے گھل مل جاتی تھی۔ اس کی آزاد زندگی کچھ ایسا ہی شربت تھی جو زندگی کی ڈھلیا میں رات بھر پڑا رہتا ہے۔ صبح تک پانی کسی تبخیر سے اڑ جاتا ہے اور پھر سے مصری کی ڈلیاں ٹھلیا کی تہ میں دکھائی دینے لگتی ہیں۔ پہلے سے بھی صاف شفاف، چمکیلی، نوکیلی ـــــ

موہن کے پکارنے پر اچلا نے گھوم کر دیکھا اور صرف اتنا کہا ـــــ "مو ـــــ"

اور کچھ دیر کے بعد بولی ـــــ "موہن"

اور پھر اس نے اپنی ساری کے پلّو سے آنکھوں کی نم پونچھ ڈالی۔ اب وہ مسکرا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے! یکا یکی کسی نے کوئی سنہرا تاج اس کے سر پر رکھ دیا۔ تھوڑا موہن کے قریب آتے ہوئے وہ بولی ـــــ "آپ! ـــــ یہاں کیسے؟"

"یدی کو چھوڑنے آیا تھا" موہن نے جواب دیا ـــــ "کشمیر جا رہی ہیں بچے کی چھٹیاں ہو گئیں نا ـــــ آپ؟ ـــــ"

"میں؟" ـــــ اور اچلا ایک دم کھلکھلا کر ہنس دی اور پھر اسی دم چپ بھی

ہو گئی کچھ شرماتے ہوئے بولی ـــــ "میں ان کو چھوڑنے آئی تھی" ـــــ

"او" ـــــ اور موہن بھی ہنس دیا۔ ایک نظر اچلا پہ ڈالنے کے بعد وہ دوسری گاڑی کے انجن کی طرف دیکھنے لگا جس میں سے ابھی تک دھواں اٹھ رہا تھا۔ پھر اچلا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ـــــ "کہاں گئے گدکری صاحب؟"

"دلّی" ـــــ

کب آئیں گے؟"

"یہی کوئی ـــــ ہفتہ دس دن میں" اچلا نے کہا "کوئی کانفرنس ہو رہی ہے"

"شاید زیادہ دن بھی لگ جائیں؟"

"ہاں ـــــ شاید ـــــ"

اور اچلا اپنے بالوں کو سنوارنے لگی جو پہلے ہی سنورے ہوئے تھے۔ صرف ان میں ایک پن ڈھیلا ہو کر قدرے اوپر اٹھ آیا تھا۔ جیسے اچلا نے اپنے مومی ہاتھوں سے دبا دیا۔ جبھی اسے یوں لگا جیسے اس کے ہاتھ دیر تک اوپر اٹھے رہے ہیں۔ موہن کی نظر اس کے پورے بدن کا طواف کرتی ہوئی ایک پل بہت دیر اس کے بدن کے اس حصّے پر جا رکی تھی جو چولی اور ساری کے درمیان ہوتا ہے۔ یکا یکی ہاتھ نیچے کرتے ہوئے اس نے ساری سے اپنے بدن کے ننگے حصّے کو ڈھک لیا۔

موہن نے سوچا بدن کے اس حصّے کو انگریزی میں مڈرف کہتے ہیں اور شہد کی مکھی کی طرح اسٹیشن سے باہر نکلنے تک یہ لفظ اس کے دماغ میں بھنبھناتا رہا ـــــ

مڈرف ـــــ مڈرف ـــــ مڈرف ـــــ مڈرف

اور موہن نے اسے دماغ سے نکالنے کی کوشش بھی نہ کی۔ سب بے کار تھا۔ موہن جانتا تھا ـــــ مکھی کتنی ڈھیٹ ہوتی ہے۔ بار بار اڑ کر پھر وہیں آ بیٹھتی ہے جہاں سے اڑی تھی جھلا کر اسے ہٹانے کی کوشش کریں تو ناک ٹوٹ جاتی ہے مکھی چھوٹ جاتی ہے۔

باہر گرمی بہت چکنی چکنی گیلی گیلی تھی۔ بلاوز سینوں سے چپک رہے تھے اور اس سونے کی طرح سے "خوبصورت" لگ رہے تھے جو کانوں کو پھاڑے ڈالتا ہے۔ پسینے کے قطرے

ساریوں اور پتلونوں کے اندر ہی اندر پنڈلیوں پر ٹپکتے اور جونک کی طرح رینگتے معلوم ہو رہے تھے ـــــ اسٹیشن کا چلتا پھرتا پیاد پیچھے رہ گیا تھا اور یہ اسی کی وجہ سے تھا جو پیاس اور بھی تیکھی ہو رہی تھی۔ باہر ہال کے ایک کونے میں تھوڑی جگہ تھی جہاں اوپر چھت پہ دو پروں والا پنکھا سست سی رفتار سے چل رہا تھا۔ اس کے نیچے ایک بڈھا منہ کھولے ہوئے سو رہا تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی لاش شناخت کے لیے شہر کے مردہ خانے میں پڑی ہے ـــ

موہن اور اچلا نے دو چار باتیں کیں اور اس کے بعد ان کی باتیں ختم ہو گئیں۔ دونوں اپنے اپنے ذہن میں کوئی موضوع ڈھونڈ رہے تھے جو زیادہ سوچنے کی وجہ سے ہاتھ میں نہ آ رہا تھا۔ اچلا دو قدم آگے جا رہی تھی اور موہن پیچھے۔ جبھی اچلا میں اپنے بدن کے ان خطوں کا شعور عود کر آیا۔ جنھیں عورت بدصورت سمجھتی ہے اور مرد خوبصورت سمجھتے ہیں اور ہر عورت انھیں مفت میں دکھانا نہیں چاہتی۔ وہ یا پیسے مانگتی ہے یا محبت ـــــ محبت ـــــ جو ہمیشہ عریاں ہوتی ہے اور جسے کپڑے پہنا دیے جائیں تو وہ محبت نہیں رہتی۔ اچلا نے اپنے جسم کے پچھلے حصے پہ ساری کھینچ لی اسے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے نظروں کی برچھیاں پیچھے سے اس کے بدن کے بھرپور پہ لگ رہی ہیں۔

"اچھا موہن جی" وہ مڑتے ہوئے بولی ـــــ "میں اب گھر جاؤں گی۔"

"کیسے جائیں گی؟" موہن نے پوچھا۔

"ایسے" اور اچلا نے تھوڑا چل کے دکھایا اور پھر دونوں کھلکھلا کے ہنس دیے۔ اتنی سی بات میں دونوں کے بیچ ایک یگانگت پیدا ہو گئی تھی۔ آخر موہن نے کہا ـــــ "میرا مطلب ہے ـــــ آپ گاڑی نہیں لائیں؟"

"اچی نے سر ہلاتے ہوئے کہا ـــــ مجھے ڈرائیونگ نہیں آتی۔"

"میں جو ہوں" موہن نے کہا "آج تھوڑی دیر کے لیے مجھے ہی اپنا ڈرائیور سمجھ لیجیے۔"

"جی؟" اچلا بولی "نہیں نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے! میں ـــــ میں بس سے چلی جاؤں گی۔ آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں؟"

آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں، کا جملہ ہی ایسا ہے جس سے کوئی کسی کو تکلیف

دینا چاہتا ہے اور اس کے بیچ نکلنے کی گنجائش بھی رکھتا ہے۔ گویا اسے ٹٹولتا ہے تم میرے ساتھ کس حد تک بڑھ سکو گے؟ یہ جملہ مرد کہتے تو ایک عام سی بات ہوتی ہے لیکن عورت کہے تو خاص بات ـــــ یہ عورتوں کے فقرے جیسے ـــــ "جھوٹے کہیں کے" "میں مر گئی" وغیرہ

"اس میں تکلیف کی کیا بات ہے؟" موہن بولا ـــــ "میں گھر ہی تو جا رہا ہوں راستے میں آپ کو چھوڑ دوں گا۔"

گوریڈیو کلب موہن کے دماغ سے اپنے آپ براڈکاسٹ ہو گئی تھی۔

تھوڑی حیص بیص کے بعد اچلا گدگری، موہن جام کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔

گاڑی فریئر روڈ کی طرف سے نکلی۔ کراسنگ پہ پولیس مین نے الٹا ہاتھ دے رکھا تھا۔ جس کی وجہ سے موہن کو گاڑی روکنی پڑی۔ موہن پولیس مین کے اُلٹے ہاتھ پہ ہمیشہ جھلایا اور منہ میں گالیاں منمنایا کرتا تھا لیکن آج وہی ہاتھ لے مسیح کا ہاتھ معلوم ہو رہا تھا۔

"دیبی کیسی ہے؟" ـــــ موہن نے گفتگو کا موضوع ڈھونڈ ہی لیا۔

اچلا نے جواب دیا ـــــ "ویسی ہی ـــــ"

"کیا مطلب؟" موہن نے چونک کر کہا "میں تو سمجھتا ہوں، وہ ایک بہت ہی نیک لڑکی ہے۔"

"میں نے کب کہا، بُری ہے؟" اچی بولی اور ہنسنے لگی۔

موہن اچی کے جال میں آ گیا تھا اور اب یونہی بچ نکلنے کے لیے ادھر اُدھر اپنے پر پُھڑ پھڑا رہا تھا۔ پسینے کے باریک سے قطرے اس کے ماتھے پہ چلے آئے۔ اچلا اس سے دور ہٹ کر دروازے کے ساتھ لگی بیٹھی تھی جیسے کپڑا بھی چھو گیا تو کوئی رشتہ پیدا ہو جائے گا۔ اپنی جھینپ مٹانے کے لیے موہن بولا ـــــ "آپ مجھ سے اتنی دُور کیوں بیٹھی ہیں؟"

"یونہی" اچلا نے کہا اور مشکل سے اینچ بھر موہن کی طرف سرک آئی ـــــ "میں نے سوچا آپ کو گیئر بدلنے میں تکلیف نہ ہو۔"

"پھر وہی ـــــ تکلیف!"

جب تک پولیس مین نے ہاتھ دے دیا تھا۔ لیکن موہن کی کار بدستور کھڑی تھی۔ پولیس مین کی سیٹیاں اور پچھلی کاروں کے ہارن ایک ساتھ سنائی دینے لگے۔ موہن نے

جلدی سے گاڑی کو گیئر میں ڈالا اور گھبراہٹ میں فوراً پیر کلچ پر سے ہٹا لیا۔ گاڑی جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھی۔ بند ہوتے ہوتے رُکی۔ پولیس لین سے کچھ آگے نکلے تو اچلا بولی ______

"کیا آپ گاڑی ایسے ہی چلاتے ہیں ______"

"نہیں" موہن نے کہا ___ "میں تو اتنے پیار سے چلاتا ہوں کہ پتا بھی نہیں چلتا ___ مگر آج"

"آج کیا ہوا؟"

"آپ ہوئی ہیں ____ اور کیا ہوگا؟"

موہن اور اچلا دونوں ٹاون ہال کے سامنے جا رہے تھے۔ نہ جانے کیوں موہن کا جی چاہ رہا تھا آج کوئی ایکسیڈنٹ ہو جائے۔ ایک بس تیزی سے گزری اور موہن کو اپنے اندر اس عجیب سی خواہش کو دبانا پڑا۔ سامنے ٹاون ہال کی طرف جاتی ہوئی سیڑھیوں پر سے ہال کی طرف دیکھتے ہوئے موہن نے کہا ___

"کتنا اچھا ہے"!

"بہت اچھا ہے"!

اَلفنسٹن سرکل کی طرف سے جوانی کے عالم میں بکھری ہوئی ایک بے حد خوبصورت لڑکی ایک لڑکے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے رجسٹرار کے دفتر کی طرف جا رہی تھی۔ شاید اس کی شادی ہونے والی تھی۔ اسی لیے اس کا چہرہ کسی اندرونی تمازت سے تمتمایا ہوا تھا۔ اچلا نے موہن سے پوچھا ______ "آپ کو کیسی معلوم ہوتی ہے؟"

"اچھی"

اور موہن نے "اچھی" کچھ اس انداز سے کہا کہ اچھی اور اچّی میں کوئی فرق نہ رہا۔ اچّی خوش ہو گئی کوئی کیا کر سکتا تھا ___ وہ خوش ہو گئی۔ یونہی دکھاوے کے لیے بولی ___ "میں اتنی خوبصورت کہاں ہوں"!

موہن نے ایک نظر اچلا کی طرف دیکھا اور وہ سب کہہ دیا جو وہ یوں نہ کہہ سکتا تھا۔

کالا ہال، لوائین گیٹ گزر گئے اور اب موہن کی گاڑی ریگل سنیما کے پاس سے نکل رہی تھی۔ سامنے کا بت من موہنا تھا۔ پھلیرے کی دکان اچھی تھی ____ گاڑی کازدے پرستیہ سدن کے سامنے رُک گئی جہاں اچّی رہتی تھی۔

اچّی نے چھچھلتی نظر سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ سوائے سامنے کے ٹیلر ماسٹر کے جو اچّی کا

ناپ جاتا تھا۔ کسی دوسرے نے اچلا کو دوسرے کسی کی کار سے اترتے نہ دیکھا تھا۔ دیکھتا بھی تو اسے کیا پروا تھی؛ موہن کو کیا حیا تھی؛ اس پہ بھی ایک دم دروازہ کھول کر اچلا گاڑی سے اتر گئی۔ تھوڑا ٹھٹھک کر ____ "اچھا موہن جی، بہت بہت شکریہ" کہا اور چل دی۔

موہن بدستور ڈرائیور کی سیٹ پہ بیٹھا تھا۔ ایک ٹانگ اندر تھی اور دوسری کھلے ہوئے دروازے کے باہر۔ وہ اتر کر اچلا کے لیے دروازہ کھولنا چاہتا تھا لیکن اس نے موقع ہی نہ دیا کچھ دور جا کر اچلا کو جیسے کچھ یاد آیا ___ وہ تھوڑا رکی اور جو کہا بھی تو صرف اس لیے کہ وہ اسے نہ کہنا چاہتی تھی اور اپنے اندر کسی فقرے کو روکے ہوئے تھی ___ لیکن ___ بعض وقت جسم روح سے بھی آگے نکل جاتا ہے ____

"کبھی آیئے گا موہن جی"۔

اور موہن کے جواب کا انتظار کیے بغیر اچلا گھر کی طرف لپک گئی پیچھے جیسے موہن ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔ "آؤں گا، آؤں گا کیوں نہیں؟"

اچلا کا خیال تھا _____ موہن اتنا تو سمجھ دار ہوگا ہی۔ ان کے گھر نہ ہونے پہ ___ کتنا برا معلوم ہوتا ہے۔ یہ دعوت تو صرف تکلف کی بات تھی!

موہن واقعی سمجھ دار تھا۔ ورنہ وہ دوسرے ہی دن اچلا کے ہاں پہنچ جاتا؛ جب کہ اپنے پتی رام گدکری کا اچلا کے دماغ میں تصور بھی نہ تھا۔

موہن جام نے گھنٹی کچھ اس زور سے بجائی کہ اچلا گھبرا کر بھاگی چلی آئی۔ جیسے رام اگلے ہی روز کسی پشپ بوان پہ بیٹھ کے آ گئے۔ ابھی تو ___ اچلا کو کپڑے بھی ٹھیک کرنے کا موقع نہ ملا تھا۔ دروازہ کھولتے ہوئے اس نے تھوڑا سا منہ باہر نکالا اور پھر ایکا ایکی پیچھے ہٹ گئی اپنے آپ میں سمٹ گئی اور بولی ____ "ذرا رُک جایئے ___"

پھر وہ اندر بھاگ گئی۔

موہن میں اتنی تاب ہی کہاں تھی؛ وہ تو نیچے ہی سے یوں آیا تھا جیسے فسٹ گیر میں لگا ہو۔ اس نے دروازے کو یوں ہلکا سا دھکا دیا اور وہ کھل گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ ڈرائنگ روم میں تھا اور سر گھما گھما کر اندر کی سب چیزوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے تو سر پہ بھی جیسے کوئی آنکھ تھی، جہاں وہ کھڑا تھا۔ وہاں سے اچلا کا بیڈ روم صاف دکھائی دے رہا تھا۔

عورت اور گھر میں فرق ہی کیا ہے؛ کم سے کم پوچھ تو لینا چاہیے۔ آخر اتنا بھی کیا؟ لیکن موہن پیر سے سر تک اَڈا ہوا تھا۔ جیسے اچلا بیڈ روم کے کھلے دروازے میں سے سمٹی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ دونوں بالکل ایسے تھے جیسے جذبات اور خیالات، آنکھوں اور جسم کے اعتبار سے بھگوان نے انھیں بنایا تھا۔ اچلا پلنگ کی پائنتی پر سے ساری اٹھا کر جلدی جلدی میں آسے پیچھے کے کپڑوں پہ لپیٹ رہی تھی۔

"معاف کیجیے ـــــ" موہن جام نے وہیں سے کہا اور وہیں سے ویسا ہی اچلا نے جواب دیا ـــــ "کوئی بات نہیں۔"

ڈرائنگ اور بیڈ روم کے بیچ ایک چھوٹی سی جگہ تھی۔ جہاں شیشے کے ایک کیبنٹ کے اندر شیو جی بھولے ناتھ کی تصویر ٹنگی تھی اور اس پہ ایک باسی ہار لٹک رہا تھا۔ یہی نہیں، ساتھ کنواری مریم کی شبیہ بھی تھی اور گورو نانک کی بھی ـــــ اور اس کے ساتھ ہی باہر ایک کلنڈر لٹک رہا تھا جس پر لیڈا ننگی کھڑی تھی اور ایک راج ہنس اسے اپنے پروں میں دبائے چونچ اٹھائے خوشہ چینی کی کوشش کر رہا تھا۔

اس ایک لمحے میں موہن جام نے دنیا بھر کی عورتیں دیکھ لی تھیں سومترا دیکھ لی تھی اور دیبی دیکھ لی تھی، زانا گیبور دیکھ لی تھی، کوئی اور بھی دیکھ لی تھی اور رادھا دیکھ لی تھی جو موہن کی سگی بہن تھی اور پارلیں میں اپنے ویونگ ماسٹر پتی کے ساتھ رہتی تھی۔

موہن نے ہمیشہ عورت کو مایا کے روپ میں دیکھا تھا۔ وہ باہر سے اور اندر سے اور معلوم ہوتی تھی۔ اچھا اور برا، گناہ اور ثواب، کبھی خوبصورت، کبھی بدصورت طریقے سے آپس میں گھلے ملے ہوتے تھے۔ پھر جو عورت کپڑوں میں بھری پری دکھائی دیتی وہ دُبلی نکلتی اور دُبلی دکھائی دینے والی بھری پُری ـــــ اسے ہی تو مایا کہتے ہیں یا لیلا۔ مثلاً

ایسی تندرست عورت جسے دیکھتے ہی گردے میں درد ہونے لگے، اس سے ڈرنا بے کار کی بات ہے اور ہڈیوں کے ڈھانچے سے الجھنے پہ اتنا بھی نفع نہیں ہوتا جتنا کسی مزدور کو بیس سیر لکڑیاں کاٹنے سے۔

مایا ـــ جس کے بارے میں سوچیں کہ رام ہوئی، وہیں حکمت ناکام ہوئی اور جس کے بارے میں کہیں یہ ہاتھ نہ آئے گی، وہی گردن دبائے گی ـــــ اور مایا کیا ہوتی ہے؛ ـــــ البتہ ایک اور مایا ہوتی ہے جو پا لینے کے بعد بھی حاصل نہیں ہوتی۔ اس دنیا سے جاتے سمے یوں معلوم ہوتا ہے آپ نے کسی کو نہ پایا، آپ کو سب نے پا لیا۔

جبھی ساری اور بالوں کو ٹھیک کرتی ہوئی اچلا ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔ وہ کتنی حسین لگ رہی تھی۔ کیا صرف اس لیے کہ وہ دوسری عورت تھی؟ نہیں نہیں، وہ پہلی ہوتی تو بھی اتنی ہی خوبصورت معلوم ہوتی اس میں ـــــ کوئی بات تھی، جو کسی دوسری میں نہ تھی لیکن ـــــ ایسا تو پھر ہر ایک کے بارے میں کہہ سکتے ہیں۔ مگر اس کی بھووں پر بچپن کی کسی چوٹ کی وجہ سے ہلکی سی خراش تھی جس نے بالوں کی تحریر کو دو حصوں میں بانٹ دیا تھا اور وہ خراش ہی تھی جسے چوم چوم لینے کو جی چاہتا تھا۔

موہن کے قریب آتے ہوئے پھر سے ہاتھ اوپر اٹھا کر اچلا نے سامنے سے اپنے بال قدرے اوپر اٹھا دیے۔ بالوں کا ایک TIARA سا بن گیا تھا۔ سونے اور ہیرے کے تاج جس کا مقابلہ نہیں کر سکتے وہ اپنی ہی ساری کے پلّو سے اپنے آپ کو ہوا کرتی ہوئی آئی۔

"اُف! آج کتنی گرمی ہے ـــ"

اور پھر ہاتھ دائیں طرف بڑھاتے ہوئے دیوار پہ پنکھے کے سوئچ کو دبا دیا۔ جبھی موہن بولا ـــــ "میں بھی سوچ رہا تھا ـــ"

"کیا سوچ رہے تھے آپ؟" اچلا نے ایک منتظر نگاہ سے موہن کی طرف دیکھا۔

"یہی" موہن نے کہا "آج کتنی گرمی ہے۔ اُف!"

اور جب پنکھے سے ہوا کا پہلا جھونکا آیا تو موہن اور اچلا تسکین کا سانس لیتے ہوئے آمنے سامنے صوفے پہ بیٹھ گئے۔ کتنا ظلم تھا۔ وہ ایک دوسرے کے پاس بھی نہ بیٹھ سکتے تھے۔ سب کچھ کتنا غیر فطری معلوم ہو رہا تھا۔ یہ ٹھیک بھی تھا اگر دنیا بھر کے

مردعورت، فطری، زندگی گزارنے لگیں تو کیا ہو؟ لیکن ـــــ مرد اور عورت دونوں نامکمل ہیں۔ ان کی تکمیل ـــــ ؟ جسموں کو مارئیے گولی، روحوں کو پالینے کے لیے بھی کیا ایلاسکا سے ہو کر آنا پڑے گا؟

ایسے ہی تکلف میں لوگ ایک دوسرے سے میلوں دور چلے جاتے ہیں۔ پھر عجیب طرح کی کشاکش شروع ہوتی ہے، جان نہ پہچان اور آتے ہی ہاتھ پکڑ لیا اور یہ بھی ـــــ پہلے کیوں نہ بلایا؟ کیا سمجھتے ہو؟ ـــــ محبت کے کھیل میں تو پہلی نظر، پہلا جملہ اور پہلی ہی حرکت ابد پہ چھا جاتی ہے ـــــ ایک دن دیبی ایک پینٹر کے بارے میں کہہ رہی تھی جس سے وہ محبت کرتی تھی اور اب بھی کرتی ہے ـــــ "میں تو اپنا سب کچھ اس پر لٹا دیتی لیکن چھوٹتے ہی کیسے بھونڈے طریقے سے اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور میرے سب چھوٹے بڑے راز جاننے کی کوشش کرنے لگا ـــــ ایسے تھوڑے ہوتا ہے؟ میں نے اسی بھونڈے طریقے سے اسے روک دیا۔ اب میں اس کے پیچھے بھاگ رہی ہوں اور وہ کسی ضد میں پڑ گیا ہے۔ جانے سمے کا وہ کون سا انش تھا جس میں ـــــ سنا ہے وہ اگری پاڑے میں کسی رنڈی کے پاس جاتا ہے ـــــ"

اچلا کے کوئی بچہ نہ تھا۔ پانچ چھے سال کی شادی کے باوجود اس کی ممتا ویسے ہی دبی پڑی تھی۔ البتہ پندرہ سولہ برس کی ایک نوکرانی تھی جو اچّی کے اشارے پہ چائے بنا کر لے آئی۔ پھر ایک پلیٹ میں ختائیاں بھی لائی جو اچلا نے گھر میں ہی بنائی تھیں جن پہ پستہ فراوانی سے بکھرا ہوا تھا۔ نوکرانی نے موہن کو "کبھی دیکھا تو نہیں" کے انداز میں دیکھا اور پھر رسوئی میں کام کرنے کے لیے چلی گئی۔

"لڑکی اچھی معلوم ہوتی ہے۔" موہن نے ختائی منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہاں" اور اچلا نے اندر کی طرف دیکھا: "پر جوان لڑکیوں کو گھر میں رکھنا نہیں چاہیے۔"

"کیوں ـــــ رکھنا کیوں نہیں چاہیے؟"

"کیا بتاؤں؟" اچلا ہنس دی: "روز کوئی نیا البیلا دروازے پر موجود ہوتا ہے۔"

اور پھر دونوں مل کر ہنسے۔ موہن نے بات شروع کی ـــــ "میں بھی تو ہوں۔"

اچّی کے چہرے پر لالی دوڑ گئی۔ نگاہیں چراتے چائے میں چمچ ہلاتے ہوئے بولی ـــــ "منہ پر کی بات دوسری ہے۔" اور پھر ایکا ایکی ـــــ "اب کے رام آئیں گے تو انھیں آپ سے ملواؤں گی، بڑے مزے کے آدمی ہیں۔"

موہن نے چھیڑا ـــــ "اس کا مطلب ہے، اس سے پہلے نہ آؤں؟"

"نہیں نہیں" اچلا نے گھبراتے ہوئے کہا ـــــ "آپ جب جی چاہے آئیے ـــ آپ کا اپنا گھر ہے۔"

پھر اچلا نے سوچا، "وہ کیا کہہ گئی، عورت ہونا بھی ایک ہی مصیبت ہے۔ کیوں وہ ہر وقت ڈری رہتی ہے۔ کیوں، کہتی کچھ ہے، مطلب کچھ اور ہوتا ہے۔"

اور اچلا نے رام گدکری کی باتیں شروع کر دیں۔ جیسے ان سے اچھا مرد کوئی اس دنیا میں نہیں۔ ایک رام ایودھیا میں پیدا ہوئے تھے اور ایک اب بیسویں صدی میں پیدا ہوئے ہیں اور کولابا میں رہتے ہیں۔

موہن جام کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ سومترا کی باتیں کرے۔ دونوں میں فاصلہ اور بھی بڑھ گیا تھا اور برابر بڑھتا جا رہا تھا۔ ان کے جانے بوجھے بغیر۔ وہ ایک دوسرے سے دور ہو کر قریب ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ موہن نے بتایا۔ سومترا بڑی گریٹ عورت ہے لیکن اس کی صحت کی خرابی نے پوری زندگی پہ ایک غم کی چھاپ لگا دی ہے۔

جبھی نوکرانی ہاتھ پونچھتی ہوئی آئی ـــــ "بائی میں جاؤں؟"

"نہیں نہیں" اچلا نے موہن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ـــــ "کپڑے دھو، جا کر، دیکھتی نہیں غسل خانے کے پاس کتنا ڈھیر لگا ہے؟ چلو، چلو ـــــ"

اور نوکرانی منہ پھلاتی ہوئی چلی گئی۔ اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا؟

موہن بدستور سومترا کے بارے میں کہہ رہا تھا ـــــ "دس سال سے جس عورت نے تمھارا ساتھ دیا ہو، اسے تم صرف اس لیے چھوڑ دو کہ وہ بیمار ہے، جس نے اپنی جوانی کے بہترین سال تمھاری خدمت میں لگا دیے اور جس کی صحت کی خرابی کے تم ذمّے دار ہو ـــــ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا ـــــ"

اور موہن کی آنکھوں میں آنسو چلے آئے۔

اچلا کو نہ جانے کیا ہوا۔ اس میں برسوں سے دبی ہوئی کوئی چیز اُبل پڑی ـــــ

"نہیں نہیں، موہن جی" وہ بولی ـــــ "ٹھیک ہو جائیں گی" اور پھر موہن کے ایک دم پاس پہنچتے ہوئے اس نے اپنی ساری کے پلّو سے موہن کی آنکھیں پونچھ دیں۔

موہن ایک قطعیت کے ساتھ اٹھا اور بولا ـــــ "اچھا ـــــ میں چلوں گا۔"

"بیٹھیے تو کچھ دیر" اچلا نے پھر ویسا ہی جملہ کہا۔

لیکن موہن نے انکار کر دیا۔ اس نے جلدی سے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا اور بولا۔ "مجھے ساڑھے گیارہ بجے اجوانی پیپر ملز میں جانا ہے۔"

اور موہن فریادی نظروں سے اچلا کی طرف دیکھتا ہوا چلا گیا۔

اچلا اٹھی۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ بیڈ روم میں جا کر اس نے اپنے سراپا کی طرف دیکھا ـــــ وہ کیسی لگ رہی تھی۔ اسے اپنا آپا اچھا لگا۔ پھر وہ نوکرانی کے پاس پہنچی

"تمھارا جو ہنی نہیں آیا؟" اچلا نے کہا۔

اس بات کا جواب دینے کے بجائے روزی بولی ـــــ "وہ صاحب جو آئے تھے چلے گئے؟"

"ہاں" اچلا کو کتنی تسلی تھی۔

"تم جو ہنی کے ساتھ پکچر چلی جانا" اچی نے کہا: "تمھارے سب لڑکوں سے ایک وہی مجھے ٹھیک معلوم ہوتا ہے ـــــ"

اور روزی ایکا ایکی خوش ہو اٹھی۔

اچی سے موہن کی غالبًا یہ پانچویں یا چھٹی ملاقات تھی۔ اب وہ ٹیلر ماسٹر اور دوسرے لوگوں کی نظروں سے بچتی بچاتی موہن کی گاڑی میں آ بیٹھتی تھی اور دونوں شام کو ہوا خوری کے لیے نکل جاتے تھے۔

اس اثنا میں موہن نے سومترا کو ہفتے میں ایک چٹھی لکھنے کی بجائے تین تین لکھنا شروع کر دیں۔ ایک چٹھی میں تو مذاق بھی کیا ـــــ "اگر تم نہ آؤ گی تو میں کسی دوسرے

سے لَو لگا لوں گا۔" اور یوں اس نے سومترا کو بے فکر کر دیا۔

ایک شام کو پریچ کے پاس سے ہوتی ہوئی گاڑی بیک بے کے پاس اندھیرے میں کھڑی ہو گئی۔ اچلا نے بھی اعتراض نہ کیا۔ آج وہ بائیں دروازے کے ساتھ لگ کر بیٹھنے کے بجائے سیٹ کے عین بیچ میں بیٹھی تھی۔ موہن جام کے ہاتھ سیٹ پر اچی کے گرد تھے اور اچی ایک ہاتھ سے نیوٹرل میں پڑے ہوئے گیئر کو فرسٹ اور سیکنڈ میں لگا رہی تھی جیسے وہ گاڑی چلانے کی کوشش کر رہی ہو۔

موہن نے اچلا کا ہاتھ تھام لیا۔ مزاحمت تو ایک طرف، اس نے موہن کا ہاتھ دبا دیا۔ اور دونوں کچھ لمحوں کے لیے خاموش ہو گئے۔ حتیٰ کہ موہن کو کہنا پڑا ـــــ

"گدکری کب آنے والے ہیں؟"

"یہی کوئی دو ایک دن میں۔"

"کانفرنس لمبی ہو گئی؟"

"بھگوان جانے ـــــ ان مردوں کا کیا پتا، کسی سوتن کے سنگ راس رچا رہے ہوں۔"

"کیا بات کر رہی ہو؟" موہن نے اچی کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا ـــــ "وہ تو بھگوان رام ہیں تمھارے لیے۔"

"بھگوان رام ہوتے تو سیتا کو ساتھ نہ لے جاتے؟"

موہن نے ہنستے ہوئے کہا ـــــ "اب سیتا کانفرنس میں تھوڑے ہی جا سکتی ہے؟"

اور موہن نے اچی کی بغل میں ہاتھ ڈال کر اسے کچھ اور اپنی طرف کھینچ لیا۔ اچی نے تھوڑی سی مزاحمت کی۔ لیکن پھر جیسے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اسے یوں بھی کسی آسایش کی ضرورت تھی۔ کیوں کہ جب سے گاڑی بیک بے میں آ کر اندھیرے میں کھڑی ہوئی تھی، اس نے اندر ہی اندر کانپنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی نسوں کو کسی آرام کی ضرورت تھی۔ اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے اپنا سر موہن کی چھاتی پر رکھ دیا ـــــ

موہن اچلا سے پیار کرنے ہی والا تھا کہ ایک آدمی گاڑی کے پاس چلا آیا اور بولا ـــــ "ناریل پانی؟"

"نہیں چاہیے" موہن نے اچلا سے الگ ہوتے ہوئے کہا۔ لیکن ناریل والے

کو بدستور وہیں کھڑے پا کر وہ ایک دم جھلّا اٹھا ——— "اَبے کہا نا ——— نہیں چاہیے"
"اور پھر ——— "جاتا ہے یا !" ——— اور موہن جیسے اسے مارنے کے لیے لپکا۔

اچلا نے اسے پیچھے سے پکڑ لیا ——— "کیا کر رہے ہیں؟" کچھ گھبراتے اور اپنے کپڑے درست کرتے ہوئے بولی ——— "دیکھتے نہیں۔ اس کے ہاتھ میں چھری ہے؟"

"ہو گی!" موہن نے بے پروائی کے انداز میں کہا۔

ناریل والے نے اپنی مالاباری زبان میں کچھ کہا اور چلا گیا۔ کچھ دور پتھر کی دیوار پہ بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے آواز دی ——— "جا کرا بابو ——— جا کرا ———"

موہن تھوڑا پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا اور اچلا سے کہنے لگا ——— "گھر چلتے ہیں؟"

"کس کے گھر؟"

"میرے ——— تمھارے روزی کیا وہیں ہو گی؟"

"نہیں ——— وہ پکچر دیکھنے گئی ہے، اپنے جوہنی کے ساتھ۔"

"تو پھر ——— ٹھیک ہے ———"

"نہیں نہیں" وہ بولی ——— "گھر پہ ہمیں کیا کرنا ہے؟"

دراصل اچلا کو گھر میں وہ شیشے کا کیبنٹ اور اس میں لگی ہوئی تصویریں یاد آ گئی تھیں)۔ وہ تو اپنے شوہر سے بھی پیار کرنے سے پہلے بیچ کا دروازہ بند کر لیا کرتی تھی۔ اس کے بعد پتھر پہ بیٹھے ہوئے بے فکرے کی موجودگی کے احساس سے بے خبر ہو کر جب موہن نے اچلا کا منہ چوما تو اس میں پہلی سی خود سپردگی نہ رہی تھی ——— "نہیں نہیں" اس نے خفیف سا ہو کر کہا جو احتجاج تھا اور نہیں بھی۔ البتہ جب موہن نے ہاتھ بڑھا کر اچی کے چھوٹے بڑے راز معلوم کرنے کی کوشش کی تو وہ بدک کر الگ ہو گئی۔ موہن کو بُرا سا لگا۔ اس نے کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد پھر ایک بھرپور حملہ کیا لیکن اچلا کسی نہایت ہی مضبوط قلعے میں محبوس ہو بیٹھی تھی۔ وہ شکایت کے لہجے میں بولی ——— "نہیں نہیں، اتنا ہی بہت ہے۔"

"بے وقوف نہ بنو، اچی!" موہن نے برافروختہ ہو کر کہا ——— "نہیں تم بھی دیبی کی طرح پچھتاؤ گی۔"

"نہیں موہن" اچلا نے بڑے پیار سے روٹھتے ہوئے کہا ——— "پیار کا بھی

مطلب تھوڑے ہوتا ہے؟"

"جو ہوتا ہے، وہ سمجھا دو۔"

"کیوں؟ ——— بہن بھائی کا پیار نہیں ہوتا؟"

"ہوتا کیوں نہیں؟" موہن نے اپنی مردانہ خفّت کو چھپاتے ہوئے کہا اور اسے اپنی بہن رادھا یاد آ گئی جو پاریل میں رہتی تھی۔

"یہ رشتہ تو ہم ہمیشہ نہیں رکھ سکتے" اچی بولی ——— "ایک دو روز میں یہ آ جائیں گے ——— مہینے ڈیڑھ مہینے میں سومترا بہن بھی لوٹ آئیں گی۔"

"ہوں!"

"بہن بھائی کا پیار ہے جس میں کوئی ڈر نہیں، کوئی کھٹکا نہیں۔"

"ٹھیک ہے" موہن نے اپنے ماتھے پر سے پسینا پونچھتے ہوئے کہا ——— "آج سے میں نے تمھیں بہن کہا" اور زنّاٹے سے گاڑی چلا دی۔

"اچی بہت ڈر گئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے موہن کا بایاں بازو پکڑ لیا اور شانے پہ اپنے بالوں کا خوبصورت تاج رکھتے ہوئے بولی ——— تم تو روٹھ گئے۔"

"روٹھوں گا کیوں؟" موہن نے کہا ——— "بھلا بھائی بھی بہن سے روٹھ سکتا ہے؟" اچلا نے جھٹکے سے اپنا سر موہن کے کاندھے سے ہٹا لیا۔

کچھ دیر کے بعد گاڑی ستیہ سدن کے سامنے کھڑی تھی۔ آج دروازہ کھولنے کے لیے موہن نے ذرا بھی جدوجہد نہ کی۔ اچلا بے دلی سے اتری۔ سامنے کا ٹیلر ماسٹر غور سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا اور آس پاس کے کچھ لوگ بھی۔ لیکن اچلا کو جیسے کوئی ڈر نہ لگ رہا تھا۔ اس نے آج موہن کا شکریہ بھی ادا نہ کیا۔ وہ بے حد متفکر تھی۔ ایسے وسوسے اور ڈر اس کے دل میں پیدا ہو گئے تھے جنھیں وہ خود بھی نہ جانتی تھی۔ اسے ایک ڈر تھوڑے ہی تھا۔ ہزاروں تھے جن میں سے ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا اور پہچاننا ممکن نہ تھا

"اب آؤ گے؟" اس نے پوچھا۔

"آؤں گا، آؤں گا کیوں نہیں؟" موہن نے کہا اور پھر ایک دم کھلکھلا کے ہنس دیا

جیسے کوئی بچے کو ڈرا تو سکتا ہے، مگر ایک حد تک، اس کے بعد موہن ٹاٹا کہہ کر چل دیا۔ اچلا جب گھر لوٹی تو کسی قسم کا بوجھ اس کے سر سے اتر چکا تھا ——

اگلے ہی روز گدکری چلے آئے۔

اچی انھیں اسٹیشن پہ لینے گئی تو یہ دیکھ کر حیران ہوئی۔ اس کے شوہر نے مونچھیں رکھ لی ہیں۔

"یہ کیا؟" اچلا نے پوچھا۔

"ایسے ہی" اس کے پتی نے ہنستے اور عاشقانہ نظر سے اپنی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا —— "من کی موج ——"

اور پھر قلی کے سر پر سوٹ کیس رکھواتے، اچی کے پاس آتے ہوئے بولے —— "بری لگتی ہیں؟"

"نہیں، بری نہیں لگتیں مگر —— یوں معلوم ہوتا ہے جیسے میں کسی اور ہی مرد کے ساتھ جا رہی ہوں" اچلا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

رام گدکری نے چھیڑا —— "اچھا ہے نا، ایک ہی زندگی میں دو مرد دیکھ لیے"

اس نے سوچا اچی ہنسے گی اور اس لطیفے سے پورا لطف اٹھائے گی یا دھپ سے پیٹھ پہ ہاتھ مار کے کہے گی "شرم نہیں آتی؟ ——" لیکن اچلا نے کچھ نہ کہا۔ الٹا جیسے کسی فکر کی پرچھائیں اس کے چہرے پر سے گزر گئی۔ ایک متجسس نگاہ سے اس نے رام کے چہرے پہ دیکھا جو مونچھوں کی وجہ سے پہلے سے بھی زیادہ بے وقوف نظر آ رہا تھا۔ اچلا کو یقین ہو گیا، کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہے۔ اب وہ پیار کی باتیں کر رہی تھی مگر —— مگر رام گدکری کانفرنس کا قضیہ لے بیٹھے تھے۔

گھر پہنچ کر اچی نے اپنے پتی کو سامان بھی ٹھیک سے نہ رکھنے دیا۔ وہ ایک بچی کی طرح مچل گئی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی اندر بیڈ روم میں لے گئی اور اس کے گلے لگ کر زار زار رونے لگی۔ رام گدکری حیران ہی تو رہ گیا —— "ارے! گیارہ ہی دن تو لگے ہیں"

لیکن اچی رو رہی تھی اور مچل رہی تھی۔ اسے لپٹاتے، دلاسا دیتے ہوئے آخر میں رام نے کہا —— "مجھے کیا معلوم تھا تم اتنا ہی ڈر جاؤ گی"

"میں یہ سب ڈر کے مارے کر رہی ہوں؟" اچلا نے ایک دم پرے ہٹتے ہوئے کہا۔

"نہیں —— پیار کے مارے" اور رام گدکری ہنس دیا۔ آگے بڑھ کر پھر سے اچی کو آغوش میں لیتے ہوئے بولا —— "میں جانتا ہوں، اچی —— میں بھی تم سے اتنا ہی پیار کرتا ہوں"

"بس؟"

"اس سے بھی زیادہ"

"جھوٹے کہیں کے —— مجھ سے پیار کرتے تو یہ —— مونچھیں رکھتے؟"

اچلا کا خیال تھا رام نے مونچھیں کسی لڑکی کی انگیخت پہ رکھی ہیں۔ رام سمجھ گیا۔ اسے اچلا کے جذبات سے زیادہ اپنے سمجھ جانے پہ خوشی تھی۔ پیار میں اس نے منہ آگے بڑھایا تو اچلا نے منہ پیچھے کی طرف موڑ لیا جس پہ رام نے وعدہ کیا اگلے ہی روز وہ مونچھیں وونچھیں سب منڈا ڈالے گا۔ اپنی ہی نہیں، جو بھی دکھائی دے گا، اس کی بھی ——

دو ایک روز کے بعد، وعدے کے مطابق موہن جام چلا آیا۔ پہلے تو اچی چونکی۔ پھر اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے وہ اپنے پتی رام گدکری کی طرف لپکی اور بولی —— "جی میں نے آپ کو بتایا ہی نہیں۔ میں نے اپنا ایک بھائی بنایا ہے"

"بھائی؟ —— بنایا ہے؟"

"ہاں" اچلا کہنے لگی —— "کیا بھائی نہیں ہوتے؟"

اور اسی طرح رام گدکری کو پکڑ کر اچلا موہن جام سے ملوانے کے لیے اسے ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ دونوں مرد ایک دوسرے سے اس طرح ملے جیسے وہ نا سمجھی کے عالم میں ملتے ہیں۔ یہ نہیں کہ رام گدکری نے موہن جام کو ٹھیک طریقے سے اٹھایا بٹھایا نہیں یا اس کی مناسب خاطر مدارات نہیں کی۔ اس نے سب کچھ کیا لیکن وہ ایسے ہی تھا جیسے آدمی کچھ نہیں سمجھتا مگر کرتا چلا جاتا ہے۔ مسکراہٹیں بنا دی تھیں، ہنسی بنا دی تھی ——

اور اچلا تھی کہ لٹی جا رہی تھی۔ ایک بار بھائی کہہ دینے کے بعد جیسے چھٹی ہو گئی۔ اس

نے نہ صرف چائے خطائی وغیرہ سامنے رکھیں بلکہ روزی کو بھی بازار بھیج دیا۔ کچھ نمکین چیزیں لانے کے لیے۔ رام گدکری یہ سب برداشت کر رہا تھا لیکن ایک چیز جو اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی وہ یہ تھی کہ موہن جام کے آنے پر اچلا اسے بھی بھول چکی تھی۔ جو اس کا پتی تھا، اس کے بھائی کا جیجا۔ اور رام گدکری دیکھ رہا تھا کہ ایسا کرنے میں اچلا کتنی بے بس ہے۔

جب کوئی چیز لینے کے لیے اچلا اندر جاتی تو یہ مرد لوگ ایک دوسرے سے سرسری طور پر تکلف، محض تکلف میں ایک آدھ جملہ کہتے۔ رام گدکری کچھ کانفرنس کا رعب ڈالنے کی فکر میں تھے اور موہن جام اس شپ مینٹ کا ذکر کر رہے تھے جو انھوں نے ابھی ابھی جاپان سے منگوایا تھا۔ دونوں کے فقرے بیچ میں ٹوٹ ٹوٹ جاتے تھے۔

اچلا اندر سے آئی تو وہ ساری بدلے ہوئے تھی اور سامنے کے بالوں میں پھر سے کراؤن بنا لیا تھا اور خوشبو تو اس کے ساتھ ہی باہر لپکی آئی تھی۔

"بھابی نہیں آئیں بھائی صاحب! ——؟" اچلا نے پوچھا اور پھر رام گدکری کی طرف منہ کرتے ہوئے بولی —— "وہ کشمیر گئی ہیں —— میں ملی تو نہیں، پر سنا ہے بڑی اچھی عورت ہیں؟"

"اچھی ہوں گی" رام نے اتفاق کیا۔

اور پھر رام متعجب سی نگاہ سے موہن جام کی طرف دیکھنے لگا۔

سب کچھ کھا چکنے اور مصافحے کے بعد موہن جام اُٹھ کر چل دیا: "میں ابھی آتی ہوں" کہہ کر اچلا دروازے تک اسے چھوڑنے گئی اور پھر کسی خیال کے آنے سے وہ دروازے نکل کر لینڈنگ تک اور پھر لینڈنگ سے بھی نیچے چلی گئی۔ حالانکہ اس کا شوہر، مہمان کو رخصت کرنے کے لیے تھوڑی دیر کے لیے محض تکلفاً اٹھا تھا۔ یوں بھی سالے بہنوئی میں سالے کا رشتہ چھوٹا ہوتا ہے!

نیچے بازار میں آنے سے پہلے موہن جام کا جی چاہا وہ اچلا سے پیار کرے۔ اچلا کتنی اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ صرف اس کا ہاتھ پکڑ سکا جسے اس نے کچھ پیار سے دبایا اور بولا —— اچلا! کبھی تم بھی میرے ہاں آؤ نا!"

"آؤں گی" اچلا نے کہا اور پھر بولی —— "ان کو بھی لاؤں گی!"

اس کے بعد اچلا گاڑی تک چلی آئی۔ موہن جام رخصت ہونے تو اچلا اور موہن دونوں کی آنکھیں نم تھیں۔

اچلا اتنی ہی تیزی سے اوپر چلی آئی۔

رام گدکری کو اچلا نے سوچنے کا موقع ہی نہ دیا۔ وہ بولتی چلی گئی —— "دیکھیے میرے بھائی صاحب؟ —— اچھے آدمی ہیں، لاکھوں میں ایک ——"

رام سر ہلاتا گیا۔ حالانکہ اس کے ماتھے پہ تیور تھے۔ یہ بیچ میں خواہ مخواہ کا بھائی آ ٹپکا۔ اس کی ضرورت کیا تھی؟ کچھ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ جبھی تو اس نے کہا —— "اگر سچ مچ تمھارا بھائی بہن کا رشتہ ہے تو پھر بھائی صاحب کیوں کہتی ہو —— بھیا جی کیوں نہیں کہتیں؟"

"لو، یہ بھی کوئی بات ہے بھلا؟"

اور اچلا بدستور موہن کے گُن گاتی گئی۔ کیسے وہ دیپ کے ساتھ سیر کر رہی تھی تو کچھ موالی پیچھے لگ گئے۔ اگر موہن جام وہاں نہ آجاتا تو جانے کیا ہوتا۔ اور اچلا کو اس رشتے کی صحت اور صفائی جتانے کے لیے اور بھی بہت سے جھوٹ بولنے پڑے، جن کی ضرورت نہ تھی۔ کیوں کہ یہ رشتہ بھگوان نے نہیں انسان نے بنایا تھا ——

اس کے بعد ایک دو بار پھر موہن جام آیا اور اچلا اسی طرح سے بے اختیار اور بے خود پلکی جھلکی۔ موہن جام کے چلے جانے کے بعد رام گدکری دیر تک خاموش بیٹھے رہے حتیٰ کہ اپنی خاموشی انھیں خود ہی ناگوار سی محسوس ہونے لگی۔ سامنے طاق پہ ٹرانسسٹر پڑا ہوا تھا، جس کی سوئی گھماتے ہوئے رام نے اچلا سے کہا ——

"جانتی ہو ٹرانسسٹر کسے کہتے ہیں؟"

"یہی جو سامنے پڑا ہے!"

"نہیں" رام نے خفگی اور کچھ مسکراہٹ کے ملے جلے جذبات میں کہا —— "سسٹر بہن کو کہتے ہیں اور ٹرانسسٹر وہ بہن ہوتی ہے جو سگی نہ ہو، ایسے ہی بھاڑے میں لے کر بنائی ہو —— اسی لیے تم شور بھی مچاتی ہو!"

اچلا کو بہت غصہ آیا —— "کیا مطلب؟ —— آپ بہن اور بھائی کے

رشتے پہ شک کرتے ہیں؟ اس کا مذاق اڑاتے ہیں؟"

"میرا مطلب ہے ——"

"میں سب جانتی ہوں" اچّی نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "تم مرد لوگ سب کمینے ہو، تمھاری نظروں میں کوٹ کوٹ کر غلاظت بھری ہے —— کیا دنیا میں مرد عورت، پتی پتنی بن کر ہی مل سکتے ہیں؟ کیا سنسار میں ——" اور اچّی کا گلا بھر آیا۔ وہ روتی ہوئی کیبنٹ کے سامنے بھگوان کی تصویر کے پاس جاکر دوزانو ہوگئی اور دہائی دینے لگی —— "میں نے کوئی بھی پاپ کیا ہو بھگوان، تو میرے شریر میں کیڑے پڑیں۔ کوڑھ لگ جائے ——"

رام اب پچھتانے لگا تھا۔ پھر بھگوان کی مند تھی۔ اس نے پیچھے سے آکر اچلا کو دونوں کاندھوں سے پکڑ کر اٹھایا لیکن اچلا نے اس زور سے جھٹک دیا کہ رام دیوار سے جا لگا۔ سر پہ معمولی سی چوٹ بھی لگی۔ اچلا اتنی تندرست تھی کہ رام گدگری ایسے اکہرے بدن والے آدمی کا اسے سنبھالنا مشکل تھا۔ پھر وہ اندر جاکر، اپنے آپ کو بستر پر گرا کر زور زور سے رونے لگی۔

رام اب بہت پچھتا رہا تھا اور آپ جانتے ہیں پچھتاتے ہوئے مرد کی کیا شکل ہوتی ہے؟ رام کی ساری شام اچّی کو منانے میں لگی۔ حالانکہ وہ برلا متو شری سبھا گھر میں ولایت حسین کا ستار سننے کے لیے جانے والا تھا اور اچلا کے لیے ٹکٹ بھی خرید کر لایا تھا۔ جواب اس نے حسین مگر غصیلی بیوی کے سامنے پھاڑ کر پھینک دیا۔ پھر وہ وہیں بستر پر پڑی گھر کے اس ستار کی کمر میں بانہہ ڈال کر اس کے تار درست کرنے لگا۔ چونکہ استاد آدمی نہ تھا اس لیے ایک بھی سُر ٹھیک نہ نکلا۔ آخر اس نے کہا بھی تو صرف اتنا —— "میں تم پہ اتنا سا بھی شک کروں، اچّی، تو کالے کھاؤں، میں تو صرف یہ کہتا ہوں، تمھارے اپنے بھائی بھی تو ہیں ——"

"کہاں ہیں؟" —— اچلا بولی۔ —— "ایک کلکتہ میں بیٹھا ہے، دوسرا بجواڑے میں۔"

"پچھواڑے میں بھائی کا ہونا ضروری ہے؟"

"ہاں، ضروری ہے۔" اچّی نے سر کو ایک فیصلہ کن جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ "کوئی تو ہو، تم سے پوچھنے والا ——" رام گدگری پھر بھی کچھ نہ سمجھا۔ بڑی مرگھلی سی آواز میں اس نے کہا —— "تمھاری مرضی، لیکن میں تو سمجھتا ہوں، اس کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"تمھیں مونچھیں رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟"

مہینے ڈیڑھ کے بعد سومترا چلی آئی۔

سومترا پہلے سے واقعی اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ بچّے کی بھی صحت پہلے سے اچھی تھی وہ کاشمیری زبان کے چند لفظ سیکھ آیا تھا جسے جا اور بے جا طور پر استعمال کرتا رہتا تھا۔ سومترا بار بار اسے پکڑ کر کہتی —— ڈیڈی کو یہ سناؤ، ڈیڈی کو وہ سناؤ —— لیکن وہ بدمعاش وہی رٹے ہوئے فقرے دہراتا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ کاشمیری زبان کی گندی گالیاں تھیں۔

موہن جام نے اچلا کی سی حماقت نہ کی۔ سومترا سے اچلا کی ملاقات کروانے سے بہت پہلے اس نے کہہ دیا کہ اس نے ایک بہن بنائی ہے۔

سومترا سنتی رہی۔ اسے اپنے موہن پہ پورا بھروسا تھا؟ نہیں —— وہ ان عورتوں میں سے تھی جو مرد کے لاابالی پن سے محبت کرتی ہیں اور یا ان کی صحت اس غایت درجے کی خراب ہوتی ہے کہ وہ محبت کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتیں اور زندگی کو ہر حالت میں موت پر ترجیح دیتی ہوئی کچھ ایسے فقرے کہتی ہیں —— "جھک مارتے ہیں تو مارتے پھریں" اور پھر —— "بھگوان کو جواب انھیں دینا ہے، مجھے تو نہیں دینا۔" آخر رات کو چپکے میں ایسی آواز میں روتی ہیں جو انھیں خود بھی سنائی نہیں دیتی۔

سومترا نے کہا بھی تو صرف اتنا —— "ضرورت کیا تھی؟ تمھاری اپنی بہن جو تھی۔ اس پہ نچھاور کرو اپنا پیار —— یا ایسی ہی کوئی پیار کی باڑھ آئی ہے؟"

"ہاں،" موہن نے قدرے درشتی سے کہا۔

سومترا دب گئی۔ صحت تو خراب ہونا ہی تھی، ابھی سے کیوں شروع ہو؟ اس نے جواب کے سے انداز میں سوال کیا —— "رادھا کیسی ہے؟"

"میں تو اس سے ملا نہیں۔"

"ہائے رام ـــ جب سے میں گئی ہوں، اپنی بہن سے بھی نہیں ملے؟"

"وقت نہیں ملا۔"

"اور وہ خود بھی نہیں آئے؟" ـــ رادھا اور کیلاش پتی؟"

"آئے تھے، تین چار بار ـــ لیکن میں ہی گھر پہ نہ تھا۔"

سومترا کہنا چاہتی تھی ـــ ملتے بھی کیسے؟ وہ تو سگی بہن تھی بنائی ہوئی تھوڑی تھی؟ لیکن اس نے کچھ نہ کہا اس کی صحت ابھی بہت اچھی نہ تھی۔

اور پھر موہن جام نے جوڑ کر دیا ـــ "چوبیس کو رکھشا بندھن کا تیوہار ہے، جاؤں گا اور مل آؤں گا۔" ـــ

رکھشا بندھن کے دن موہن جام پاریل اپنی بہن رادھا کے ہاں پہنچا۔ ساتھ سومترا بھی تھی۔ رادھا یوں پر پھیلا کر لپکی جیسے برسوں کے بعد ملی ہو۔ اسے اس بات کا احساس بھی نہ تھا کہ وہ عورت ہے اور نہ موہن کو اپنے مرد ہونے کا پتا تھا۔ اس نے رادھا کو گال سے چوم لیا پھر سر پہ پیار سے ہاتھ پھیرا۔ اور بہن کی آنکھوں سے شکایت کے آنسو پونچھے۔

کچھ دیر بعد رادھا بڑے مزے سے اٹھی اور لکڑی کی جالی میں سے مٹھائی کی تشتری اٹھا لائی۔ پھر چوکی سامنے رکھ کر بھائی کو بٹھایا۔ اس کا منہ پورب کی طرف کیا۔ جاجو، موہن کا بچہ بھی ساتھ دوسری چوکی رکھ کر بیٹھ گیا۔ جیسے اشٹمی کا لینکڑا۔

"ارے!" رادھا نے جاجو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ـــ "پہلے تو راکھی بندھوائے گا؟"

"ہاں" جاجو نے گھڑا سا سر ہلایا۔

"پہلے تو میں اپنے بھائی کو باندھوں گی۔"

"نہیں، پہلے میرے باندھو۔"

"ایسا ہی حکم چلاتا ہے" رادھا پیار سے بولی: "تو بھگوان سے کہہ کہ تجھے بھی ایک بہن لا دیں، چھوٹی سی۔ جو ہر سال راکھی باندھا کرے۔"

اور ایسا کہنے میں جاجو، موہن اور کیلاش پتی، تینوں نے سومترا کی طرف دیکھا جس

نے شرما کر منہ ساری میں چھپا لیا۔

رادھا نے موہن بھیا کی کلائی پہ سادہ سی موتی کی راکھی باندھی منہ میں میٹھے کا ایک ٹکڑا ڈالا۔ موہن نے جیب سے دس روپے کا ایک نوٹ نکالا اور رادھا کی ہتھیلی پہ رکھ دیا۔ رادھا نے اس کا نوٹ اپنی آنکھوں سے لگایا اور پرارتھنا کی ـــ "یہ دن ہر بہن کے لیے آئے بھگوان!" اور اس کی آنکھوں میں پیار اور عقیدت کی نمی تھی۔

سومترا اور بچے کو گھر چھوڑ کر موہن جام اچلا کے ہاں جانے کے لیے نکلا۔ وہ سومترا کو بعد میں کبھی لے جانا چاہتا تھا، اس روز نہیں۔ اس کی کوئی خاص وجہ تھی۔ عورتیں کئی باتوں میں مردوں کو خواہ مخواہ روکتی رہتی ہیں ـــ یہ کرو، وہ نہ کرو ـــ جیسے عورتوں کی بہت سی باتیں مردوں کی سمجھ میں نہیں آتیں اسی طرح مردوں کی بعض باتیں عورتوں کے پلّے نہیں پڑتیں۔

موہن بازار میں ایک کپڑے کی دکان پہ گیا۔ بہت کچھ الٹ پلٹ کرنے کے بعد اسے بنارس کی ایک ساری ملی جس پہ ہلکی ہلکی زردوزی کی گئی تھی۔ اس پہ بھی اس کی قیمت سوا تین سو روپے طے ہوئی۔ موہن نے پیسے دیے۔ ساری کو ایک خوبصورت سے گفٹ پیپر میں بندھوایا اور کازوے پر کے ستیہ سدن کے لیے چل نکلا۔

اچلا اپنے گھر میں بیٹھی قینچی ہاتھ میں لیے کچھ کتر بیونت کر رہی تھی جو صبح ہی سے ختم نہ ہوئی تھی۔ رام گدکری کھڑکی میں کھڑا یونہی بازار میں لوگوں کو دیکھ رہا تھا اور نیچے ٹیلر ماسٹر کی دکان پہ آتے جاتے ہر آدمی کے سر پہ اپنے سگریٹ کا گل جھاڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جبھی سامنے موہن جام کی کار آکر رکی۔

پیچھے ہٹتے ہوئے رام گدکری نے آواز دی ـــ "اچی"

"جی" اچی نے بڑی مٹھاس سے جواب دیا۔

"وہ آیا ہے۔"

"کون وہ —— ؟ بھیّا جی —— ؟"

"بھیّا جی نہیں —— مچلا"

"مچلا ؟"

"ہاں —— تو اچلا ہے نا اور وہ مچلا ——"

جب تک موہن دروازے پہ آچکا تھا، گھنٹی بجا چکا تھا، روزی دروازہ کھول چکی تھی۔

رام گدکری کا خیال تھا کہ موہن اس دن نہیں آئے گا اگر وہ راکھی بندھوانے کے لیے آگیا تو پھر وہ کوئی گڑبڑ نہیں کرسکتا۔ پھر تو سب ٹھیک ہے اور موہن آگیا تھا۔ جس کے لیے اچّی صبح ہی سے کلابتون اور جھل مل اور نہ جانے کن کن چیزوں سے ایک خوبصورت راکھی بنا رہی تھی۔ رادھا کی غریبانہ، مولی کی راکھی تو موہن نے اتار کر کہیں پھینک دی تھی اور اب —— اس کی کلائی پہ کچھ بھی نہ تھا۔ موہن کے آتے ہی اچلا ہمیشہ کی طرح بوکھلا کر اٹھی اور بھاگ کر ڈرائنگ روم میں چلی آئی اور اس کی یوں آؤ بھگت کی جیسے کوئی راجا کی کرتا ہے۔

رام گدکری ہمیشہ کی طرح سمجھ رہا تھا اور نہیں بھی سمجھ رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں موہن جام پورب کی طرف منہ کیے پیڑھی پہ بیٹھا تھا اور گدکری کچھ پرے بے اعتنائی سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔

جبھی اچلا آئی۔ وہ بہت چست قمیص اور شلوار پہنے ہوئے تھی۔ گلے میں پیاز کے چھلکے کی طرح کا ایک دوپٹا تھا جس نے اچّی کے گلے اور سینے کو صحت کا رنگ دے دیا تھا۔ قمیص نے چھاتی، کمر اور نچلے حصّے کی بہت ہی خوبصورت حد بندیاں کر رکھی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں تھالی تھی جس پہ رکھی ہوئی مٹھائی پہ سونے کے ورق کانپ رہے تھے اور اس کے ایک طرف راکھی تھی جس کی جھل مل میں کچھ سچے موتی ٹنکے ہوئے تھے۔

موہن نے بڑی ہمت سے ہاتھ بڑھایا۔ اچلا نے جب موہن کی کلائی پہ راکھی باندھنا شروع کی تو رام گدکری کو اس کے ہاتھ خوشی سے کانپتے ہوئے دکھائی دیے۔ پھر موہن نے مٹھائی کے ٹکڑے کے لیے منہ کھولا اور اچلا نے اس میں تلاقند رکھ دی۔ جبھی موہن نے گفٹ پیپر کھولا اور اس میں سے ساری نکالی، اس پہ سو روپے کا نوٹ رکھا اور دونوں چیزیں اچلا کی طرف بڑھا دیں۔

رام گدکری کی آنکھیں تھوڑی دیر کے لیے پھیلیں اور پھر معمول کی سی ہوگئیں۔

رکھشا کی یہ رسم ادا کرنے میں اچلا بھی خاموش تھی اور موہن بھی۔ دونوں کے بدن میں ایکا ایکی کہیں ہاتھ چھو جانے سے ایک بجلی سی دوڑ گئی۔ پھر اچلا نے دھیمی سی آواز میں کہا:

"یہ دن بار بار آئے بھگوان ——" اور جب موہن نے اچلا کی آنکھوں میں دیکھا تو ان میں حیا کی سُرخی تھی۔

کچھ دیر بعد یونہی سی گفتگو کے بعد موہن نے رام گدکری سے ہاتھ ملایا۔ اچلا سے نمستے کی اور چل دیا۔ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے ایک آہ بھری اور چل دیا۔

اچلا ہمیشہ کی طرح اسے نیچے چھوڑنے کے لیے جانا چاہتی تھی، لیکن آج —— اس کے پیر جواب دے گئے تھے۔

"تمھیں خوش ہونا چاہیے" اچّی رام نے کہا —— "بھائی کو راکھی باندھی ہے"

"ہاں!" اچّی نے کہا —— "پر آج صبح ہی سے میری طبیعت کچھ ——"

"صبح ہی سے تو یہ سب بناتی رہی ہو۔ اکٹھا کرتی رہی ہو!"

اچلا نے سر ہلا دیا۔ رام نے آگے بڑھ کر کہا —— "میں تو سمجھتا تھا تم اپنے بھائی کی دی ہوئی ساری پہن کر مجھے دکھاؤ گی"

اچّی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھیں بند سی ہوتے دیکھ کر رام گدکری نے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا اور بڑے پیار سے بولا —— "کیا ہوگیا میری اچّی کو؟"

"کچھ نہیں" اچّی نے ایک دھیمی سی آواز میں، کہا اور پھر اپنا بازو رام کے گرد ڈالتے ہوئے بولی —— "مجھ سے پیار کرو"

رام نے اچّی کو سینے سے لپٹا لیا اور بھینچنے لگا۔

"اور" —— اچّی نے کہا۔

اس کے بعد اچّی کی آنکھیں بند تھیں اور منہ کھلا ہوا —— جب تک موہن جا، اچلا اور رام گدکری کے خیالوں سے بھی پرے جا چکا تھا

حجّام الٰہ آباد کے

میں جہاں ڈائیک پر کھڑا ہوں، یہاں سے نظارہ بہت خوبصورت ہے —— یہ گدلی گنگا، وہ نیلی جمنا، اور بیچ میں کہیں سرسوتی مائی ہے، جو آج تک کسی کو نظر نہیں آئی ہے۔ ہم ان تینوں دریاؤں، کو تربینی کہتے ہیں اور جی میں آئے تو ان کے ملاپ کی وجہ سے سنگم بھی کہہ ڈالتے ہیں۔ موڈ موڈ کی بات ہے۔

یہ سنگم یوں تو اور بھی بہت سے کام آتا ہے لیکن کسی مرے ہوئے لیڈر کی ہڈیاں بہانے کے لیے بہت ہی اچھا ہے۔ یہ قلعہ جو آپ دیکھ رہے ہیں، مغل شہنشاہ اکبر نے بنوایا تھا۔ اس کی نگاہ کتنی دور رس تھی گویا وہ صدیوں پہلے جانتا تھا کہ چین کی طرف سے حملہ ہوگا تو یہاں پہنچتے پہنچتے تو رُک ہی جائے گا۔ کچھ دریا روک لیں گے، رہا سہا یہ قلعہ روک لے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جمنا کا پانی آج تک اس قلعہ کے پیر دھو دھو کر پیتا ہے۔

پیچھے الٰہ آباد کا شہر ہے۔ نہ معلوم اسے کس فقیر کی دُعا لگ گئی کہ ہر سال گنگا اور جمنا میں باڑھ آنے پر بھی یہ نہیں ڈوبتا۔ دارا گنج کے آس پاس کچھ جھونپڑیاں، کچھ کچے مکان ہیں جن کی بَلی دے کر یہ پھر سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاتا ہے، جیسے کوئی زچہ چھٹی نہا کر اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ آج شہر پر کوئی دھند سی چھائی ہے یا شاید لوگوں کی آہوں کا دھواں ہے، فضا کی سرد

مہری جسے اوپر نہیں اٹھنے دیتی۔ نیچے زمین روکتی ہے، اوپر آسمان ٹوکتا ہے، لوگ بڑی خوشی سے گھٹ گھٹ جانے والی ان آہوں کو پھیپھڑے سانس بنا کر استعمال کرتے ہیں۔

دور، بائیں طرف الٰہ آباد کا نیا اسٹیشن ہے جو کمبھ کے موقع پر آنے والے بیشمار یاتریوں کے لیے بنوایا گیا اور جس پر ہماری سرکار کے لاکھوں روپے لگے ہیں۔ کوئی ضروری نہیں اس اسٹیشن پر صرف یاتری لوگ ہی اتریں۔ ہم اور آپ بھی اتر پڑیں تو کوئی نہیں روکتا۔ یہ لوک راج ہے نا —— جیسے سانجھی دادکی پوٹ لگی ہے۔ جیسے بھانگ کو سنکھیے کی پوٹ لگا دی جائے تو وہ بھی تیز ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ہمارا یہ لوک راج اور بھی نشہ آور ہو گیا ہے —— اسٹیشن کے پیچھے سول لائنز کا علاقہ ہے جسے بنا تو انگریز گیا، استعمال ہم کر رہے ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس میں شرم کی کوئی بات نہیں اس نے ایک گرجا بھی بنوایا جو بہت پکا ہے۔ پچھلی صدی میں چھاؤنی کے جتنے انگریز افسر مرے، ان کی روحیں اب تک اس گرجے میں عبادت کرنے آتی ہیں اور خدا سے دُعا کرتی ہیں کہ انھیں بہشت کے عیش و آرام سے چھٹکارا دلوا کر، ایک بار پھر الٰہ آباد کی چھاؤنی میں بھیج دے —— تو گویا ہر شام یہاں پُرانا الٰہ آباد، تیل میں سر بسائے، منہ کو گلوری میں دبائے اس نئے موڈرن الٰہ آباد سے گلے ملنے چلا آتا ہے اور کافی یا وہسکی پی کر، کسی مولوی کی طرح چوری کی مرغی بغل میں دبائے، کہیں بھی نکل جاتا ہے۔

میں —— مجھے الٰہ آباد ہی کا سمجھو۔ یوں میں بیلہ ٹکئی کا رہنے والا ہوں جو یہاں سے پچاس ساٹھ میل پرے ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ برسوں پہلے اہیر بڈھے نے بیٹھے بیٹھے منوں ہی سن بٹ ڈالی، سیکڑوں ہی روپے بنائے لیکن سب کے سب میری پڑھائی پر ڈبو دیے۔ خود تو اندھا ہو گیا پر مجھے دکھنے لگا۔ یہ کالا اچھر جو ہمارے دیس کے بہت سے لوگوں کو بھینس برابر معلوم ہوتا ہے، مجھے بھوری پڑیا نظر آتا ہے۔

میں اس الٹی طرف بمرولی کے ہوائی اڈے پر کلرکی کرتا ہوں —— دس بجے مجھے دفتر پہنچنا ہے۔ لیٹ ہو گیا تو میرا سیکشن انچارج بہت خفا ہوگا وہ بے حد نروس آدمی ہے اور بلڈ پریشر کا مریض مجھے اپنا تو کچھ نہیں، البتہ مجھے گالی دیتے ہوئے وہ کا بچارا، منہ پر جھاگ لایا اور گر گیا تو پھر —— میرا کیا ہوگا؟ لیکن، خیر —— کوئی بات نہیں،

ابھی بہت ٹائم ہے۔ پھر حجام لوک پتی کے گاہک بھی دھیرے دھیرے کم ہوتے جا رہے ہیں۔

ہاں تو، وہاں بردلی کے ہوائی اڈے پر جب میں آفس کے کیبن میں بیٹھتا ہوں تو کھڑکی سے مجھے ہوائی جہاز اترتے چڑھتے دکھائی دیتے ہیں۔ رن وے چھوٹا ہونے کی وجہ سے بڑا جیٹ ہوائی جہاز تو کوئی نہیں آتا۔ البتہ چھوٹے چھوٹے جھنبٹ سے بیسیوں آتے ہیں جیسے میل چڑھے غسل خانے میں ریت مکھی اپنے آپ پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی یہ جہاز ایکا ایکی آسمان کے کسی کونے سے ٹپک پڑتے ہیں۔ اگرچہ وہ سب چھوٹے ہیں لیکن آدمی ان میں سے بڑے اترتے ہیں۔ کبھی کبھی سانپوں رسّہ اُچھالنے والے مداریوں، ہاتھیوں، راجاؤں مہاراجاؤں اور ناگا سادھوؤں کی تلاش میں باہر سے ٹورسٹ بھی آ جاتے ہیں اور ہمیں اتنا سکھی دیکھ کر بڑے دکھی ہوتے ہیں۔ بس میرا تعلق باہر کی دنیا سے صرف اتنا ہی ہے اور یا پھر میں اخبار "لیڈر" پڑھ ڈالتا ہوں۔

اب لوک پتی زیادتی کر رہا ہے۔ دیکھیے مجھے ادھ منڈا چھوڑ کر اس نے ایک اور گاہک کو پکڑ لیا۔ میں اس کی طرف نظروں کے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہتا ہوں "دیا کرو، لوک پتی! ـــــ میری حالت پر ترس کھاؤ۔"

"ابھی لو ببوا" لوک پتی کہتا ہے: "ابھی پٹ سے صفاچٹ ہوا جاتا ہے۔" اور اپنے استرے سے وہ گاہک کے چہرے پر دو ایک خوبصورت سے خط بنا دیتا ہے۔ جبھی وہ ایک اور گاہک کو پکڑ لیتا ہے جو میری طرح چلاّتا ہے ـــــ

"مجھے دفتر جانا ہے۔"

"سبھوں کو جانا، ببوا، سبھوں کو جانا۔"

اور لوک پتی کی آوازیں ہار سے ملی جلی، ایک فلسفیانہ سی جیت ہے جس کی نبیاد ہمارے صدیوں کے پرانے گرنتھوں اور شاستروں پر قائم ہے معلوم ہوتا ہے اس وقت وہ میرے دفتر کی نہیں، بھگوان کے گھر کی بات کر رہا ہے، مر کر جہاں ـــــ سبھوں کو جانا ہے! سوا آٹھ ہو گئے ـــــ زندگی بیتی جا رہی ہے، دفتر بیتا جا رہا ہے ـــــ یہاں سے گھر، گھر سے دفتر، دفتر سے شمشان ـــــ بیچ میں ازل ہی سے تھکی ہاری بیوی ہے

جھپٹ ـــــ مار کے بجائے کھانا کھانا ـــــ کھانا بھی وہ جو پکار پکار کے کہہ رہا ہے کھا، نہ، کھا، نہ ـــــ سوائے گود کے بچے کے باقی کے سب یا تو اسکول جا چکے ہوں گے اور یا باہر مٹی میں رُل رہے ہوں گے میں تو کہتا ہوں رُل ہی جائیں تو اچھا ہے ـــ ارے ہاں! ایک بات تو آپ کو بتائی ہی نہیں۔ میں جواہر نگر میں رہتا ہوں جسے بنے بہت عرصہ نہیں ہوا۔ اس لیے سارے کا سارا نگر دھول اور مٹی سے اٹا ہے۔ میں مٹی کو بہت پسند کرتا ہوں۔ ایک تو اس لیے کہ میرا اور آپ کا، سب کا خمیر مٹی سے اٹھایا گیا ہے اور دوسرے اس لیے کہ جب تک کسی بچے کو مٹی کا چمبن نہ ملے وہ پنپتا ہی نہیں۔ بیس بیس روپیا پانے والے ٹیوشنوں پر جینے والے اسکول کے ٹیچر اس بات کے مہتو کو کیا سمجھیں؟ ذرا کسی بچے کے کپڑوں پر مٹی دیکھی، الٹا ماں کے پاس بھیج دیا۔ جو پہلے ہی گربھ وتی ہے۔ عورتوں کی زبان میں "اس کی وہ تو پا جائے سے بھی چھو جائے تو پیٹ ہو جاتا ہے۔"

نیچے ٹریفک بھی بھربھری ہے یا شاید دفتر سے لیٹ ہو جانے کا ڈر ہے جس کے کارن زمین پانو تلے سے سرکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے جیسے برسوں پہلے، کمبھ کے میلے پہ جو سیکڑوں ہزاروں لوگ اسٹیمپیڈ میں دب گئے تھے، ان میں سے کوئی بچ گیا اور اب منوں مٹی کو سر پر سے ہٹاتے ہوئے باہر آنے کی کوشش کر رہا ہے۔ سن رہے ہو؟ معلوم نہیں ہوتا جیسے دور نیچے سے ایک کورس کی آواز آ رہی ہے "آہستہ چل، ہو سکے تو چل ہی مت ـــــ تیرے قدموں کے نیچے ہزار جانیں ہیں ـــــ"

لوگ جیسے پاتال سے نکلنے کا جتن کر رہے ہیں۔ قلعے کے اندر، جہاں اوپر بندر ہیں، نیچے مندر ہیں۔ کوئی کرشن جی کا، کوئی مہابیر جی کا اور کوئی کالی مائی کا۔ وہ سب قلعے میں، زمین کے نیچے کچھ یوں دبے ہوئے ہیں کہ ان کے اندر جانے سے بھی ڈر لگتا ہے۔ لیکن اگر انسان آسمان کو ٹھگلی لگا سکتا ہے، چاند ستارے سے گلے مل سکتا ہے تو کیا نیچے پاتال تک ہی نہیں پہنچ سکتا؟ اس گائے کے سینگوں کو نہیں چھو سکتا جو صدیوں سے ہماری اس دھرتی کا بوجھ اٹھائے کھڑی ہے اور وہ بھی ایک سینگ پر؟ جس کے کارن ہماری زمین سورج کے گرد ٹیڑھی گھومتی ہے اور بیکار کے موسم بناتی رہتی ہے۔ آج پوس

کیوں نہ بنواتا جاؤں؟ اپنا استرا ذرا کند ہوگیا۔۔ کوئی سلّی ہی نہیں ملتی اسے لگانے، تیز کرنے کے لیے۔"

"تم بھی سیفٹی استعمال نہیں کرتے؟" اگر مجھ سے پوچھتا ہے۔

"آں ہاں ـــــ" میں کہتا ہوں "سیفٹی کے ساتھ مزہ نہیں آتا۔"

"تف" اگر سر ہلاتے ہوئے کہتا ہے "یہ ہم ایسے ان سائنٹیفک لوگوں ہی کی وجہ سے ہے جو ادھر بیویوں کو اور ادھر دیس بھر کو مصیبت پڑی ہوئی ہے۔ خواہ مخواہ کی دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی جا رہی ہے۔"

"تو پھر کیا کرنا چاہیے؟"

تمھارے اور میرے جیسے لوگوں کو تو خصّی کر دینا چاہیے ـــــ" اس سے تو اچھا ہے، حجامت کے لیے وہاں، سیلون چلے جایا کرو۔"

"نہ بھیا" میں کہتا ہوں "سیلون منہگا پڑتا ہے۔ گھر ہی اچھا ہے۔ تو آج اُن کے چکّر میں کیسے پڑ گیا؟"

"کیا بتاؤں یار؟" اُگر داڑھی کے ان کٹے حصّے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتا ہے۔ "سوناتھ سے میرے موسا دیناناتھ آئے تھے کہنے لگے سنگم پر نہائیں گے۔ میں نے کہا 'نہائیے، میرا کیا جاتا ہے؟ جب تک میں حجامت بنوالوں گا' ـــــ" اور یوں میں ان کمینوں کے چکّر میں پھنس گیا۔"

اور میں اگرسین کی طرف دیکھ کر ہنستا ہوں۔ لوک پتی نے اس کے چہرے پر کیا خوبصورت ڈاک بنگلہ بنا دیا ہے یعنی کہ مکان بھی ہے اور لان بھی ہے۔ ایک طرف سفیدی، دوسری طرف سیاہی ـــــ معلوم ہوتا ہے، اپنے ہی ساتھ منہ کالا کیا ہے ـــــ اور پھر لکا یک میری ہنسی بند ہو جاتی ہے ـــــ میں بھی تو ایسا ہی بُودم لگ رہا ہوں۔ اُگرسین کہیں منہ نہیں دکھا سکتا تو میں بھی دفتر نہیں جا سکتا۔

ایک ہمدردی کی نظر سے اُگرسین کی طرف دیکھتے ہوئے میں اپنی باہیں اس کے گرد ڈال دیتا ہوں اور کہتا ہوں ـــــ "کوئی بات نہیں، دوست! زندگی میں ایسا بھی ہو جاتا ہے۔"

"زندگی کی ایسی تیسی" اُگرسین ایک دم آگ بگولا ہو کر کہتا ہے۔ بجائے اس کے

پڑ رہی ہے۔ کل جھلس دینے والی لُو چل رہی ہے ـــــ ابھی بارش سے برباد ہو رہے، پھر اوڑ لگنے سے مر رہے ہیں ـــــ اب کے جو لوگ پاتال سے آئے ہیں، عجیب سی خبر لائے ہیں ان کا کہنا ہے گا ـــــ بس سینگ بدلنے ہی والی ہے جس سے ساری دنیا ہل جائے گی، سب تہس نہس ہو جائے گا ـــــ نیچے کا اوپر، اوپر کا نیچے، دائیں کا بائیں ـــــ دیر تک زمین کانپتی رہے گی اور آخر تھم جائے گی اور صدیوں تک تھمی رہے گی۔ پھر گائے اسی وقت سینگ بدلے گی جب سائنس اتنی ترقی کر جائے گی کہ ہل دھرتی پہ چلنے کی بجائے دھرتی ہل پہ چلنے لگے گی۔ عورت کے پیٹ میں خالی ہوا رہ جائے گی اور مرد کے پیٹ میں بچّہ ـــــ

لوک پتی کا نیا گاہک چلّا رہا ہے۔ بات یہ ہے اس نئے گاہک کی حجامت شروع کر کے، اس کے چہرے پر تین چار خوبصورت سے خط لگا کر، لوک پتی نے اس غریب کو بھی بیچ ہی میں چھوڑ دیا ہے، اور ایک نئے گاہک کو پکڑ لیا ہے۔ اب وہ پہلا گاہک لوک پتی سے لڑ رہا ہے، اسے گالی دے رہا ہے ـــــ ارے یہ کیا ہوا؟ دہائی لاٹ صاحب کی ـــــ وہ پہلا گاہک چپکے سے چل دیا۔ وہ ـــــ میری طرف آ رہا ہے!

میں ـــــ اسے جانتا ہوں

"اگر؟ ـــــ اُگرسین"

"ہاں، جل توری! ـــــ تو یہاں کیسے؟" وہ مجھے دیکھتے ہوئے کہتا ہے ـــــ

یوں میرا نام بدھان چند ہے لیکن میرے ویجی ٹیرین ہونے کی وجہ سے وہ ہمیشہ مجھے جل توری ہی کہہ کر پکارتا ہے اور میں بھی اسے نہیں بتاتا کہ جل توری اصل میں مچھلی کو کہتے ہیں جو مانس سے بنی ہوتی ہے۔ اگر رہو ہو اور کتلا ہو تو اس میں پھر نام کے لیے ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے۔ اور اگر کہیں میری طرح کی ٹراؤٹ ہو تو ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہی نہیں۔ پھر مجھے جل توری پکارنے کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ پچھلے چناو میں میں نے کانگریس کو ووٹ دیا تھا۔ آج تو وہ لوک پتی پہ خفا تھا، ورنہ ہمیشہ وہ مجھے ماں بہن کی یہ موٹی موٹی گالیاں دیا کرتا ہے، میرا بڑا متر ہے!

میں کہتا ہوں ـــــ "بھائی میں تو اشنان کرنے آیا تھا، سوچا حجامت ہی

کر اس کی تسلی ہو میری ہمدردی کے الفاظ آگ پر تیل کا کام کر جاتے ہیں اور وہ گالیاں جو مجھے دیا کرتا تھا، حجاموں کو دینے لگتا ہے: "ان کی ــــــ ہر بات میں نفع خوری! اس نے پورے ملک کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔" اور پھر ایک اور گالی، پہلی سے ذرا چھوٹی عمر کی اور کنواری ــــ مجھے بڑی جلن ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے، میرے بجائے اس نے لوک پتی کو اپنا سالا بنا لیا ہے۔

"سنو گر" میں پوچھتا ہوں: "تم کب سے اہنسا کے قائل ہو گئے؟"

"کیا کرتا؟"

"ارے لگاتے پکڑ کے اُسے، دو چار۔"

اور ایسا کرنے میں میں اپنا مکا زور سے ہوا میں گھماتا ہوں۔ منہ میں گالیاں منمناتا ہوں جو سب نامرد لوگ کرتے ہیں ــــــ "کیوں تم نے اس کی پٹائی نہ کی؟"

"کیسے کرتا؟" اگر سین حجاموں کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا ہے: "یہ سامنے کیبنٹ ہیں نا، ان میں جتنے بیٹھے ہیں، سب کے ہاتھ میں ایک ایک استرا ہے۔"

پھر ہم دونوں مل کر ہنستے ہیں، ایکا ایکی خفا ہو اٹھتے ہیں اور پھر ایک دوسرے کے لنڈورے منہ کی طرف دیکھ کر کھل کھلا اٹھتے ہیں۔ آخر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جیسے کیسے بھی ہیں، اپنے دیس کے نائی ہیں۔ ہمارے بیٹے بیٹیوں کا یہی رشتہ لانے والے ہیں۔ ہمیں ان سے سامنے کا جھگڑا نہیں مول لینا چاہیے۔ آخر تو اپنا گلا ان ہی کے ہاتھ میں آنا ہے۔

سنگم پر عورتیں نہا رہی ہیں۔ ان میں سے ایک کا بھی جسم اچھا نہیں۔ کسی کا پیٹ لٹکا ہوا ہے تو کسی کی ٹانگیں اوپر اٹھی ہوئیں معلوم ہوتا ہے نیشنل بنک کا ٹیلر TELLER ہے جو اونچی کرسی پر بیٹھا ہوا پبلک کے ساتھ بزنس کر رہا ہے۔ ایک بڑھیا ہے، شہر کے گوالوں نے جس کی ممتا کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا اور بھرے بازار بیچ ڈالا پیٹھ سے لگا ہوا اس کا پیٹ سوکھی مرگھلی ٹانگیں اور کھنڈت سے بازو ہیں جو دیکھنے میں اوپر اٹھ کر سورج بھگوان کو انجلی ارپت کر رہے ہیں لیکن اصل میں لپک لپک کر کیندریہ سرکار کے محکمہ خوراک کی جان کو رو رہے ہیں۔ جیسے ہماری تصویر "پاتھر پنچالی" بدیس پہنچی ہے اور وہاں کے

لوگوں نے بہت پسند کی ہے۔ اسی طرح باہر کے لوگ اس بڑھیا کی تصویر دیکھ کر بہت خوش ہوں۔ فوٹوگرافی میں دنیا کا سب سے بڑا انعام اسے ملے اور دنیا بھر کے ملکوں سے غلّے کے جہاز کہیں اور جانے کی بجائے ہندستان کی طرف پلٹ پڑیں ــــ اچھی عورتیں ہمارے ملک میں کہاں رہ گئیں؟ وہ تو اب صرف کلینڈروں پر دکھائی دیتی ہیں بشرطیکہ وہ بھی "لیڈر پریس" میں چھپے ہوں ــــ ارے نہیں بھائی اب بھی کہیں کوئی ایک آدھ دکھائی پڑ ہی جاتی ہے۔ وہ دیکھو سامنے ــــ ایک نوعمر، نوخیز لڑکی بھوا ہے۔ چلو ایک تو ہے جس نے صبح کے خالی منظر کو بھر دیا، اور رام دھن کی یکساں اور تھکا دینے والی آواز مرتعش کر دی ــــ وہ ساری سمیت نہا رہی ہے لیکن بچاری، شرم کی ماری، ساری کے بغیر بھی ہوتی تو نظر نہ آتی ــــ پانی کی وجہ سے کپڑا اس کے بدن کے ساتھ چپک چپک جاتا ہے، ادھر ادھر دیکھتی ہوئی جسے وہ بار بار اپنے آپ سے علاحدہ کرتی ہے۔ ہندستانیوں کی پوری قوم کی طرح وہ اپنے جسم کو ناپاک اور نجس سمجھتی ہے اور اس غلط فہمی میں ہے کہ گنگا کا پانی اس کے عورت ہونے کی گندگی اور میل کو دھو ڈالے گا، اس کے جسم کو پاک کر دے گا۔ کوئی بھی پانی اس کے جسم کو پاک نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ وہ پانی جس سے زندگی عبارت ہے، اس میں کھل کے نہا نہیں سکتی۔ اس میں نہائے بغیر بھی نہیں رہ سکتی۔ اس کے بھائیوں کو اس احساس سے کوئی نہیں نکال سکتا کہ وہ جی رہے ہیں تو کتنا بڑا گناہ کر رہے ہیں۔ ان کے ذہن کی گہرائیوں میں یہ چیز بس چکی ہے کہ گائے کے دودھ پر صرف بچھڑے کا حق ہے اور وہ دودھ پیے بغیر نہیں رہ سکتے، بچھڑے کے ساتھ پاپ کیے بغیر بھی نہیں رہ سکتے...

ہا! یہ دنیا دکھ کا گھر ہے جس میں بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا رہی ہے، سانس بھی لیتے ہیں تو ہزاروں کیڑے ہوا کے ساتھ اندر جاتے ہیں، ہلاک ہو جاتے ہیں۔ کیا کوئی ذریعہ نہیں ــــ پران اور شاستر کا کوئی حوالہ نہیں جو اس سچ کو جھٹلا سکے کہ زندگی کا آدھار زندگی پر ہے؟ چلو زندہ رہنے کے لیے اگر زندگی لینا ہی ضروری ہے تو کم سے کم تتوودں کا ناش کیا جائے۔ مرد میں پانچ تتو ہوتے ہیں۔ ہوتے عورت میں بھی پانچ ہی ہیں۔ لیکن ہر دوسرے سال خاک اور خون میں لتھڑے بچّے پیدا کرنے، گھر بار میں الجھے رہنے کی وجہ سے آخر

ساڑھے چار رہ جاتے ہیں۔ گائے گھوڑے اور بکری میں چار، مرغی بٹیر میں تین، کیڑے مکوڑوں میں دو، اور پھل سبزی میں ایک —— اس لیے پھل اور سبزی ہی سے پیٹ کا نرک بھرنا اچھا آخر ایک ہی تتو کا ناش ہوتا ہے نا ....

ارے، یاد آیا —— مٹی اگرچہ اجاوہ ہوتی ہے اس پر بھی اس میں آدھا یا کوئی بھی تتو نہیں ہوتا۔ اس لیے مٹی کھانی چاہیے۔ میں بدھاں چند پرکھوں سے اچھا ہندو ہونے کے کارن کل سے مٹی ہی کا بھوجن کیا کروں گا۔

کشتی والے دھڑا دھڑ شردھا مارے لوگوں کو بیچ منجدھار کے لے جا رہے ہیں جہاں گنگا جمنا اور سرسوتی ملتے ہیں۔ پانڈے لوگ پوجا کے پھول ٹوکریوں میں لیے انھیں دے رہے ہیں اور مختلف بہانوں سے پیسے بٹور رہے ہیں۔ ہاں، پھول زمین پر تھوڑے اگتے ہیں؟ وہ زمانہ گیا جب کنول اپنے آپ کھل جایا کرتے تھے اور دھرتی کا الباس اوپر چلا آتا تھا۔ اور اس کی چھاتیوں پر موتیا اور کرنے اور مروا کے ساتھ چنبیلی، گلاب اور صدبرگ کے نقش و نگار بنا دیا کرتا تھا۔

یہ لیجیے نو بج گئے —— اب ہم زچ ہونے لگے ہیں۔

میں اور اگرسین دونوں ٹہلتے ہوئے لوک پتی کی طرف جانے لگتے ہیں۔ جبھی لوک پتی کا چوتھا گاہک بھی اپنی طرف آتا ہوا نظر آتا ہے۔ اگرچہ میں اسے نہیں جانتا۔ لیکن شکل ہی سے وہ اپنی برادری کا جان پڑتا ہے —— ویسے ہی آدھا منڈا ہوا، ویسے ہی دو چار خط چہرے کے بائیں طرف لگے ہوئے —— میں ذرا ہمت کرکے آگے بڑھتا ہوں اور اس سے پوچھتا ہوں ——

"کیوں بھیا، کیا حال ہے؟"

"اچھا ہے" وہ کچھ جھینپ کر کہتا ہے۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟"

"یہی —— دنیا کے رنگ"

اور پھر وہ داڑھی کے ان کٹے حصے پر ہاتھ پھیرنے لگتا ہے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ہم تینوں ہنس رہے ہیں اور پھر ایکا ایکی تینوں ہی خفا ہو اٹھے ہیں۔ میں اگر سے کہتا ہوں "یہ ٹھیک

ہے، لوک پتی کے ہاتھ میں استرا ہے لیکن اگر ہم چاروں مل کر اس پر جھپٹ پڑیں تو وہ ہماری داڑھی صاف کرے یا نہ کرے، ہم ضرور اس کی طبیعت صاف کر سکتے ہیں"

"اگر شک و شبہے کی نگاہ سے میری طرف دیکھنے لگتا ہے جیسے کہ رہا ہو —— چاروں مل کے؟" گویا کہ ہم چار کبھی مل ہی نہیں سکتے اور اگر مل گئے تو پھر ہم ہندستانی نہیں، ضرور ہم میں سے کسی کی رگوں میں بدیشی خون دوڑ رہا ہے۔ اگر مجھے دفتر نہ جانا ہوتا تو بھائی میں تو ضرور ان کے ساتھ مل جاتا ہاں، یہ چوتھا بھائی ہمارا —— خدا معلوم اس کی کیا آئیڈیالوجی ہے؟

ہمارا چوتھا بھائی ہنکارنے لگتا ہے —— وہ لوک پتی اور اس کے ساتھیوں کے خلاف زہر اگلنے لگتا ہے —— "یہ لوٹ کھسوٹ، یہ نفع خوری غیر قانونی، غیر جمہوری ہے۔ ہمیں اس کے خلاف جہاد کرنا چاہیے، بغاوت کرنی چاہیے" اور پھر وہ دور ہی سے حجاموں کو دھمکیاں دینے لگتا ہے۔ جب وہ شروع ہوا تھا تو میں سمجھا اس کے ہاتھ میں استرے سے بھی تیز کوئی ہتھیار ہوگا جسے گھماتے ہوئے وہ زور سے للکار دے گا۔ دنیا جہاں کے ان منڈے لوگوں کو اکسا بھڑکا کر اپنی مدد کے لیے آمادہ کر لے گا اور لوک پتی اور اس کے ساتھیوں کا خون کر ڈالے گا۔ لیکن یہ جان کر دُکھ بھی ہوا اور ہنسی بھی آئی کہ وہ بھی ہماری طرح پارلیمنٹری ڈیموکریسی کا قائل ہو گیا ہے، جہاں ہم تقریر کر کر کے ہار چکے ہیں، وہ نیا بھرتی ہونے کی وجہ سے ابھی تک جوش کے عالم میں چلاّ رہا ہے۔ زمین سے چار چار فٹ اوپر اچھل رہا ہے اور جب اچھلتا ہے تو کچھ آگے بڑھنے کی بجائے تھوڑا پیچھے ہٹ جاتا ہے ——

"یہ لوک پتی" وہ کہتا ہے "کہیں باہر سے دو اچھر تو پڑھ آیا ہے، اپنے آپ کو خدا سمجھنے لگا ہے۔ دنیا جہاں کی بہو بیٹیوں سے آنکھیں لڑاتا پھرتا ہے اور نہیں جانتا کہ اس کے اپنے گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ جب وہ اپنے کام میں مشغول ہوتا ہے اس کی بیوی اسٹیل والے ایک سیٹھ کے ساتھ راس رچائے رہتی ہے، لڑکی ایک سٹّے کے پیچھے بھاگتی پھرتی ہے اور لڑکا چور بازار کے کوٹھوں کا طواف کرتا ہے ——"

یہ چوتھا بھائی ہمارا یہاں کے سب حجاموں کو جانتا ہے، سب کے کچے چٹھے کھول کر ہمارے سامنے رکھتا ہے۔ یہ اسی نے بتایا، ان میں تین چار اچھے حجام تھے جو پوری حجامت

بنانے کے قائل تھے، لیکن بدقسمتی سے وہ ایک ایک کر کے مر گئے اور یا باقیوں کے شور مچانے کی وجہ سے نکال دیے گئے۔ وہ سب لوک پتی کے دوست تھے اور ان کی وجہ سے لوک پتی سب کچھ کر سکتا تھا۔ کیوں کہ اس کی سوجھ بوجھ اچھی تھی، نیت صاف تھی، لیکن ان کے چلے جانے کے بعد وہ اکیلا رہ گیا ہے۔ مجبوراً اسے دوسروں کی حرکتوں پر خاموش رہنا پڑتا ہے۔ اور کبھی وہ خود بھی وہی کرنے لگتا ہے جو اس کے باقی حجام ساتھی کرتے ہیں۔

ان حجاموں کے علاوہ دوسرے جو دڑبوں سے باہر بیٹھے ہیں، اس کھیل کے قاعدے قانون سے واقف ہو چکے ہیں۔ الہ آباد شہر جس کے نیچے کہیں سرسوتی بہتی ہے، کسی ایسے شخص کو جذب نہیں کر سکتا جو پڑھا لکھا نہ ہو۔ اگر اتفاق سے کوئی اَن پڑھ آ بھی جائے تو چند ہی دن میں وہ اتنا پڑھ جاتا ہے کہ یونی ورسٹی کا کوئی بھی اچھے سے اچھا ودیارتھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ الہ آباد کے حجام آدمی بڑے مزے کے ہیں۔ خوب دور کی سوچتے ہیں۔ لمبی چوڑی یوجنائیں بناتے ہیں، جن میں سے پوری ایک بھی نہیں کر پاتے۔ بس بھاشن دیتے ہیں۔ زبان کے معاملے میں رائے ضرور رکھتے ہیں لیکن اسے عملی جامہ پہنانا تو ایک طرف ننگا بھی گھومنے نہیں دیتے۔ آپس میں مل کر کچھ گوشٹی سی کرتے رہتے ہیں ——— ان میں سے ایک شاعر ہے جس کا نام چندر بھان ہے اور خود دیوگ تخلص کرتا ہے۔ ہندی کے چھند سے اردو کو عقل مند بتاتا ہے۔ طبیعت اس قدر حاضر ہے کہ اپسرا کی بجائے دیو بالک پسند کرتا ہے جانتا ہے نا کہ عورت سے پیار تو ایک قدرتی بات ہے لیکن مرد سے پیار سرواُچ کلا ———

ایک دن بیٹھے بیٹھے چندر بھان دیوگ نے بہت پی لی اور رو دیا کے عالم میں بہت رویا۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ پیغمبر ہے، ہائے، دنیا نے نہیں سمجھا۔ میں نے کہا ——— "کوئی بات نہیں دیوگ جی۔ دنیا آج نہیں تو کل آپ کو سمجھ لے گی ———" پھر مدھودرا کے سب راز چندر بھان دیوگ پر کھل گئے اور وہ نشے میں دُھت رہنے لگا۔ اب وہ جیون کے رنگ منچ پر آتا تو خوب ہی لڑکھڑاتا۔ لوگ اس کے لڑکھڑانے کو بھی ابھنے کی ایک قسم سمجھتے جیسے ناچتے ناچتے اس کے باقی ساتھی تو رنگ منچ کے ونگ میں گئے سو گئے ———

چند ہی برسوں کی بات ہے الہ آباد کے ان حجاموں میں پنجاب کا ایک حجام آ گیا

بس پھر کیا تھا، سب لٹھ لے کر اس کی طرف دوڑے اور اسے نکال پھینکنے کی ترکیبیں لڑانے لگے۔ لیکن وہ بھی ایک ہی بدمعاش تھا۔ باقاعدہ سینہ تان کر سامنے کھڑا ہو گیا۔ اگر کسی نے ایک اُسترا نکالا تو اس نے دو نکال لیے، باقی حجام ڈر کر بیٹھ گئے اور سامنے ہو کر لڑنے کی بجائے نیتی کی باتیں کرنے لگے۔ وہ گھاگ سب کچھ سمجھ گیا۔ اس نے اپنے کیبن کے پیچھے سے کچھ تختے نکال کر ایک کھڑکی بنائی اور اس پر ایک بورڈ لگا دیا ——— "کوشک چیریٹیبل ہومیو پیتھک ڈسپنسری" اور کچھ دوائی کی شیشیاں رکھ لیں ——— مدر ٹنکچر، چھ ایکس پوٹینسی، تیس، دو سو، ہزار، پچاس ہزار، لاکھ کی پوٹینسی۔ بس پھر کیا تھا۔ آس پاس کے غریب غربا، بنا پوٹینسی کے سب لوگ علاج کے لیے اس کے پاس آنے لگے۔ دوسرے حجام لوگ بدکے۔ ایک میٹنگ کر کے انھوں نے اس کے خلاف فیصلہ کر لیا۔ لیکن جب تک کوشک کمیٹی کی حمایت حاصل کر چکا تھا۔ اس سے گرانٹ بھی لے چکا تھا۔ اب اسے وہاں سے کوئی نہ ہلا سکتا تھا۔ چنانچہ آج تک وہ وہاں بیٹھا سب کی چھاتی پر مونگ دَل رہا ہے۔ چہ جائے کہ باقی حجام اس کا کچھ بگاڑ سکیں، اپنے بھی بیٹے بیٹیوں کے رشتے نائی ہونے کے ناتے اس سے کرواتے ہیں۔

اس پر طرّہ یہ کہ ان کے بیچ ایک حجام بھی چلا آیا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ اس کا کاروبار کیا چلے گا جس کی اپنی شیو نہیں بنی ہے۔ لیکن صاحب، جو اندازہ سیانے کا ہوتا ہے، دیوانے کا نہیں ہوتا۔ الٹا اس کے پاس زیادہ گاہک آنے لگے۔ وہ جانتے تھے نا کہ بالوں کے بارے میں جتنا یہ جانتا ہے، کوئی دوسرا نہیں جان سکتا۔ اگر اسے بالوں سے محبت ہو گی تو ایسی پیاری شیو بنائے گا کہ راہ چلتی لڑکی گال سے گال رگڑے گی اور نفرت ہو گی تو یوں کھونٹی سے اکھاڑ پھینکے گا کہ سات جنم تک ٹھوڑی پہ بال اُگیں گے، نہ دماغ میں خیال پیدا ہو گا۔

یہ چوتھا بھائی ہمارا سنگم کے نائیوں کے بارے میں اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتا ہے، لیکن میں اگرسین کو آنکھ مارتا ہوں اور کہتا ہوں ——— "بھائی، میں تو چلا، ساڑھے نو ہو گئے۔"

"اگر حیرانی سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہتا ہے: "ایسے ہی چل دو گے، جل تو ری؟"

"کیا کروں؟" میں کہتا ہوں: "گیا تو بیوی ہی چلی جائے گی نا، نوکری تو نہیں جائے گی؟"

اور حسرت کی نظر سے لوک پتی کو دیکھتے ہوئے چل دیتا ہوں جس کے پاس ابھی تک

گاہکوں کا تانتا بندھا ہے۔ میرے من میں یہ خیال چٹکی لیتا ہے کہ شاید لوک پتی اب بھی مجھے بلالے اور اگلے پانچ منٹ میں نِک تِک سے درست ہو کر جاؤں۔ لیکن صاحب، لوک پتی کو کہاں وقت ہے؟ اور میں رکشا لے کر گھر پہنچ جاتا ہوں ـــــــــ

ودیا، میری بیوی میرا انتظار کر رہی ہے۔

"ہائے جی، کیا ہوا" وہ چوکھٹ پر میری آہٹ سنتے ہوئے بول اٹھتی ہے۔

"کیا ہوا کیا؟" میں پوچھتا ہوں۔

"کہاں بھانگ پی کے پڑ گئے؟"

میں کوئی جواب نہیں دیتا، لیکن وہ کہے جاتی ہے: "اتنا بھی نہ سوچا، دفتر کا وقت ہو گیا تمھیں تو بس کوئی باتیں کرنے کو مل جانے ـــــــ"

جبھی اس کی نگاہ میرے چہرے پر پڑتی ہے

"میاری!" وہ کہتی ہے۔ "یہ کیا؟" اور پھر وہ دوپٹا منہ پر کرتے ہوئے ہنسنے لگتی ہے۔ پھر اس پہ بس نہیں، پڑوس میں آواز دیتی ہے: "جگن بھیّا۔ اے ذرا ان کو بھی دیکھنا

میں ہاتھ جوڑ دیتا ہوں ـــــ "ودیا ـــــــ بھگوان کے لیے ـــــــ"

اور پھر وہ خود ہی دیکھنے کے لیے ہاتھ میری داڑھی کی طرف بڑھاتی ہے۔

"خبردار" میں اس کا ہاتھ جھٹکتے، خفا ہوتے ہوئے کہتا ہوں "تو ہاتھ لگائے گی تو میں لات لگاؤں گا"

اور پھر میں سوچتا ہوں ـــــ اس میں بچاری ودّیا کا کیا قصور؟ ایک سرد آہ بھرتے ہوئے میں اسے صرف اتنا ہی کہتا ہوں "شکر کرو تم عورتوں کی حجامت کسی لوک پتی نے نہیں ترلوک پتی نے بنائی ہے" اور ایسا کرنے میں میں اوپر بھگوان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔

"تمہیں اور تھوڑی مصیبتیں ہیں؟" ودیا کہتی ہے "تمھیں تو صرف ایک حجامت بنوانی پڑتی ہے"

اس کے بعد ودّیا کھانا نکالنے لگتی ہے۔ میں غصّے میں کہتا ہوں ـــــ "آج کھانا نہیں کھاؤں گا"

وہ ہاتھ ملتے ہوئے کہتی ہے: "ہائے جی، کیا انرتھ ہے۔ گرے گدھے پر سے اور غصّہ غریب کمھار پر نکال رہے ہو ـــــ؟"

پھر میں سوچتا ہوں ـــــ کھانے کے ساتھ میرا کیا جھگڑا؟ ـــــ "اچھا، لاؤ کھانا"

ودیا کھانا پروستی ہے۔ میں جلدی جلدی نوالے منہ میں ڈالتا ہوں جو اوپر سے نیچے جانے کے بجائے نیچے سے ـــــ اوپر جانے لگتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے میں کھانا نہیں کھا رہا، کھانا مجھے کھا رہا ہے۔ یا کوئی نیولی کرم کرنے بیٹھا ہوں۔ کھانا کھاتے ہوئے ہمدردی، صرف ہمدردی حاصل کرنے کے لیے ودّیا کے سامنے اپنی آج کی مصیبت کی داستان دہراتا ہوں۔ وہ بچاری، بھولی بھالی نہیں سمجھتی کہ اس کے منہ سے نکلا ایک بھی ہمدردی کا لفظ مجھے کتنا دکھ پہنچائے گا۔ میرے بیان کے آخر میں وہ کہہ اٹھتی ہے۔

"ٹپکی پڑے ان نگوڑوں پر ـــــ آج دفتر مت جاؤ"

"کیوں؟"

"خواہ مخواہ کیوں تماشا بننا ـــــــ"

اس پر میں ایکا ایکی بھڑک اٹھتا ہوں ـــــ کیا مطلب؟ ـــــ میری شکل ـــ میں اسے بھی تماشا دکھائی دے رہا ہوں؟ کم از کم اسے تو یہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔ میں دفتر نہیں جا سکتا تو گھر بھی نہیں آ سکتا؟ اور میں ودّیا کو گالیاں دینے لگتا ہوں جو دراصل مجھے سنگم کے نائیوں کو دینا چاہییں تھیں یا اپنے آپ کو۔ ودیا اندر چلی جاتی ہے اور میں سمجھتا ہوں، مجھ سے ڈر گئی۔ لیکن وہ باہر آتی ہے تو ہاتھ میں ایک کٹوری لاتی ہے جس میں گرم پانی ہے۔ دوسرے ہاتھ میں شیونگ اسٹک اور اُسترا۔ سیفٹی نہیں، وہی لوک پتی والا ـــــــ

میں سوچتا ہوں۔ چلو استرا کند ہے تو کیا۔ ذرا زور سے لگاؤں گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پھر بجائے اس کے کہ لوگ مجھ پر ہنسیں، میں ان پر ہنسوں گا۔ چنانچہ جلدی جلدی چہرے پر جھاگ پیدا کر کے میں استرا پھیرنا شروع کرتا ہوں۔ لیکن صاحب، استرا ہے کہ کہیں بھی ٹکنے کی بجائے اوپر سے یوں پھسلتا ہوا ٹھوڑی پر آ جاتا ہے جیسے پارک میں سلپنگ روسٹرم سے بچے ایک دم پھسلتے ہوئے نیچے آ رہتے ہیں ـــــ میں جھلا کر پانی کی کٹوری نیچے پٹخ دیتا ہوں۔ استرا دُور پھینک دیتا ہوں۔

"کیا بکواس ہے" میں ہنکارتا ہوں ـــــ "یہ اُسترا لے کے دیا تھا ـــ تیرے میکے والوں نے؟"

"ہائے جی" ودیا کہتی ہے "انھوں نے تو ٹھیک ہی لے کر دیا تھا۔ تم ہی نے سلّی گم کر دی"۔

"کس نے سلّی گم کر دی؟"

"تم نے ـــــ روز نکال بیٹھتے تھے"۔

"جھوٹ! ـــــ معلوم ہوتا ہے تم اس سے اردو چھیلتی رہی ہو"۔

ودیا خفیف سی ہو کر اُسترا اٹھا لیتی ہے۔ میں پلٹ کر اس کی طرف دیکھتا ہوں تو صاف نظر آتا ہے کہ وہ دوپٹے کے پیچھے اپنی ہنسی کو دبانے کی کوشش کر رہی ہے اور جب میں لے شدھ انگریزی کے لہجے میں "شٹ اَپ" کہتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے غلطی سے "بک اَپ" کہہ دیا۔ ایک قہقہہ پوری فضا کو بھر دیتا ہے اور ودیا استرے کو ہاتھ میں پکڑے ہوئے مجھے دکھاتی ہے "حجامت ہو بھی کیسے اُلٹے ہی استرے سے اپنے آپ کو مونڈتے رہے"۔

میں دیکھتا ہوں جلدی کے عالم میں، میں سچ مچ اپنے منہ پر الٹا اُسترا پھیرتا رہا تھا۔

ودیا کہتی ہے "خواہ مخواہ میرے مائیکے والوں کا نام بد کیا"۔

"اچھا اچھا" میں جز بز ہو کر کہتا ہوں اور پھر اپنی پوری سبھتا اپنے پورے کرم دھرم اپنے اعتقادات پر تبرے بھیجنے لگتا ہوں۔ ودیا بول اٹھتی ہے "خبردار ـــــ! اس میں سنگم کا کیا قصور، گنگا میا کا کیا دوش؟ ـــــ میں تو کہتی ہوں میں مروں تو مجھے جلانا مت۔ گنگا میں میرا جل پروا کر دینا ـــــ"

اور میں یہی سوچتے ہوئے چل دیتا ہوں۔ گنگا میں جل پروا! کیسی مان مریادا ہے یہ؟ کیسا پاگل پن ہے ہماری پوری قوم کا! اور مجھے یاد آتا ہے وہ دن جب میں دروپدی گھاٹ کی طرف گنگا میں نہانے نکل گیا تھا۔ سردی اور گرمی بیچ کے دن تھے۔ گنگا میں جب باڑھ نہیں آئی تھی اور دریا [illegible] ہی بالو چھوڑ کر خود کناروں سے بہت دور چلا گیا تھا۔ مجھے دریاؤں اور چشموں کا بہت شوق ہے۔ بادلے کتے کا کاٹا ہوا جتنا پانی کو دیکھ کر ڈرتا ہے، اتنا ہی میں پانی کے نظارے سے خوش ہوتا ہوں۔ پہلے کنارے کے پاس کی چکنی مٹی پیٹ پر ملتا ہوں جس سے جسم کی بیماریاں تو کیا دل اور دماغ کی بھی ساری الجھنیں جاتی رہتی ہیں۔ پھر اڈولف جسٹ کا سٹز باتھ لیتا ہوں جس میں اپنے بدن کے نہایت شرمناک حصے کو پانی میں ڈبو کر ایک ہاتھ سے پانی پیٹ پر ڈالتا ہوں اور دوسرے ہاتھ سے پیٹ کو خوب ہی زور سے ملتا ہوں۔ اندر آنتیں حرکت میں آجاتی ہیں۔ مرے ہوئے ٹشو بھی زندہ ہو جاتے ہیں۔ پھر کنارے پر کھڑے ہو کر تولیے کی بجائے ہاتھ سے پورا جسم رگڑتا ہوں۔ روم روم جاگ اٹھتا ہے اور بدن اسکول کی لڑکی کے بدن کی طرح نرم اور چکنا ہو جاتا ہے چونکہ ننگا ہوتا ہوں اور سب کی طرف دیکھتا بھی ہوں۔ اس لیے میری طرف کوئی نہیں دیکھتا۔ بندر بھی گھبرا کر بھاگ جاتے ہیں۔ شاید سمجھتے ہیں کہ ہم سے بڑا کوئی آگیا۔ چنانچہ اس دن باتھ لینے کے لیے گیا تو کیا دیکھتا ہوں ایک انسانی کھوپڑی پڑی ہے جس کے ساتھ ریڑھ کی ہڈی لگی ہے۔ ضرور کسی ودیا کی بہن یا اس کے بھائی کا جل پروا ہوا ہوگا۔ مجھے اس کا اتنا نہیں لگا جتنا اس بات کا کہ ـــــ ہائیں! ہم ہندستانیوں کے بھی ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے! ـــــ یہ نہیں ہو سکتا۔ کسی اور قوم کا کوئی آکر یہاں ڈوب مرا ہو ـــــ مگر ایسا ہو تو دنیا جہان میں کہرام مچ جائے اور وہاں کے لوگ رگ لگا کر پوری بالو کو چھان ماریں اور اپنا مردہ بھی یہاں سے نکال کرے جائیں ـــــ

اس کھوپڑی سے کچھ پرے ہو کر کنارے پر کپڑے رکھتے ہوئے میں پانی میں اترا تو کیا دیکھتا ہوں کہ پاس ہی کے ایک اَتھل اور پاون جل میں سچ مچ کا ایک مردہ پڑا ہے۔ میں اچھل کر باہر آگیا اور گھن اور خوف سے کانپتا ہوا اس کی طرف دیکھنے لگا جس کا جل پروا ہوا تھا اور اب اسے جل کی پروا نہ تھی ـــــ اس کے بدن کا گوشت مچھلیاں کھا چکی تھیں۔ اگر میں بھولتا نہیں تو مردے کے بچے ہوئے چہرے پر ایک طرف داڑھی تھی اور دوسری طرف سب صفاچٹ تھا۔ آج کے تجربے سے میں اس بات کا اندازہ کرتا ہوں کہ مرنے سے پہلے وہ ضرور سنگم پر گیا ہوگا اور وہاں کے کسی لوک پتی، چندر بھان یا کوشک سے حجامت بنوائی ہوگی! ـــــ خیر میں اپنے کپڑے پکڑ کر دریا کے اوپر کی طرف ہو لیا، تاکہ اس غازی مرد کے گھناؤنے بدن سے لگا ہوا پانی مجھ تک نہ آئے۔ ایک بار پھر کپڑے رکھ کر دریا میں اترا ہی تھا کہ پانی میں سے دو ٹانگیں باہر اٹھتی ہوئی دکھائی دیں۔ میں بھاگ آیا اور جب سے میں نے دروپدی گھاٹ تو کیا کسی ستیا یا ساوتری گھاٹ پر بھی نہانے کا

ارادہ نہیں کیا ——— اور یہ 'ودیا' میری بیوی، ایک عجیب طرح کے پاگل پنے میں اپنا جل پرواکرنے کو کہہ رہی ہے ——— نابابا! میں نہیں چاہتا کہ مرنے کے بعد بھی کسی کی ٹانگیں یوں پانی سے باہر اٹھی ہوں۔

بازار جاتا ہوں تو وہاں ایک مسلمنٹے سے میری لڑائی ہونے لگتی ہے۔ ایک پل میں یوں نظر آنے لگتا ہے جیسے شہر بھر میں ہندو مسلم فساد ہوکر رہیں گے۔ کشتوں کے پشتے لگ جائیں گے۔ یہ بات نہیں کہ وہ میری طرف دیکھ کر ہنس دیا۔ اس نے کوئی ایسی بات نہیں کی۔ البتہ وہ ایک شعر گنگنا رہا تھا
یہ عجیب پردہ ہے، چلمن سے لگے بیٹھے ہیں ——— صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

اس نے صرف ایک بار میری طرف دیکھا تھا اور میں نے سمجھا وہ شعر مجھ پر چپکا رہا ہے۔ میری آدھی منڈی ہوئی داڑھی کا مذاق اڑا رہا ہے مگر جب کوئی مسلمان اللہ رسول کی قسمیں کھاتا ہے تب تو ماننا ہی پڑتا ہے۔ یہ طے بات ہے کہ وہ یوں ہی اپنے البیلے پن میں شعر پڑھ رہا ہوگا اور میں اپنی نروز کا شکار اسے غلط سمجھ گیا ہوں گا۔

میں دفتر پہنچتا ہوں ——— لیٹ! ——— اور چپکے سے اپنی سیٹ میں جا دبکتا ہوں۔ یوں کام میں لگ جاتا ہوں جیسے صبح ہی سے مرنے کی فرصت نہیں اور قریب دو گھنٹے سے اس دفتری نزع کے عالم میں رہا ہوں۔ کلرک میری طرف دیکھتے ہیں۔ کھل کے ہنستے ہیں اور بار بار میری عیادت کے لیے آتے ہیں۔ اس عرصے میں میرا سیکشن انچارج صرف ایک بار میرے پاس آتا ہے۔ میں بہت کچھ اپنا چہرہ اس سے چھپانے کی کوشش کرتا ہوں لیکن جبھی لاک بک کے گم ہو جانے میں ہنگامہ بپا ہوتا ہے اس کی وجہ سے، اپنے آپ کو بھول کر مجھے اس کی طرف دیکھنا ہی پڑتا ہے۔ وہ میری طرف دیکھتے ہی کراہتا ہے ——— "آج تم سنگم پر گئے تھے؟"

"جی سر" میں جواب دیتا ہوں۔ اور میرا ہاتھ اپنے آپ چہرے کی طرف اٹھ جاتا ہے میں ڈرتا، لرزتا ہوں کہ نہ معلوم اب وہ مجھے کیا کہے گا؟ لیکن صاحب وہ ایک ایسی بات کرتا ہے کہ میں سوچتا رہ جاتا ہوں کہ اس بات سے میری داڑھی کا کیا تعلق؟ وہ کہتا ہے ———

"کوئی بات نہیں ——— لاک بک کل مل جائے گی ———" پھر وہ چلا جاتا ہے۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ چہرہ کانوں تک تمتما اٹھتا ہے اور اس کے ان منڈے

حصّے پر ایکا ایکی ایک عجیب سی خارش ہونے لگتی ہے۔ میں جتنا اسے کھجاتا ہوں، اتنا ہی اوپر سے نیچے تک میری خارش بڑھتی جاتی ہے۔

میں کام کے بیچ سے اٹھ کر، اپنا جی لگانے کے لیے باہر چلا جاتا ہوں۔ کچھ ٹورسٹ آتے ہیں جو میری طرف بالکل نہیں دیکھتے۔ باہر کے لوگوں کا یہی ہوتا ہے نا، ہم ہندستانیوں کی طرح دوسرے کے پرائیویٹ معاملوں میں اپنی ٹانگ نہیں اڑاتے۔ ان میں سے ایک بنچ پر میرے پاس آ بیٹھتا ہے اور اپنا ایئر بیگ نکال کر ایک طرف رکھ دیتا ہے۔ پھر وہ بظاہر ایک اچٹتی ہوئی نظر مجھ پر ڈالتے اپنا بیگ پکڑ کر اس میں سے آئینہ نکالتے ہوئے اپنا منہ دیکھنے لگتا ہے۔

میری سمجھ میں کچھ آتا ہے، کچھ نہیں آتا۔ اگر سویرے بازار میں اس مسلمنٹے سے میری لڑائی نہ ہوتی تو شاید میں اس گورے کرسٹان سے بھی بھڑ جاتا۔ شاید میں اس لیے چپ رہا کہ ان گوروں کا اب تک ہم پر بہت رعب ہے ——— یہ بھی ہو سکتا ہے، اس کے آئینہ دیکھنے کا میری داڑھی سے کوئی تعلق نہ ہو۔ میں اس کنفیوزڈ حالت میں اس کی طرف دیکھ کر اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اس سے باتیں کرنے لگتا ہوں۔

"میں آپ کا نام جان سکتا ہوں؟"

"ضرور ——— ضرور" وہ کہتا ہے: "میرا نام رچرڈ کینیڈی ہے۔"

اور پھر میرے پوچھے بنا وہ کہے جاتا ہے: "میں امریکا سے آیا ہوں۔ ہاربر ویل کے شہر سے۔"

میں اپنے کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیتا ہوں ——— سالا آیا بھی ہے تو ہاربر ویل سے! ——— یا شاید میری داڑھی کی طرف دیکھ کر اس نے کسی فرضی قصبے کا نام لے لیا۔ بہرحال، میں پھر پوچھتا ہوں۔

"اس وقت آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

"بنارس سے ——— میں سارناتھ میں بدھ کا ستوپ دیکھنے گیا تھا" اور پھر وہ اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے: "وہاں سے گاڑی میں آیا ہوں اور اب جہاز کا انتظار کر رہا ہوں۔"

"ستوپ اچھا لگا آپ کو؟"

"بہت" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے کہتا ہے: "لیکن معلوم ہوتا ہے انڈیا میں لوگ قدیم تاریخی چیزوں کو ٹھیک سے سنبھال کر نہیں رکھتے۔ دیکھو نا، اس کے ایک طرف خشک گھاس سی اُگی ہے"

—— اس سے پہلے کہ میں اس کی بات پر ری ایکٹ کروں، لاوڈ اسپیکر پر سے آواز آتی ہے۔

"یور اٹنشن پلیز —— فلائٹ ٹو اودھری کے پسینجر ——"

رچرڈ اپنا بیگ لیے اٹھتا ہے۔ وہ فقرہ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہا ہے جو مجھ سے رخصت ہوتے ہاتھ ملاتے مسکراتے ہوئے اس نے کہا۔

"میں بیکار ہی سارناتھ گیا، ستوپ دیکھنے کے لیے۔"

دفتر میں جیسے تیسے بھی دن کٹتا ہے میں وقت سے پہلے ہی اٹھ کر چل دیتا ہوں۔ یہ سوچتے ہوئے کہ چاہے میری پوری جایداد لگ جائے، سیلون میں جا کر حجامت بنواؤں گا پھر کوئی دنیا کا اور کام کروں گا۔ جبھی میں اپنے آپ کو یونی ورسٹی ہیر کٹنگ سیلون کے سامنے پاتا ہوں جو گرانڈ ٹرنک روڈ پر ہونے کی بجائے خُلد آباد کے ایک کونے میں ہے۔ سامنے اس نام کا بورڈ لگا ہے اور اس کے نیچے لکھا ہے —— پروپرائٹر۔ ناصر حسین۔

اندر داخل ہوتے ہی میں ایک ایسی کرسی پر جا بیٹھتا ہوں، جس میں مجھے ماں کی گود کا سا سکون حاصل ہوتا ہے۔

ناصر حسین میرے پاس آتا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے ہاتھ کا تولیہ میرے گلے میں باندھ دے وہ مجھ سے پوچھتا ہے: "آپ شیعہ ہیں یا سنّی؟"

"جی؟" —— میں حیران ہوتا ہوں۔ میں پوچھتا ہوں: "آپ شیعہ مسلمان ہیں، یا سُنّی؟"

"کیوں بھائی؟" میں کہتا ہوں: "حجامت کا شیعہ، سنّی سے کیا تعلق؟"

"معاف کیجیے میں —— میں سنیوں کی حجامت نہیں بناتا۔"

"آپ شیعہ ہیں؟"

"ہاں!"

"تب تو اُلٹا آپ کو سنیوں کی خوب ہی حجامت بنانی چاہیے۔ ویسے میں ہندو شیعہ ہوں —— بدھان چند میرا نام ہے۔"

"اوہ" ناصر حسین کہتا ہے: "پھر ٹھیک ہے۔ مجھے صرف سُنّیوں سے نفرت ہے۔ ان سے تو ہندو ہی لاکھ درجہ اچھے ہیں۔"

پھر وہ تولیہ میرے گلے میں ڈال دیتا ہے اور سنتا ہی نہیں کہ مجھے حجامت بنوانا ہے، بال نہیں کٹوانا۔ آخر سے پتا چل جاتا ہے اور وہ شیونگ برش لے کر میری طرف بڑھتا ہے۔ جبھی میرے چہرے کی طرف دیکھ کر وہ ایک دم رُک جاتا ہے! —— پھر غور سے دیکھتا ہے اور شیونگ اسٹک کو ایک طرف رکھ دیتا ہے اور کہتا ہے ——

"آپ اٹھ جائیے۔"

"کیا مطلب؟" میں حجامت کو قریب آ کر دور ہٹتے ہوئے دیکھتا ہوں اور کہتا ہوں "کہا نا، میں سنّی نہیں۔"

"سنّی وَنّی کی بات نہیں۔"

"بات یہ ہے تو پھر —— کیا بات ہے؟"

میں جو خوشی کے اس غبارے پر سوار تھا جو لکھنؤ میں پہلی بار کسی انگریز نے اڑایا تھا، اس کے پنکچر ہو جانے سے ایک دم پھُووُوُوُ —— کی آواز سے نیچے آ رہتا ہوں ناصر حسین کہتا ہے۔

"کسی اور نے آپ کی شیو شروع کی تھی؟"

"ہاں!" میں کہتا ہوں: "لوک پتی نے سنگم پہ —— گریٹ آدمی ہے۔"

"کچھ بھی ہو" ناصر حسین آواز میں ایک قطعیت پیدا کرتے ہوئے کہتا ہے: "کتنا بھی گریٹ ہو۔ لیکن بات یہ ہے —— کسی کے بھی چہرے پہ، کوئی سا بھی حجام ایک بار کیسا بھی خط لگا دے، کوئی دوسرا حجام اسے پٹ نہیں کر سکتا —— یہ ہماری یونین کا قانون ہے۔"

"آپ کی یونین کی ایسی تیسی" میں ایک دم آگ بگولا ہو کر کہتا ہوں —— "ایک طرف ہمارے حاکم ہیں، دوسری طرف کامگار، مزدور اور ان کی یونین —— بیچ میں ہم لٹک رہے ہیں۔ کیا آپ نے کسی بزرگ سے نہیں سُنا —— مرد اور مرنے دو؟ ہم جائیں تو کہاں جائیں؟"

"باہر" ناصر حسین کہتا ہے۔

میں ایک دم سب کچھ بھول کر پہلے باہر کی طرف دیکھتا ہوں اور پھر اس بات کے

معنی سمجھتا ہوں۔ مجھے امید ہی نہ تھی یونی ورسٹی ہیر کٹنگ سیلون کا ناصر حسین آزادی کے بعد میرے ساتھ ایسا سلوک کرے گا۔ ہوش میں آتے ہوئے ناصر حسین سے کہتا ہوں: "میں تمھاری یونین کے خلاف اسٹرائک کرادوں گا۔ بھوک ہڑتال کردوں گا ـــــ میں ـــــ میں پنڈت جی تک پہنچوں گا جو یہاں کے رہنے والے ہیں۔ اپنے وطنی ہیں۔ الہ آباد میں ایک بار آنے دیجیے انھیں میں کہوں گا ـــــ "پنڈت جی! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ ابھی تک اس عمر میں آپ نے دیس کا معاملہ ٹھیک نہ کیا تو بڑے ہو کر کیا کریں گے؟"

اور جب کچھ سمجھ میں نہیں آتا تو میں ناصر حسین کے حضور میں گڑگڑانے لگتا ہوں۔

"ناصر جی! آپ مجھ سے سو روپے ـــــ دس، بیس روپے لے لیجیے، لیکن بھگوان ـــــ نہیں نہیں، اللہ کے لیے ایک بار میری حجامت بنا دیجیے نہیں تو میں دنیا جہان میں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا ـــــ سب مجھ پر ہنس رہے ہیں ـــــ ایک میں رو رہا ہوں۔"

بجائے اس کے کہ ناصر حسین میری حالت پر رحم کھائے، وہ کہتا ہے: "رات ہو گئی اس وقت کون منہ دیکھتا ہے؟"

بیکار ہے۔ سب کچھ بیکار ہے۔ چنانچہ میں کوئی فرضی چھڑی اٹھا کر فرضی ہوا میں سے گھماتا ہوا، کسی فرضی گھر کی طرف چل دیتا ہوں ـــــ

رات بھر وِدیا، میری بیوی میرے پاس نہیں آتی۔ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے میں کوئی کبوتر ہوں جسے کسی نے لال رنگ لگا دیا۔ یا چڑا ہوں جس کے گلے میں کسی نے پھندا باندھ دیا۔ اور اب میرے ہی عزیز مجھے اپنے گھر میں گھسنے نہیں دیتے۔ چونچیں مار مار کر لہولہان کر رہے ہیں، کاٹ کاٹ کر بھگا دینے کی کوشش میں ہیں۔

تڑکے ہی اٹھ کر میں سنگم کی طرف چل دیتا ہوں اور لوک پتی کے پاس پہنچ کر ہاتھ جوڑ دیتا ہوں "ہے، لوک پتی! بھگوان کے لیے میری حجامت بناؤ۔ تم نے کب سے مجھے اس حالت میں لٹکا رکھا ہے، نہ جیتا ہوں نہ مرتا ہوں ـــــ حالانکہ میں نے تمھیں پورا ٹیکس دیا ہے۔"

لوک پتی جس نے کسی کے چہرے پر کچھ خط لگا رکھے تھے، اسے چھوڑ دیتا ہے اور کہتا ہے: "آپ ذرا ٹھہریے، شریمان ـــــ"

"نہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ آدمی احتجاج کرتا ہے: "مجھے دکان پر جانا ہے۔"

"سبھوں کو جانا ہے بھیّا!" لوک پتی کہتا ہے ـــــ "سبھوں کو جانا ہے ـــــ کل ان کی حجامت بیچ ہی میں رہ گئی تھی۔"

"یہ جائیں بھاڑ میں، اور تم جاؤ جہنم میں" وہ آدمی منہ پر کف لاتے ہوئے کہتا ہے۔ "ان کی تو کل کی حجامت رہ گئی۔ میں پچھلے اتوار سے اَن منڈا بیٹھا ہوں ـــــ"

معلوم ہوتا ہے اس آدمی کی برداشت آخری حد تک پہنچ گئی ہے اور وہ لوک پتی کو مارے گا لیکن لوک پتی کی ایک ہی کڑی نظر اور ہاتھ میں استرا دیکھ کر وہ کہتا ہے ـــــ "اچھا ـــــ مت بھولیو، ان کے بعد میری باری ہے۔"

اور میں اطمینان سے لوک پتی کے ہاتھ میں اپنا گلہ دے دیتا ہوں اور سوچتا ہوں کچھ بھی ہو، لوک پتی آدمی برا نہیں۔ معاملے کا بہت کھرا ہے ـــــ

تھوڑی ہی دیر میں چہرے کا وہ حصہ صاف ہو جاتا ہے جو کل اَن کٹا رہ گیا تھا۔ میں اس پر ہاتھ پھیرتا ہوں۔ کیا جرنیلی سڑک، بلکہ آٹو باہن کی طرح سے صاف ہے جس پر کوئی سو میل کی رفتار سے گاڑی چلا سکتا ہے۔ جبھی لوک پتی مجھ سے کہتا ہے: "اب آپ اٹھ جائیے۔"

"کیا مطلب؟" میں آخری بار حیران ہو کر پوچھتا ہوں۔

"جو اَن کٹا رہ گیا تھا، وہ میں نے کاٹ دیا۔"

"مگر" میں چہرے کے دوسرے حصّے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتا ہوں "رات میں ادھر بھی تو بال اُگ آئے ہیں ـــــ؟ ـــــ! ـــــ!!"

"کٹ جائیں گے ببوا! ـــــ وہ بھی کٹ جائیں گے" لوک پتی بلّی پہ استرا تیز کرتے ہوئے کہتا ہے ـــــ "باری سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اور میں ڈائیک پر کھڑا اپنی باری کا انتظار کرنے لگتا ہوں جو آئے گی، پر نہیں آئے گی کو شک بلند آواز سے اپنی فتح مندی پر ہنس رہا ہے۔ چندر بھان نہ معلوم کس کو دیکھ کر ایکٹرس جمنا کا وہ شعر پڑھنے لگتا ہے جو اس نے فلم "دیوداس" میں بولا تھا ـــــ

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

سامنے دریا میں عورتیں نہا رہی ہیں۔ ایک دوشیزہ نے ہر قسم کی شرم وحیا سے بے نیاز ہو کر سب کپڑے اتار دیے اور زور سے انھیں دور کناروں کی طرف پھینک دیا اور پورے پرتول کر پانی میں کود گئی جتنے زور سے پانی اس سے لپٹنے کو آیا۔ اس حسین ڈائیونگ کے بعد ابھی وہ سطح پر نہیں آتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے، نیچے سرسوتی کی تھاہ پانے کی کوشش کر رہی ہے۔

یاتری لوگ نہ معلوم کیوں ایکا ایکی چوکس ہو گئے اور اب پانڈوں کے پھول نہیں بکتے وہ ٹوکریاں ہاتھ میں لیے سب کی طرف بٹر بٹر دیکھ رہے ہیں۔

قلعہ جسے شہنشاہ اکبر نے بنوایا تھا ایک منی ایچر ہو گیا جو وقت کے عجائب گھر میں پڑا ہے۔ مندر زمین میں دھنس چکے ہیں اور بندر شاید اوپر چاند، شکر اور منگل پر کود گئے، جواب ہماری دھرتی کے صوبے ہو چکے ہیں ——— ایک فقیر جو شکل سے حکیم وقت معلوم ہوتا ہے، بددُعا دیتا ہے جو مجھے دُعا معلوم ہوتی ہے:

"جا بچہ! سیفٹی کے سوا تیرا کوئی دارو نہیں!"

اور میں خوشی خوشی گھر لوٹ جاتا ہوں، جس کا راستہ بازار میں سے ہو کر جاتا ہے!

دیوالہ

روپ متی، میری نند، جوان ہو چلی تھی۔ اس کی جوانی کا ثبوت شُبہ ہی نہ تھا اس کا، لچھن بھی تھے۔ وہ اس کا چونک کے بات کرنا، بے وجہ ہنسنا، بے سبب کی دلگیری، بدگمانی اور پھر، سب سے بڑی بات ——— خواہ مخواہ کی رازداری!

مجھے یہ دینا کبھی پسند کی بات نہ معلوم ہوئی، اور نہ ہی اس میں کوئی بہت بڑا بھید دکھائی دیا۔ ہاں! ——— بارہ ساڑھے بارہ کی تو تھی جب باپو نے کانونٹ سے مجھے اٹھا لیا اور شادی کر دی۔ ادھر شادی ہوئی ادھر میں، مندروں کی اس بستی دیول نگری میں چلی آئی ———

یہ نیچے چونے گنج میں گول گول شیشے ٹنکے ہیں اور ساج کی لکڑی کا بڑا پھاٹک ہے، سب جبھی بنا تھا۔ ہاں، لوہے کے یہ موٹے موٹے کیل بعد میں گاڑے تھے اور دروازے پر گنیش جی کی مورتی؟ ——— یہ بھی بعد ہی میں بنی تھی۔

میں یہیں 'ہوا محل' کے اس بجارچے میں بیٹھی تھی۔ ہونٹوں کا لاکھا لکھوٹا مجھے خود بُرا لگ رہا تھا۔ مگر شسر، جیٹھ وغیرہ سبھی پیڑھی پہ گئے ہوئے تھے۔ تا ابھی مندر سے نہیں لوٹی تھیں۔ یہ بھی شہر میں نہ تھے۔ اتنا ہی پتا تھا دیس بھر کی ارنڈی قابو میں کرنے گئے ہیں۔ ایک بار قابو آ گئی تو اپنا گھر سونے کی اینٹوں سے بھر جائے گا، اگرچہ بہت سوں کے دیوالے نکل جائیں گے ———

کھاتا پیتا گھر، یہاں سبھی نیشن کے طور پر کام کرتے تھے۔ کھائی پکائی کے علاوہ اور کیا تھا؛ صبح ہوتی تو ہم سوچتیں ـــــ کیا پکے گا؛ دوپہر تھوڑے کپڑے اِدھر اُدھر پھینکنے کے بعد ـــــ شام کیا پکے گا؛ کوئی پوچھے۔ گھوم پھر کے اِدھر اُدھر ہی پہ پہنچنا ہے تو واویلا کیسا؛ وہی روز کی باتیں، روز کے چہرے! ساس میری دیکھنے میں بُری نہیں لیکن کبھی بھنگن ہی اس سے اچھی لگنے لگتی۔ اس لیے جب گھر بھر سے جی اُوب جاتا تو میں یہاں آ بیٹھتی۔ تم نے دیکھا ہے نا بالو کی ماں؛ یہ نجا رچہ نیچے سے یوں ہی سا لگتا ہے، مگر ہے رامائن کا پشپ بوان۔ ایک اُٹھا کملیا کمل لال سیمنٹ کا جیسے تھامے کھڑا ہے۔ گھر کی طرف پیٹھ کر کے دیکھو تو نیچے بازار میں سب آر جار دکھائی پڑتی ہے۔ بھنگی، چمار، کھاد کے نئے کارخانے میں کام کرنے والے مجبور۔ یوں گریب پر بدن میں محنت کا سرور، چہرے پر صحت کا نور، سینہ تانے ہوئے یوں معلوم ہوتے ہیں جیسے چٹان سے چٹان پھوڑنے جا رہے ہوں۔ اس بات کی بھی پروا نہیں، مجوری ملے گی یا نہیں ملے گی۔ پھر اِکّے والے جن کی چھاتی کے تسلوں میں گالیاں ہی اُبلتی رہتی ہیں دوسروں کو تو کم ہی دیتے ہیں، اپنے جانور کو زیادہ۔ اپنے آپ کو سب سے زیادہ۔ اور اس پہ بڑے خوش۔ مارا ماری کرتے جا رہے ہیں ـــــ تیز تیز، جیسے سویرا پورب سے کرنیں پھینکتے اُمڈتا ہے۔ ادھر چابک لوگ یوں اِدھر اُدھر بھاگتے ہیں جیسے رات کا اپرادھ دن ہوتے ہی کوٹھریوں، میلے کچیلے کپڑوں اور نالیوں میں جا چھپتا ہے۔ مُنیم، دلال، سنٹی دھوتی کا پلو سمیٹتے ہوئے ایک طرف ہو جاتے ہیں۔ مگر جو بیچ سڑک کے جا رہی ہیں۔ تو اپنی لائنیں ـــــ ہر وقت بیٹھے رہنے سے جن کے پیٹ میں ہوا، پیچھے مانس کے لودے چلے آئے ہیں جیسے کسی نے بڑے بڑے تکیے باندھ دیے ہوں۔ چلتی ہیں تو پیچھے سے بدھ ویر بدھ ویر کا جاپ ہوتا ہے۔ یہ رات کھیری کی ماتا ہیں، پانڈے جی ساتھ ہیں۔ دنیا جہان سے بے خبر۔ برائے نام گھونگھٹ کاڑھے، پتا نہیں کس مندر کو جا رہی ہیں؛ بڑے سے بڑا لوہے کا ڈنڈا بھی ان راستے کے پتھروں کو نہیں ہٹا سکتا ـــــ پھر اپنی جات برادری کے سیٹھ، جات باہر کے بیوپاری جن کی تندیوں تک میں پانی پڑ گیا ہے۔ بیچ رانوں کے تھیلیاں، جن کی طنابیں تک کمر میں بندھی دکھ رہی ہیں۔ تس پہ بھی چھوکریوں کو گھور رہے ہیں۔ گھورتے مشٹنڈے بھی ہیں لیکن ایک کی نگاہ میں

ہل پڑنے والا پیار اور آشا، دوسرے کی نظروں میں گھن اور نراشا۔ چھوکریاں بھی تو اُن سے نہیں شرماتیں۔ شرمائیں کن سے؟

ایسی باتیں دیکھ کے جی اور بھی گھبرا جاتا ہے۔ پھر میں سامنے دیکھ لیتی ہوں۔ پورا مارواڑ نظر آتا ہے۔ پتھر ہی پتھر۔ بالو ہی بالو۔ سورج کی روشنی آڑی پڑتی ہے تو بالو کی کنی کنی دمک اُٹھتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے، ان گنت مُہریں پڑی ہیں اٹھا لو اور اندر باہر سب بھر لو۔ دیس بھر کا سونا روپا اسی دھرتی میں چلا آیا ہے بس یہی جھوٹی چمک دمک ہے، ہریالی کہیں بھی نہیں۔ کہیں کہیں کوئی جھاڑی یا گُس دوب دکھائی دے جاتی ہے لیکن درخت نام کو نہیں۔ دور وندھیا کے آنگن میں کوئی ٹُنڈا کا پیڑ کھڑا ہے یا چمبل کے کنارے بجاسل سر ہلا رہا ہے۔ وہ بھی! نیچے سے ٹُنڈ مُنڈ۔ اوپر ایک گُپھا سا ہے، وہی دل کی دھڑکن تیز کر رہا ہے۔ میں تو کہتی ہوں کوئی ہمارا سب سونا لے لے اور ہریالی دے دے ـــــ

مان تی، میری ساس، مجھے ہمیشہ یہاں بیٹھنے سے منع کرتی ہے۔ لیکن جب بھی میں یہیں بیٹھتی ہوں، ضد کے ساتھ، ٹھینگے کی طرح۔ اس کا کہنا ہے کھڑکی میں بیٹھنا کام نہیں بہو بیٹی کا۔ کھڑکی میں بیٹھتی ہے تو گنکا۔ میں کہتی ہوں یہی حساب ہے تو پھر ہماری طرح کی سبھی گھریلو عورتیں گنکا دیشیا ہیں۔ ہمیں کھڑکی جھروکا بھی نہ ملے تو اس سے مر جائیں ـــــ ہے نا بالو کی ماں؛ کھڑکی کے لیے عورت ہو نہ ہو، عورت کے لیے کھڑکی بڑی ضروری ہے۔

لیکن اُس دن ہمیں کون ٹوک سکتا تھا؛ گوکل اشٹمی کا دن تھا۔ گوپیوں کے کامن آج کے دن پیدا ہوئے تھے۔ رادھا بازار میں کوئی ہما ہمی تھی؛ ـــــ رام رام ـــــ لو کالی اُمنگ کی طرح باہر چلی آئی تھی اور ترنگ کی طرح ناچتی، گاتی، بل کھاتی جا رہی تھی، سانول داس کے مندر کی طرف۔ اس میں عورتیں بھی بہت تھیں۔ جیسے ان کے بنا سب ادھورا ہے۔ دھکے پڑتے تو بُرا بُرا منہ بناتیں۔ اوپر سے گالیاں دیتیں، بھیتر سے خوش۔ ایسا نہ ہوتا تو باہر ہی کیوں نکلتیں؛ یہ عجیب بات ہے۔ ہم عورتیں جس بات کو پسند نہیں کرتیں، آخر میں وہی کرتی ہیں۔ ہو سکتا ہے میں غلط کہہ رہی ہوں مگر ـــــ ہمارے من کا پسارا انوکھا ضرور ہے۔ مردوں کو اس بات کا کیا پتا؛ وہ تو سارا پڑھ لکھ کے

بھی جانگلو ہی رہتے ہیں۔ بس سیدھے ـــــ فلاں کام کرو نہیں ماردیں گے یا ـــــ خبردار! جو ساوتری کے ساتھ منڈوے کو گیئں۔ وہ اچھی عورت نہیں، ہوٹلوں میں جاتی ہے۔ کوئی پوچھے تمھیں کیسے پتا ہے جی؟ بچارے! ہمیں جانے کیا سمجھتے ہیں؛ نہیں جانتے جتنی دیر میں ان کے دل میں ایک خیال آتا ہے، ہمارے من سے بیسیوں ہو کے نکل جاتے ہیں۔ ہاں، تو اُس دن سب عورتیں کھڑکیوں میں چلی آئیں۔ جڑت مڑت، انگ، بانکڑی اور گہنوں کی نمایش تھی۔ سب عجیب سی نظروں سے نیچے بازار میں دیکھ رہی تھیں۔ پلو سر سے ہٹے ہوئے، چوٹیاں نیچے لٹکی ہوئیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے سیڑھیاں ہیں جو گھر کے بھیدی نے لٹکا رکھی ہیں تاکہ باہر کا چور اُن کے سہارے چلا آئے اور آنکھوں کی کھڑکی سے اندر کود پڑے۔ پھر کیا ہے؟ ـــــ سامنے تجوری پڑی ہے، تالی گھر والوں کے پاس ـــ ہمت ہے تو توڑ لے ـــــ

کہاں تو میں اکیلی ہی بیٹھی تھی کہاں روپ متی، ساس، دِدّا سبھی آگئیں۔ جبھی پتا چلا، دِدّا تو کب سے آئی بیٹھی تھی۔ کہیں اندر کے مندر میں گھنٹی بجا رہی تھی۔ دِدّا اور ساس دونوں باہر دیکھ رہی تھیں، چہرے پر کوئی اثر نہیں۔ منہ بیرنگ لفافوں کی طرح، پیسے دو اور چھڑا لو۔ نہیں بھیجنے والے کو واپس۔ ہاں روپو کا منہ کھلا تھا ـــــ میں نے کہا ـــــ

"روپو! تو ادھر آجا اچھی ـــــ میرے پاس ـــــ"

بولی ـــ "نہیں بھابی، میں ٹھیک ہوں!"

پیچھے سے دِدّا بولی ـــ "ارے! پیار سے بلاتی ہے بھابی۔ جاتی کیوں نہیں؟"

روپو نے شک بھری نظروں سے میری طرف دیکھا۔ گویا مجھے اس کی کوئی بات پتا چل جائے گی۔ میں نے یوں دیکھا جیسے نہیں چلے گی اور وہ اُٹھ کر میرے پاس آگئی۔ میں نے جو اپنی بانہہ اس کے گرد ڈالی تو پتا چلا، اس کے کولھے کتنے بڑے ہو گئے ہیں۔ ایک سال پہلے یہی روپو کچھ بھی نہ تھی۔ اب سبھی کچھ ہے۔ ابھی میں نے اُس سے پیار کی ایک بات بھی نہ کی تھی کہ ساس کی آواز آئی ـــــ

"بہو! سر ڈھک اپنا کیسے بیٹھی ہے؟"

میں نے اُسی دم اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور سر ڈھکنے لگی۔ میں تمھیں سچ کہتی ہوں بالو کی ماں۔ مجھے نہ پتا تھا، میرے سر پہ کپڑا نہیں ـــــ ننگی ہی بیٹھی ہوں۔ ان عورتوں کی طرح جو سامنے بخارچے میں کھڑی تھیں اور تن من سبھی کو ہوا لگوا رہی تھیں۔ میں پھر دونوں ہاتھ رکھ، یہاں کھڑکی میں ٹکا، ان پہ ٹھوڑی رکھ، نیچے دیکھنے لگی ـــــ

نیچے اب عورتیں تو کہیں کہیں تھیں۔ مرد ہی مرد تھے چھوں اُوں کوئی لمبا، کوئی ناٹا۔ کوئی چھوٹا، کوئی موٹا۔ کسی نے داڑھی بڑھا رکھی ہے تو کوئی صفاچٹ کسی نے سر کے بالوں کے پلیٹ بنا کندھے پہ پھینک رکھے ہیں۔ کوئی پان کھا رہا ہے اور تھوک رہا ہے۔ کوئی بیڑی کی راکھ چٹکی سے گراتا ہے۔ کوئی لڑتا ہے، کوئی گالی دیتا ہے، کوئی گالی کھاتا ہے۔ لیکن اوپر کو سب دیکھ لیتے ہیں، بجلی کے تاروں کی طرف ـــــ اس سال کچھ زیادہ ہی مرد تھے۔ ایک دم یہ اتنے کہاں سے چلے آئے؛ پھر میں نے سوچا آخر ماؤں ہی نے پیدا کیے۔ آسمان سے تو نہیں ٹپک پڑے ـــــ بیچ میں ایک ٹھٹ سا بندھا تھا اور باقی کے سب اس کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ اُن کے سروں پہ کوئی سات گز کی اونچائی پر ایک رسّی لٹک رہی تھی جس کا سرا رنگڑوں کے گھر اور دوسرا چھندواڑے کے سیٹھ کے ہاں سے بندھا تھا اور اس رسّی کے سہارے بازار کے عین بیچ مٹکی لٹک رہی تھی۔ یہ وہی مٹکی تھی جس میں ماتا جسودھا مکھن رکھ دیا کرتی تھی اور اوپر ٹانگ دیتی تھی۔ وہ سمجھتی تھی نٹ کھٹ اس تک نہیں پہنچ پائے گا مگر وہ اپنے ساتھیوں کے کندھوں پہ چڑھ کر پہنچ ہی جاتے تھے ـــــ

تو اس گھیرے میں سے نکل کر کچھ آدمیوں نے دوسروں کے کندھوں پر چڑھنا شروع کر دیا اور پھر ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈال، اندر کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو گئے۔ پھر دوسرا پرا آیا تین آدمیوں کا اور پہلے چھلے کے کندھوں پہ چڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ آخر بھیڑ میں سے سانولے رنگ کا ایک جوان لڑکا نکلا اور پھرتی سے باقی سب پہ یوں چڑھ گیا جیسے وہ مرد نہیں، سیڑھیاں ہیں۔ شکھر پہ پہنچ کے وہ کھڑا ہو گیا۔ اس کی قمیص میلی تھی اور اس پہ رنگ گرا ہوا تھا، بٹن کھلے تھے ـــــ میں تو تم سے سب بات کر سکتی ہوں، بالو کی ماں، جیسے تم مجھ سے کر لیتی ہو ـــــ میرا دل دھڑک اٹھا۔ اس لیے بھی کہ

اس کے پیر ابھی نہیں جمے تھے۔ وہ گر بھی سکتا تھا۔ ایک دم اس کے پیر لڑکھڑائے اور وہ جھک گیا اور پھر اسی دم تن کے کھڑا ہو گیا۔ اب اس کے پیر جم چکے تھے ——

لوگوں میں ایک شور سا مچ گیا۔ وہاں کھڑے ہوتے ہی اس لڑکے نے سیدھا اس طرف دیکھا جہاں میں بیٹھی تھی۔ ایک بجلی سی میرے بدن میں دوڑ گئی۔ پھر اس لڑکے نے دونوں ہاتھوں کے پنجے ایک دوسرے میں گاڑ دیے اور سر کے اوپر اٹھا کر ہاتھ ہلائے کا نپا، سنبھلا —— مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے لہو میرے منہ کو آ رہا ہے۔ میری کنپٹیاں تک کانپنے لگیں۔ آخر اس نے ایک ہاتھ اوپر کر کے مٹکی تھام لی۔ لوگوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ وہ مٹکی تک پہنچ گیا تھا۔ اب اس نے دونوں ہاتھوں سے اسے تھام رکھا تھا۔ اس نے پھر اس طرف دیکھا جہاں میں بیٹھی تھی، روپو بیٹھی تھی، ساس اور ددّا بیٹھی تھیں۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ میری ہی طرف دیکھ کر مسکرا رہا ہے، جیسے وہ مجھے جانتا ہے۔ میں نے اسے کبھی دیکھا ہے لیکن جانے کتنی پرانی بات ہے جس میں سمے نے تصویر دھو ڈالی ہے لکیریں سی رہ گئی ہیں ——

میں نے چور نظروں سے روپو کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک منہ کھولے بیٹھی تھی۔ جیسے بچے تماشے میں کھول کر بیٹھتے ہیں۔ مجھے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے میرا بدن جل رہا ہے۔ اس میں سینک نکل رہی تھی اور آس پاس بیٹھی عورتوں کو لگ رہی تھی۔ مجھے یقین ہے مجھ سے بو اٹھ رہی ہو گی مگر کسی نے کچھ کہا نہیں ——

اب تک میری جیٹھانی بھی آ بیٹھی تھی۔ ایک میں ہی تھی جس کے ہاں لاکھ کرنے پر بھی کوئی بچہ نہ ہوا اور ایک وہ تھی ہر سال جس کے پیٹ میں سے ایک کیڑا باہر چلا آتا تھا۔ اور میری جیٹھانی کو وہم کی بیماری ہو گئی تھی۔ ایک میں تھی جسے کوئی چیز گندی نہ دکھائی دیتی تھی اور ایک وہ جسے ہر چیز غلاظت سے اٹی مری معلوم دیتی۔ ہر وقت ہاتھ، منہ، کپڑے دھوتی رہتی۔ خاص طور پر نل۔ اب بھی وہ نل کو راکھ سے مانجھ کر ہاتھ دھوتی ہوئی چلی آئی تھی۔ ہاتھ تولیے سے نہ پونچھے تھے کیوں کہ گھر میں ہر آتا جاتا اسی تولیے کو استعمال کرتا تھا۔ آ کر اس نے گیلے ہاتھ بھی جھٹکے تو پانی کے چھینٹے مجھ پہ پڑے۔ یوں لگا جیسے اوتر لگی دھرتی پہ برسات کی پہلی بوندیں پڑی ہوں اور بھک سے اڑ گئی ہوں۔

میں نے مڑ کر دیکھا، روپو جا چکی تھی۔ شاید میرے پاس بیٹھ کر اسے سینک لگ رہی تھی۔ یا پھر وہی اس کی بھید بھری باتیں۔ کبھی پتا نہ چلا اگلے دم کیا کرے گی؟ اتفاق سے نظر نیچے گئی، تو وہ اسی ساج کے پھاٹک سے باہر کھڑی تھی اور اشٹمی کے جلوس کو دیکھ رہی تھی، جبھی وہ لڑکا لمبے لمبے ہاتھ ڈال کر مٹکی کے پانی کو باہر گرا رہا تھا۔ پھر وہ ہاتھ مار مار کر اسے توڑنے لگا۔ مگر وہ مٹکی جانے کس مٹی سے بنی تھی کہ ٹوٹتی ہی نہ تھی۔ آخر وہ اسے مکے مارنے لگا۔ جب اس پہ بھی نہ ٹوٹی تو اس نے مٹکی میں اپنا سر مارنا شروع کر دیا۔ جانے کیا ہوا؟ میری آنکھیں آپ سے آپ بند ہو گئیں۔ پھر تھوڑا کھلیں تو وہ ابھی تک سر مار رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں پھر آنکھیں لوٹ لیتی، مٹکی پھوٹ چکی تھی اور لوگ شور مچا رہے تھے ——

لڑکے نے چاروں طرف دیکھا۔ اس کے سر کو لگی ضرور تھی مگر چہرے سے اس نے کوئی بات ظاہر نہ ہونے دی۔ اس نے جیب سے میلا کچیلا ایک رومال نکالا اور گردن پونچھ لی۔ پھر وہ اپنے آپ جھک گیا اور ہولے ہولے نیچے اترنے لگا۔ اس کے پیر کانپ رہے تھے۔ نیچے کے پرے پہ پہنچ کے وہ لڑکھڑا گیا۔ وہ گرا —— میں لپکی مگر بے شمار لوگوں نے ہاتھ پھیلا کر اسے بچا لیا۔ ددّا نے میری طرف دیکھا اور ہنس دی۔ ساس نے تیور چڑھا لیے۔ میں وہیں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ نیچے دیکھا تو وہ لڑکا کہیں بھیڑ میں گم ہو چکا تھا۔ میں یونہی مورکھوں کی طرح اس طرف دیکھتی رہی۔ جی چاہا نیچے لپک جاؤں اور اسے ڈھونڈ ڈھانڈ کے پوچھوں۔ کہیں بہت تو نہیں لگی؟ مگر —— میں یہاں سے ایک دم کیسے جا سکتی تھی باہر؟ صدیوں کی بنی رسم کو پل بھر میں کیسے توڑ دیتی —— من کو مار کے یہیں بیٹھی اور سوچتی رہی۔

رات گئی۔ اشٹمی کی رات۔ میری طبیعت جب تک بہت بوجھل ہو چکی تھی۔ تنکا توڑ دہرا نہ کیا تھا لیکن اتنی تھک گئی تھی کہ بس —— آج گھر میں ایک ہی چیز کام کی ہوئی اور وہ یہ کہ ارہر کی دال نہ پکی تھی اور نہ اڑد اور نہ کڑھی۔ میری جیٹھانی نے کٹھل کی وہ پیاری سبزی بنائی

تھی کہ زبان سے الگ نہ ہوتی تھی۔ بالکل مانس کا مزہ تھا۔ ماں، بالو کی ماں! تم سے کیا چھپانا، میں نے مانس کھایا ہے۔ چوری چوری کئی بار کھایا ہے۔

روپو آ گئی۔ ویسے ہی بے وجہ ہنستی ہوئی۔ یہاں بستر سے اٹھنا دوبھر ہو رہا تھا لیکن وہ تن کر اپنے سبک پانو پہ ادھر سے اُدھر، اُدھر سے ادھر چلی جا رہی تھی۔ اتنی چہک اس میں کہاں سے چلی آئی؟ میری طرف دیکھ کر وہ شرارت سے مسکرائی اور بولی:

"بھیّا کب آنے والے ہیں چھوٹی بھابی؟"

میں نے کہا —— "کیوں؟"

روپا سمجھتی تھی کہ اس کے بھائی کے نام پہ میں شرما جاؤں گی جیسے دوسری عورتیں اپنے مرد کے نام پہ شرما جاتی ہیں۔ مگر، ہماری شادی اب کوئی نئی بات نہ تھی اور شرمانے کی اتنی بات ہی کہاں رہی تھی؟

روپا بولی —— پتا بھی ہے آج ہنڈولا ہے؟ وہ جھونٹا دیتی کہ آسمان سے جا لگیں۔

اُونہہ —— میں نے بیزاری سے کہا اور چپ ہو گئی۔

—— روپا جنم اشٹمی کے دن مجھے اور اپنے بھیا کو ہنڈولے میں بٹھا کر بڑی خوش ہوتی تھی۔ پتا نہیں اسے کیا سواد آتا تھا۔ شاید یہ سمجھتی ہو گی رادھے شیام کی جوڑی ہے۔ جب کہیں لمبا اور تیز جھونٹا دیتی تو میں ڈر کر ان سے چمٹ جاتی اور روپا دیکھ کر بہت ہنستی۔ بیچ میں، ہم ایک دو بار گر گئی اور یہ مجھے تھام بھی نہ سکے۔ بڑی جیٹھانی کے بچوں نے سرکھا کھا کر گٹھلیاں جگہ جگہ پھینک رکھی تھیں۔ ایک میرے سر میں چبھ گئی۔ تب سے میں نے ہنڈولے پہ بیٹھنا ہی چھوڑ دیا۔ بیٹھتی تو ان کا سہارا لینے کی بجائے رسّہ تھام لیتی جس سے روپا کا سب تماشا ختم ہو گیا۔

روپا بیٹھی بیٹھی ہر قسم کی شرارتیں کرتی رہی۔ کبھی وہ میرا کے بھجن گانے لگتی، کبھی باجے میں فلم کا ریکارڈ لگا دیتی اور تالی بجا بجا کر ناچنے لگتی۔ آج وہ بہت خوش تھی۔ جب تک اُن کے پتا اور بڑے بھائی آ گئے تھے۔ میں جانتی تھی دادا، ساس اور جیٹھانی ہنڈولے دیکھنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ میں سوچ رہی تھی اب سانول داس کے دیول

جانے کے لیے کہا تو میں کیا بہانہ کروں گی؟ جبھی مجھے اس لڑکے کا خیال آ گیا جس نے مٹکی پھوڑی تھی۔ میں نے بڑے پیار سے روپا کو بلاتے ہوئے کہا ——

روپو —— "تو نے دیکھا تھا آج کا جلوس؟"

روپو نے ایک دم چونک کر میری طرف دیکھا اور بولی —— "ہاں، بھائی!"

میں نے پوچھا —— "اور وہ تر پالی دیکھی تھی؟"

روپا بولی —— "ہاں۔"

"اور وہ لڑکا؟"

روپو نے پہلے انکار میں سر ہلا دیا اور پھر —— اقرار میں۔ وہ اتنی جلدی میں تھی کہ کچھ فیصلہ ہی نہ کر پائی۔ اس نے ایک تیز سی نظر مجھ پر پھینکی اور چپ کھڑی ہو گئی۔

میں کچھ نہ سمجھی۔ اُلٹا میں ہی پوچھنے لگی —— "کون لڑکا بھلا؟"

روپو نے منہ دوسری طرف کرتے ہوئے کہا —— "مجھے کیا معلوم؟"

ارے وہی! میں بولی —— "مٹکی پھوڑ" ——

اور صرف روپا کو چھیڑنے کے لیے میں نے کہہ دیا۔ کیسے تمھاری طرف دیکھ دیکھ کے ہاتھ ہلاتا تھا۔ اشارے کرتا تھا جیسے اچھی طرح سے جانتا ہو۔ میں چاہتی تھی روپا مجھے چھیڑے۔ مجھے کہے —— وہ تمھیں بلا رہا تھا، بھابی! مگر روپا چپ رہی ——

نہ صرف چپ —— اُس کی سانس تیز ہو گئی۔ اس نے پھر مجھے دیکھا جیسے میرے اندر کی کوئی چیز ٹٹول رہی ہو۔ ایک پل کے لیے تو میں بھی گھبرا گئی۔ پر میں نے سوچا۔ میں نے کیا کیا ہے جو خواہ مخواہ کی چور بنوں؟ میں نے دلیری سے روپا کو اور بنانا شروع کیا۔ جب وہ بہت گھبرائی تو میں سمجھی، اس کی تو عادت ہے؟ —— مجھے کیا پتا آج کیا ہونے والا ہے! میں نے مسکراتے، سر ہلاتے ہوئے کہا —— "کیسے مار مار کے مٹکی پھوڑی تھی اُس نے!"

روپا اسی طرح اُٹھ کھڑی ہوئی اور جانے لگی۔ میں نے دیکھا پہلو سے اس کی دھوتی پھٹی ہوئی تھی اور اس سے پرے کچھ خون کے دھبّے تھے —— روپا ایک سال سے رجسوَلا تھی۔ میں نے کہا وہ پھر شروع ہو گیا ہے اور یہ چھوکری نہیں جانتی۔

"دھوتی تو بدل، کتیا! ــــــ میں نے لفظوں کو تھوڑا چباتے ہوئے کہا ــــ پھٹی پڑی ہے، سب لہو لگا ہے۔"

رُوپا کچھ ڈری، اور دھوتی میں پھٹی ہوئی جگہ اور خون کے نشانوں کو چھپاتے ہوئے ہڑبڑا کر باہر نکل گئی۔

میں نے اس واقعہ کو کوئی خاص وہ نہ سمجھا۔ ایسا تو قریب قریب ہر لڑکی کے ساتھ ہوتا ہے، جب وہ عورت بنتی ہے۔ ہولے ہولے وہ اپنا آپ سنبھالنا سیکھ لیتی ہے۔ کئی جب بھی پھوہڑ رہتی ہیں ــــ میں نے سوچا، یہ بھی پھوہڑ ہی رہے گی ــــ رُوپا!

رات جو کچھ ہوا، اس سے مجھے پتا چلا یہ سب جادو کتیا کے شبد نے جگایا ہے۔ مجھے کیا پتا بالو کی ماں، تو تو جانتی ہے ہم یونہی پیار سے بھی ایک دوسری کو کُتیا کہا کرتی ہیں۔ میرا یہ مطلب تھوڑی تھا، ہم ہنڈولوں پہ گئے۔ روپے پیسے، سونے چاندی کی ہمارے دیس میں کیا کمی ہے؟ کنجوس لوگ۔ پیسہ پیسے کے لیے مرنے والے ــــ شادی بیاہ، تیج تیوہار پہ سب کونوں کھدروں میں پڑی دولت نکالتے ہیں اور بیچ چوراہے پہ رکھ دیتے ہیں۔ گویا کہتے ہوں۔ دیکھو ــــ دیکھو اور جلو۔ میں کیرت داس ہوں، جس کی دھنباد میں تین کوئلے کی کانیں ہیں۔ کلکتے میں ربڑ اور پلاسٹک کا سب سے بڑا کارخانہ۔ بمبئی میں کاٹن گرین کے گودام اپنی روئی سے بھرے پڑے ہیں ــــ تو سانول داس کے دیول میں لاکھوں کا چڑھاوا چڑھ گیا۔ میرے سسر نے مورتیوں پر سونے کا پترا جڑوا دیا اور شیام سندر کی آنکھوں میں بڑے بڑے نیلم لگوا دیے۔

میں اگرچہ تھکی ہاری تھی مگر ساتھ چلی گئی تھی۔ یوں ہی ــــ ایک اُمید کے ساتھ اور کچھ نہیں تو رونق دیکھ لوں گی۔ گھر میں کیا رکھا ہے؟ پڑی رہی تو اپنے آپ کو کھا جاؤں گی۔ وہاں بھیڑ میں دو چار دھکوں کے سوا اور کچھ نہ ملا ــــ اور اس کے بعد ہم گھر چلے آئے۔ رُوپا نہیں آئی تھی۔ سب منت سماجت کرتے رہے مگر رُوپا نے ایک ہی نہ پکڑ لی۔ سب جانتے تھے یہ ایسا ہی کرتی ہے اس لیے ساری پروا کے ہوتے ہوئے بھی کسی نے پروا نہ کی۔

لوٹتے سمے اور گھر پہنچ کے میں نے بار بار سوچا۔ یہ ہی آ جائیں۔ مگر انھیں کیا پڑی تھی

انھیں تو دیس بھر کی ارنڈی چاہیے تھی۔ دنیا بھر کی دولت، پیسے، پیسے اور پیسے کے سوا انھوں نے کچھ سوچا نہ ان کے باپ دادا نے۔ ہماری کتنی خواہش ہوتی ہے، بالو کی ماں! ہم اپنے پتی کے ساتھ باہر جائیں۔ میں تو کہتی ہوں اس بات میں پتی پریم بھی اتنا نہیں ہوتا جتنا یہ خیال ہوتا ہے کہ باہر جائیں۔ اپنا آپ دکھائیں اور جب کوئی بہت دیکھے تو اپنے ہی مرد کے کندھے پہ ہاتھ رکھ لیں اور کہیں ــــ بھگوان نے سب دیا ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو! تم بیٹھو، ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں لو۔ آہیں بھرو، جلو، مرو ــــ

ہاں، ہم اتنا ہار سنگار، زیور کپڑے کیوں پہنتی ہیں؟ اسی لیے نا کہ کوئی دیکھے مگر ہاتھ نہ بڑھائے اور پھر اس سارے انکار میں اقرار چھپا ہوا۔ من کے کسی کونے میں ایک چیز پڑی رہتی ہے جو ہر آتے جاتے من چلے کی ہمت کو للکارتی ہے ــــ

گھر آتے ہی میں سیدھے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اندر سے دروازے بند کر کے میں نے اپنے سب کپڑے اُتار دیے اور آئینے میں اپنا آپا دیکھنے لگی۔ کبھی اِدھر سے کبھی اُدھر سے۔ پھر بتی بجھا کر ایسے ہی بستر میں لیٹ گئی۔ باہر کسی نے ہلکے سے دروازہ کھٹکھٹایا ــــ

میں چونک اٹھی ــــ کون؟ ــــ میں نے پوچھا ــــ

آہستہ سے آواز آئی ــــ میں ــــ رُوپا!

میں نے پاس پڑی چادر لپیٹ لی اور اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ رُوپا اندر آئی۔ وہ رو رہی تھی۔ زار زار رو رہی تھی۔ آتے ہی وہ میرے قدموں پر گر پڑی۔ اور بولی ــــ "میری لاج رکھ لو، بھابی! میں مر جاؤں گی۔ کسی سے کہہ دیا تو میں کہیں کی نہ رہوں گی۔"

میری سمجھ میں جب تو کوئی بات نہ آئی۔ مگر ــــ ہم عورتیں! ــــ میں نے یوں ہی کہہ دیا۔ "نہیں، میں کسی سے نہ کہوں گی۔ اور پھر ــــ یونہی ــــ کیا ہوا؟"

رُوپا بولی ــــ "تم ٹھیک کہتی ہو بھابی۔ وہ مجھے جانتا تھا۔"

"وہ کون؟" ــــ میں نے پوچھا۔

"اب بنو مت" ــــ وہ بولی۔ "وہی ماشکی چھوکرا۔"

"تیرا ستیاناس!" میں نے دل میں کہا ــــ

روپا بولی "جب بھی رادھا بازار سے گزرتی، ناکے پہ مجھے مل جاتا، اشارے کرتا، سیٹیاں بجاتا۔ لیکن میں پاس سے گزر جاتی، بُرے بُرے منہ بناتی، گالیاں دیتی۔ لیکن آج پتا نہیں مجھے کیا ہوا۔ میں بھیڑ میں چلی گئی۔ صرف اس کے انگلی اٹھانے پہ ـــــ اور پھر ہم دونوں بھیڑ سے نکل گئے اور شو مندر میں چلے گئے جہاں مسافروں کے لیے کوٹھریاں بنی ہیں۔ میں کانپتی جا رہی تھی۔ آخر میں نے سوچا بھی کہ بھاگ کھڑی ہوؤں۔ مگر مجھ سے کچھ کرتے نہ بنی ـــ اس کے بعد میں اندھی ہو گئی!"

میں سچ کہتی ہوں بانو کی ماں۔ میرا سارا بدن کانپنے لگا۔ پہلے مجھے غصہ آیا، نفرت پیدا ہوئی۔ پھر سب کچھ جانے کیسے اپنے آپ ڈھل گیا۔ میں جی ہی جی میں اپنی مورکھتائی پہ ہنسی۔ مجھے جبھی کیوں نہ پتہ چلا، جب میں نے روپو سے یہ سب کہا تھا؟ ابھی بارہ دن ہی تو ہوئے تھے جب روپو نہائی ـــــ اور آج ـــــ اچھا، اچھا ـــــ تو فکر نہ کر۔ میں نے رُوپو سے کہا۔ تو نے کون سا ایسا کام کیا ہے جو کسی ماں کی بیٹی نے نہیں کیا۔ مگر اب تو اپنا آپا سنبھال۔ مہینا بھر اپنا حال بتاتی رہنا، مُردی۔ کچھ ہو گیا تو کہیں کی نہ رہ جائے گی۔ صبح میں تجھے میتھرے اُبال کر دے دوں گی۔ اب تو سو رہ۔ یہیں میرے پاس۔ کہاں جائے گی؟ آسی کو لگی ہیں؛ سب سوچیں گے۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ کون چل رہا ہے۔ اس آدھی رات کے وقت؟

اور سُن! میں تیری شادی کی بات چلاؤں گی۔ تو آوں آں مت کیجیو۔ کرنا بھی ہے تو بس دکھاوے کے لیے۔ اتنا ہی جتنا ہم بھی کرتی ہیں۔ مُٹکی پھوڑ یونہی سا ہے کوئی راج مجور۔ اس کا تو سوچ بھی مت ـــ ہاں ـــــ جو بات اچھی نہیں ہے، اچھی نہیں ہے اور جو اچھی ہے سو اچھی ہے۔ بھگوان نے تو مرد عورت کو بنا دیا۔ اور جب سے دنیا بنی ہے وہ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے ہیں اور بھاگتے رہیں گے۔ جیسے چاند سورج بھاگتے ہیں۔ لیکن وہ بھی ایک راستے پر جاتے ہیں۔ یہ نہیں اُس گلی، اس بازار سے راستہ کاٹا اور پکڑ لیا ایک دوسرے کو۔ ایسا ہو تو یہ دنیا، یہ سنسار، یہ دھرتی، یہ آکاش سب نشٹ ہو جائیں۔ سال کے دن کتنے ہوتے ہیں؟ ـــــ تین سو پینسٹھ۔ ان تین سو پینسٹھ دنوں میں ایک بار چاند سورج کو اور ایک بار سورج چاند کو پکڑ لیتا ہے اور بس ـــــ اس لیے انسان نے اس چاند سورج کا بھی راستہ بنا دیا ہے اور وہ ہے شادی کا راستہ۔ اس

کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں۔ شادی ہوتی ہے، تب ماں باپ بھائی بہن خود لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر لڑکے کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ پھر تو کوئی راجا مہاراجا، جج، دیوان بھی کچھ نہیں کر سکتا۔

اور میں نے روپا کو چھاتی سے لگا لیا۔ اس کی بہت کچھ تسلی ہو گئی تھی۔ میرے پاس پڑے پڑے وہیں سو گئی ـــــ نیند نہ آئی تو مجھے۔ یونہی جمائیاں لیتی اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر پہلو بدلتی رہی۔ کبھی کبھی میرا ہاتھ روپا کے بدن پر پڑ جاتا۔ مگر وہ بے ہوش پڑی تھی۔ سب کچھ کرشن کے ایک سکھ کی نیند لے رہی تھی اور میں ـــــ

مٹکی پھوڑ ـــ روپا کے بھیا ـــ روپا، آئینے میں اپنا بدن۔ یہ سب کی آنکھوں کے سامنے گھومتا رہا۔ پھر میں سوچنے لگی، یہ جو روپا سے کہتی رہی ہوں۔ سچ بھی ہے اور جھوٹ بھی۔ سچ اس لیے کہ کوئی قاعدہ قانون تو ہونا چاہیے۔ یوں ہی مرد عورت ایک دوسرے سے ملتے پھریں تو اولاد کو کون سنبھالے، کنبہ کیسے بنے ـــــ اور جھوٹ اس لیے کہ شادی کے ایک دو سال تک سب ٹھیک رہتا ہے۔ پھر ہولے ہولے مرد عورت ایک دوسرے کو اتنا جان لیتے ہیں کہ پھر جاننے کی بات بھی نہیں رہتی۔ جیسے کوئی آدمی ہر سال آبو جایا کرے یا سو مرگ تحصیل کے ہزاروں چکر کاٹ ڈالے۔ پھر مسوری کی گھاٹیوں ہی پہ چڑھنے کا مزہ ہے۔ نہیں، روح سو جاتی ہے اور جاگتے ہوئے جسم بھی مردہ ہو جاتا ہے۔ جبھی تو ـــــ کسی دوسرے کا ہاتھ لگے تو جسم اور روح دونوں چونک کر جاگ اٹھتے ہیں۔ بیاہتا جیون میں یہ سب ہو سکتا ہے اگر عورت مائیکے ہی جاتی رہے چاہے وہ صبر کا مائیکہ ہو یا مرد دورے پہ چڑھا رہے۔ کسی ایسی بڑی ریلوے کا گارڈ ہو جو مہینوں بعد گھر لوٹتی ہو ــ جب بھی۔ تبدیلی قانون ہے قدرت کا ـــــ ہمیشہ گرمی نہیں رہتی، نہ سردی رہتی ہے ـــــ شکل پکش کی رات کا اپنا جادو ہے اور کرشن پکش کی رات کا اپنا ـــــ سانپ کی کھال بھی اچھی ہے اور مور کے پنکھ بھی۔ پھر رنگ ہیں، خوشبوئیں ہیں، آوازیں ہیں ـــــ ان جانی، ان گنت ـــــ

شادی بہت اچھی چیز ہے، بانو کی ماں، پر کیا سماں نہیں آیا، کہ اس میں تھوڑی سی تبدیلی آ جائے؟ یہ مرد عورت دونوں سے ایک ہی بات کہے۔ اس چھت کے تنے تم

دونوں رہو گے۔ یہاں جو بچے پیدا ہوں گے، انسان ہی کے ہوں گے۔ مرد باہر کام پہ جایا کرے گا۔ عورت گھر سنبھالے گی اور بس —— ہے بھگوان! میں کیا کچھ کہہ گئی۔ میرا مرا منہ دیکھو، بالو کی ماں۔ جوان باتوں میں سے ایک بھی کسی سے کہو۔ میں سچ کہتی ہوں، مجھے کئی بار خیال آتا ہے۔ میں بیوی ہونے کی بجائے ان کی پرتیما ہوتی تو کتنی خوش رہتی ——!

ساری رات میں نے جاگ کے کاٹی۔ ساری رات میں سُولی پر ٹنگی رہی۔ جب صبح ہوئی تو یہ چلے آئے۔ میں لپک کر دروازے کی طرف گئی مگر انھیں مجھ سے بات تھوڑی کرنا تھی۔ میری طرف تو دیکھا بھی نہیں۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اتنا ہی کہہ دیتے کہ ہاں بھئی، تو بھی کوئی ہے۔ باہر جانے والے کا کیا ہے؛ ہزار شکل دیکھ کے آتا ہے ہم ہی گھر میں ایک دوسرے کا منہ تکا کرتی ہیں اور پڑے پڑے باسی روٹی کی طرح ہو جاتی ہیں۔ ہاتھ لگاؤ تو ٹھنڈی ٹھار، کھاؤ تو گرما گرم ——

ارنڈی کا سوداگر! ہونہہ —— پگڑی تو دیکھو۔ کیسے پیچ کے پیچ گلے میں پڑے ہیں جیسے مار کھا کے آیا ہے اور منہ پہ انجن کے کوئلے کا برادہ کھنڈ گیا ہے —— کوئی جم دوت معلوم ہوتا ہے، پنپنک کا بھوت! —— کمرے میں اور کسی کے جانے کی ہمت نہ تھی، سوائے ددّا کے —— ددّا گئی تو اسے بولے —— ددّا جی! اسے کہو، کچی لسّی کا گلاس بنا دے۔

اس ساری نفرت کے باوجود میں اپنے آپ چل دی لسّی بنانے۔ وہی، صدیوں کی عادت۔ پل بھر میں تھوڑی چلی جاتی ہے؟ میں نے جی میں کہا۔ بڑا آیا ہے حکم چلانے۔ جیسے میں کوئی لونڈی باندی ہوں؟ ہاتھ جوڑے کھڑی ہوں، حکم کی دیر —— ؟ مگر میں نے جلدی سے کچی لسّی بنا ڈالی۔ رُوپا ابھی جاگی تھی۔ لپک کے باہر جو نکلی تو گلاس سے ٹکرائی۔ لسّی سے میرے کپڑے تر ہو گئے —— پھر جو بچی تھی بھیج دی۔

میں تمھیں سچ کہتی ہوں، بالو کی ماں۔ رات تک یہ باپ اور دونوں بیٹے باہر نہیں

نکلے۔ آپس ہی میں کچھ کھسر پھسر کرتے رہے۔ میں نے سوچ لیا۔ یا گھر سونے کی اینٹوں سے بھر گیا اور یا پھر سب کچھ بک گیا۔ یہ ارنڈی چیز ہی ایسی ہے۔ اگر تم اسے دیکھو تو بالکل پتا نہیں چلتا، کسی کی قسمت بنا سکتی ہے یا بگاڑ سکتی ہے۔ ہمارے دیس کی ارنڈی، توریئے، مونگ پھلی میں وہ طاقت ہے، جو کسی دوسرے دیس کی دودھ بالائی میں نہیں، کسان ہل جوتتے ہیں، بیج بوتے ہیں، کارخانوں میں مجبور محنت کرتے ہیں، لیکن ان کی قسمت کے فیصلے ان کمروں میں بیٹھے یہ سیٹھ لوگ کر ڈالتے ہیں، جو ہل چلانے میں نہیں، بونے میں نہیں، محنت مجوری کرنے میں نہیں۔

میں چاہتی تھی باہر آئیں تو آج ذرا ان سے دو باتیں کروں اور کہوں، پیسے کے پجاریو! ایسی دنیا بھی ہے جو پیسے کے سامنے ماتھا نہیں ٹیکتی۔ جیب سے پیسے نکال کر یوں پھینک دیتی ہے۔ مطلب کی چیز خرید لیتی ہے اور پھر چل دیتی ہے —— آگے دیکھو تو، تمھارے گھروں میں کیا ہو رہا ہے؛ مہروں، سونے چاندی، ہیرے جواہرات کی کھان میں تم نے ہم سب کو قید کر دیا ہے اور ہم بھوکوں مر رہی ہیں۔ ہیرے جواہر تو نہیں کھا سکتیں؟

وہ نکلے —— باپ اور دونوں بیٹے۔ چہرے پر خوشی، نہ رنج۔ اور پھر گھر سے باہر چل دیے۔ ہم عورتیں ہکا بکا کھڑی رہ گئیں، سوچنے لگیں آج ادھر میں کچھ کالا کالا ہے۔ ددّا آئی اور بولی۔ ارنڈی میں دس بارہ لاکھ کا گھاٹا پڑا ہے اور یہ لوگ دیوالے کے کاغذ لکھنے جا رہے ہیں۔ کل کچہری کھلے گی تو داخل کر دیں گے ——

دیوالہ! —— ایسے کیا دیکھ رہی ہو، بالو کی ماں؟ —— تمھارے لیے دیوالہ ہر جانے کی بات ہے۔ ان سیٹھیوں کے لیے نہیں۔ یہ تو جتنے دیوالے نکلیں اتنے ہی امیر سمجھے جاتے ہیں۔ بات یہ ہے ہر دیوالے میں یہ کچھ اوپر نیچے کر جاتے ہیں، جس سے لاکھ دو لاکھ کا فائدہ ہی ہوتا ہے، نقصان نہیں۔ اس سے پہلے میرا سسر اور اس کے بیٹے چار دیوالے نکال چکے تھے اور یہ پانچواں تھا!

رات بھر یہ "مرد لوگ" نہ آئے۔ دن بھر کچہری میں رہے۔ شام کو میں اسی بجار ے میں بیٹھی تھی۔ سامنے اپنے سسر کو آتے دیکھا کمر کی طنابیں ڈھیلی کرتے ہوئے میرے جیٹھ کی

موٹے شیشوں والی عینک ناک کی چونچ پر آگئی تھی اور یہ! ــــــ اُن کے منہ پہ تھوڑی اور کالک کھنڈ گئی تھی ــــــ

دو سال تک انھوں نے روپا کا کچھ نہ کیا۔ میں نے پہلے اس بچاری کے خیال سے صاف صاف کچھ نہ کہا۔ اشارے اشارے میں سب کہہ دیا مگر انھوں نے میری ایک نہ مانی۔ کوئی امیر گھر دیکھنے میں وقت ضائع کر دیا۔ روپا نے اتنے عرصے میں زمین آسمان ایک کر دیا۔ اسے اب ہر آدمی ٹکی چھوڑ نظر آتا تھا۔ کب تک گلی محلّے کی نظروں سے یہ بات چھپی رہ سکتی تھی؟ آخر ایک دن تینوں باپ بیٹوں نے مل کر روپا کو خوب پیٹا۔ چھڑانے میں مجھے بھی پڑ گئیں۔ پھر انھوں نے اسے ایک کوٹھری میں بند کر دیا۔

روپا کو تو کچھ زیادہ نہ محسوس ہوا۔ میں پاگل ہو گئی۔ اندر جاتی تو رو لیتی، باہر آتی تو رو دیتی۔ میں نے ساس کی منتیں کیں۔ ددّا کے سامنے ماتھا رگڑا اور کہا۔ کیا یہ ضروری ہے؟ اچھا سا لڑکا دیکھو جو کھاتا کماتا ہو۔ باپ سیٹھ نہ ہو تو کسی اچھی نوکری میں ہو لیکن یہ کسی ایسے کی تلاش میں تھے جو اُن ہی کی جات برادری کا ہو، جن سے بیوپار کا رشتہ بھی بڑھے۔ مگر ایسا کوئی نہ تھا۔ تھا بھی تو بڑی ناک والا۔ بہت پیسے مانگتا تھا ــــــ لاکھ دو لاکھ کی بھی بات نہیں ــــــ پانچ لاکھ!

روپا کھل کھیلنے لگی۔ اس نے صاف کہہ دیا۔ شادی کروں گی تو اُسی ٹکی چھوڑ سے ٹکی چھوڑ کا اصل نام شیتل داس تھا اور وہ آتشبازی کی دکان کا مالک تھا۔ آمدنی کوئی اتنی زیادہ نہ تھی لیکن دیوالی کے اِدھر اُدھر اتنا پیسا کما لیتا تھا کہ سال بھر کے لیے کافی ہو۔ خود شیتل داس تھا مگر کام ہوائی پٹاخے کا۔ اپنا من شیتل ہو یا نہ ہو لیکن دوسرے کا ضرور کر دیتا تھا ــــــ دیول نگری میں دو چار ہی بانکے تھے جن میں سے ایک وہ بھی تھا ہر کھیل تماشے میں آگے، راس لیلا کا بندوبست اس کے سپرد۔ وہ مہابھارت کا کنس تھا تو رامائن کا راون!

لیکن روپا اب آ نہ مل سکتی تھی۔ نہ اسے گوکل اشٹمی کے دن سانول داس کے دیول میں جانے کی اجازت تھی اور نہ راس لیلا، دسہرے میں حصّہ لینے کی چھٹی ــــــ مجھے تو اسے دیکھ دیکھ کے ترس آتا تھا۔ میرے دل میں جانے کیا کراہتی کی لہر اٹھی ــــــ شِو مندر جانے کے بہانے میں نے کپڑے ویغرہ پہنے اور چل نکلی۔ شیتل کی دکان رادھا بازار اور رگھو ناتھ بازار کے سنگم پہ تھی جہاں مہابیر جی کا مندر ہے اور لال رنگ بکھرا رہتا ہے، ہر آتے جاتے کو لگتا ہے۔ کاربیوہار پہ آنے جانے والے لوگ وہاں تھوڑی دیر کے لیے کھڑے ہوتے ہیں، ہاتھ جوڑتے ہیں، آنکھیں بند کرتے ہیں اور کچھ دیر کے بعد زنجیروں کے ساتھ لگی ہوئی گھنٹیوں کو بجاتے اور چل دیتے ہیں۔ سامنے، دائیں بائیں اور پیچھے گائیں بیٹھی جگالی کرتی ہیں اور انھیں کوئی نہیں روکتا۔ کمیٹی بھی کچھ نہیں کر سکی۔ کوئی موٹر تانگے والا آتا ہے تو رک جاتا ہے اور پھر گاڑیوں کو اِدھر اُدھر سے گھما کر اپنا راستہ بناتا اور چل دیتا ہے۔

میں جا کر شیتل کی دکان پر کھڑی ہو گئی۔ کئی لڑکے اس کی دکان پر کام کرتے تھے وہ صرف اپنے بالوں میں کنگھی کرتا اور لڑکوں کو موٹی موٹی گالیاں دیتا تھا۔ دسہرے کے اِدھر اُدھر کے دن تھے اور شیتل داس نے دکان کے سامنے ایک طبیلے میں بانس اور کاغذ رکھے ہوئے تھے۔ میگھ ناد اور کمبھکرن بن چکے تھے اور اب راون بننے جا رہا تھا ــــــ

مجھے سامنے دیکھ کر وہ بولا ــــــ کیا چاہیے، پھل جھڑیاں؟ میں نے کہا۔ پھل جھڑی لینے نہیں آئی۔ دینے آئی ہوں۔

وہ کچھ نہ سمجھا۔ دکان سے نیچے اُتر آیا۔ میرا تن بدن کانپ اٹھا۔ میں پرے منہ کر کے راون کے ڈھانچے کی طرف دیکھنے لگی۔ جس نے طبیلے کا تین چوتھائی گھیر رکھا تھا۔ دس سر گننے والے تھے۔ وہ اور ادھر گدھے کا سر لگنے سے پورا طبیلہ گھِر سکتا تھا۔ میں نے جلدی جلدی شیتل داس کے سر کی طرف دیکھا۔ ہر سال سیکڑوں ٹکیاں چھوڑنے سے جس پہ چھوٹے چھوٹے زخموں کے نشان پڑ گئے تھے۔ پھر میں نے جو کہنا تھا چپکے سے کہہ دیا۔ شیتل داس کا چہرہ چمک اُٹھا اور میں چل دی۔

شام کو بھاٹ چلے آئے جو ہر سال ہمارے گھر میں آلا اُودل سُنایا کرتے تھے۔

اور جسے سُن کر ہمیں بڑا جوش آتا تھا۔ ان میں سے ایک تھا جو خنجری بجاتا تھا اور وہ شیتل تھا چونکہ یہ سب لوگ گھر کے اندر تھے اس لیے رُوپا انھیں دیکھ سکتی تھی ـــــ شیتل کو دیکھتے ہی وہ کانپنے لگی۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ میں منہ بھینچ کے ہنس دی۔

گھر بھر میں کوئی بھی شیتل کو نہ پہچان سکا۔ پڑوسنیں بھی آسے نہ جان پائیں۔ کمبخت ایسا بہروپیا تھا کہ کسی کو شک بھی نہ ہوا۔ ایک پہچانا تو پہچاننے والی نے جو اس کے ایک ایک بل سے واقف تھی۔ روپا اندر بھاگنے لگی۔ میں نے اشارے سے منع کر دیا۔

میں کہتی ہوں بالو کی ماں۔ مجھے اس میں ذرا بھی لاج نہ لگی۔ اور نہ ایسا معلوم ہوا جیسے میں نے کوئی پاپ کیا ہے۔ اُلٹا یوں جان پڑا جیسے کوئی بہت بڑے پُن کا کام کر رہی ہوں۔ ہمارے شاستر اس طرف تھے اور ددا، ساس، جیٹھانی، سُسر، جیٹھ، یہ وہ سب دوسری طرف ـــــ میں نے وقت کا ایسا بندوبست کیا تھا کہ ان کے اَلا اُودل شروع کرنے سے ختم کرنے تک رات ہو چکی تھی۔ اس کے بعد میں نے دیکھا عورتوں میں سے رُوپا غائب ہے اور مردوں سے شیتل۔ باقی کے بھاٹ تلسی جی سے کچھ پڑھتے رہے ـــــ

جب بہت دیر تک نہ آئے تو میں گھبرا گئی۔ اٹھ کے گئی تو دیکھا۔ روپا اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی چھت کو تک رہی ہے۔ میں نے اشارے سے پوچھا ـــــ وہ کہاں گیا؟ رُوپا نے بتایا، پیچھے سیڑھیوں کے راستے سے غائب ہو گیا ہے۔ میں سمجھی بس مل لیا دونوں نے، اور کوئی بات نہیں ہوئی ـــ مگر مجھے کیا پتا۔ بات کہاں سے کہاں تک جا پہنچتی ہے ـــــ؟

گھر کے مرد لوگ پیٹر ھی پر سے چلے آئے ـــ میں سچ کہتی ہوں۔ اس روز مجھے رُوپا کے بھیّا برے نہ لگے۔ انھیں خود بڑی حیرانی ہوئی کہ یہ آج اتنا پھسلا کیوں رہی ہے؟ میں بڑی خوش تھی، جیسے مجھے کچھ مل گیا ہے۔ مل بھی جاتا، بالو کی ماں تو اپنے آدمی کے لیے میرے دل میں پیار کم ہو جاتا؟ بالکل نہیں۔ اُلٹا بڑھتا ہی۔ میں سوچتی ـــ میں کیا کر آئی ہوں۔ ان بچاروں کو کیا معلوم، جو لوگ عورت کو جنتی نہیں سمجھتے، بیوپار جایداد کی چیز سمجھتے ہیں، جن کے دماغ میں شادی کا وہی پرانا مہتو گھسا ہوا ہے جو آج سے ہزاروں سال پہلے تھا۔ انھیں اس بات کی کیا سمجھ؟

رات دو بجے میں ہڑبڑا کے اٹھی۔ گھر بھر میں شور مچا ہوا تھا ـــ روپا شیتل کے ساتھ دوڑ رہی تھی کہ پکڑی گئی۔ میرے ہاتھ پانو ٹھنڈے ہو گئے۔ روپا سے ہر طرح کے سوال کیے جا رہے تھے مگر اس نے ایک ہی چپ لگا رکھی تھی۔ وہ ڈھیٹ بن گئی تھی اس کا انداز کچھ ایسا تھا کہ کر لو جو میرا کرنا ہے، میں تو وہی کروں گی جو میرے من میں ہے۔

ایک بات اچھی ہوئی جو شیتل نکل چکا تھا۔ اس کے بارے میں کسی کو پتا نہ چلا۔ وہ ہوتا تو سب کہہ ڈالتا۔ اسے کیا پڑی تھی؟ وہ تو رسیا تھا، باقی رہی روپا کی بات روپا کو کوئی مار بھی دیتا تو میرا نام نہ لیتی۔ وہ اتنی ناشکری نہ تھی!

اب سب کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے۔ اتفاق سے دوسرے ہی دن گھر کے نائی نے بالاگھاٹ میں ایک رشتہ بتا دیا۔ ایسے سیٹھ کا نام لیا جس کے پیچھے دیوانے نکل چکے تھے اور جو بنولوں کا بیوپار کرتا تھا ـــــ سب کچھ جلدی سے طے ہو گیا۔ رُوپا کو منانے کا کام میرے سُپرد کیا گیا۔ رُوپا کچھ مانی کچھ نہ مانی اور کچھ دنوں ہی میں برات بھی دروازے پر آ گئی۔

میں نے لڑکا دیکھا تو میری طبیعت خوش ہو گئی۔ شیتل تو اس کے مقابلے میں کچھ نہ تھا۔ یہ جوان، خوبصورت، لمبا چوڑا۔ میں روپا کے پاس بھاگی گئی اور اسے سب بتا دیا۔ روپا مسکرا دی۔ ایک روکھی پھیکی مسکراہٹ۔ میں تو ناچ اٹھی جیسے رُوپا کی نہیں میری شادی ہونے جا رہی ہے۔

تم نے تو وہ شادی دیکھی ہے، بالو کی ماں؟ ـــــ وہ شادی دیول نگری میں یادگار رہے گی۔ ان کے پتا نے وہی کیا جو ہماری جات برادری کے لوگ کرتے ہیں۔ ایک لاکھ روپیا لگا دیا۔ گھر میں کس نے نہیں کھایا؟ کون لاگ لے کے نہیں گیا؟ ہمیں وار کرنے، چھیڑنے کو پوری برات ملی اور پھر وہ ـــــ دُولھوں کا دُولھا۔ وہ ہنگامہ ہوا، وہ شور مچا کہ بس ـــــ بینڈ باجے، گانے، روشنیاں۔ میری جیٹھانی کے بچے خوش تھے۔ میں نے بلرام کو بلایا اور کہا ـــــ دیکھ ننھے! تیری بُوا کی شادی ہو رہی ہے۔ اس بچارے کو کیا پتا، کیا ہوا اور کیا نہیں ہوا؟ اور کیا ہونے جا رہا ہے؟ وہ خوش تھا۔ ہاتھ میں ایک بڑا سا میسُو تھامے، اس نے صرف اتنا سا کہا۔ میں بھی شادی کروں گا، چاچی!

میں نے کہا ـــــ کس سے؟

بولا ـــــ بُجاسے ـــــ

ہشت! ـــــ دڈا جو پاس کھڑی تھی، بولی ـــــ

ڈولی گئی۔ وہ آتشبازی چھوٹی کہ رام رام۔ پانچ ہزار کا ٹھیکہ میں نے ان کو کہہ سُن کے شیتل کو دلوا دیا تھا اور وہ خود کھڑا اپنے سامنے چکر چلوا رہا تھا جس میں سے سات رنگ کے پھول نکلتے تھے ـــــ ڈولی گئی! اب گھر میں دونوں، تیلوں، کاغذ کے پھولوں، بیلوں، پھٹے ہوئے غباروں، چلے ہوئے اناروں، چکروں کے بانسوں، کانچ کے ٹکڑوں، فرنی کی پلیٹوں کے سوا کچھ نہ رہ گیا تھا۔ جتنا شور مچا تھا۔ اتنی ہی چپ تھی ـــــ

کہیں دو مہینے کے بعد روپا آئی۔ اس کے چہرے کا رنگ ہی اور تھا۔ لڑکے نے اُسے اور اُس نے لڑکے کو بے حد پسند کیا تھا۔ روپا کے پانو زمین پر نہیں ٹکتے تھے۔ اب میں اس کے سامنے یہاں کے ٹمکی پھوڑ کا نام لیتی تو روپا خود ہی منہ پہ ہاتھ رکھ دیتی۔ میں نے رُوپا سے کہا ـــــ رُوپ! دیکھا ـــــ میں نہ کہتی تھی؟ رُوپ بولی ـــــ اور تو کوئی بات نہیں بھابی! ـــــ یہ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ مگر دُتو بہت ہیں گھر میں کمانے والے میرے سسر ہیں اور ان کے بڑے بھابی۔ اس لیے ہر چھوٹی بڑی بات کے لیے انھیں ان کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہے پھر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اُس کے گھر کے بڑے ہم سے کچھ اور چاہتے ہیں ـــــ

اور وہ تمھارا؟ ـــــ میں نے شرارت سے پُوچھا۔

وہ تو کچھ نہیں چاہتے بس ـــــ رُوپا نے کہا اور میری طرف دیکھ کے ہنس دی اور بولی ـــــ بہت وہ کروگی بھابی تو ماروں گی، ہاں!

میں مارے خوشی کے رُو دی۔ لیکن مجھے کیا پتا تھا ہمیشہ کے لیے رونا پڑ جائے گا۔

ہائے، یہ مرد ـــــ رُوپا چار مہینے سے یہیں ہے اور کوئی لینے والا نہیں آیا۔ دو روپیا مانگتے ہیں اور یہ دینے پہ تیار نہیں۔ رُوپا نے ٹھیک کہا تھا۔ لڑکا ڈُتو ہے۔ بات اُنی ہے کہ اچھی شکل جوانی سے کچھ نہیں ہوتا۔ جب تک مرد کماؤ نہ ہو، بیکار ہے!

ابھی چند مہینوں میں روپا آدھی رہ گئی ہے۔ وہ بچارے سے بھی نیچے نہیں جھانکتی حالانکہ دوسرے تیسرے روز دیول نگری کا بانکا، شیتل آتشباز پیار کے گانے گاتا نکل جاتا ہے۔ کل سویرے میرے سسر آئے۔ بہت خفا معلوم ہوتے تھے۔ اُس نائی کو گالیاں دے رہے تھے جس نے یہ رشتہ کرایا۔ کہہ رہے تھے ہم لڑکی کو کبھی نہ بھیجیں گے۔ چاہے ساری عمر گھر بیٹھی رہے۔ ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ رُوپا کے سسر کا تو ایک بھی دیوالہ نہیں نکلا!

یوکلپٹس

بہت ہی مرا مرا سا دن تھا جب کہ نومبر کی وہ ٹھٹھری ہوئی رات پیدا ہو رہی تھی۔ لمبے دھڑ ادھڑ ایک دوسرے پر ڈھیر ہو رہے تھے اور مٹی کا وہ ٹیلہ بن رہے تھے جس میں سے یوکلپٹس کا پیڑ پھوٹ کر نکلتا تھا۔

کندن ایک اعصاب زدہ ٹیلیفون کے جواب میں گھر لوٹی تھی۔ ایک ہاتھ میں اس نے سائیکل کا ہینڈل تھام رکھا تھا اور دوسرے سے کتابیں، جو خام چمڑے کے فیتے میں کیریر پہ ڈھیلی ہو رہی تھیں۔ یہ کتابیں کندن نے اسی شام فادر ولیم اسکول کی لائبریری سے نکلوائی تھیں، جہاں وہ وائس پرنسپل تھی۔ قاعدے سے کندن کو گولی کی طرح سے بنگلے میں داخل ہونا چاہیے تھا مگر پھاٹک کے اندر آتے ہی وہ ہمیشہ کی طرح سرجو کے پاس رُک گئی۔

——— سرجو یوکلپٹس کے پیڑ کا نام تھا۔

یہ پیڑ کندن نے تین سوا تین برس پہلے لگایا تھا جب وہ نئی نئی وس کانسن یونی ورسٹی سے ٹیچنگ کا ڈپلوما کر کے آئی تھی۔ جب یہاں کیتھولک چپلن فادر فشر رہا کرتا تھا اور جس نے بنگلے کا آدھا حصّہ کماری کندن کو دے رکھا تھا۔ پھر برس ایک کے بعد وہ مشن کا کام پورا کر کے امریکا چلا گیا اور کندن نے تنہائی سے گھبرا کر اپنی بوڑھی ماں کو بلا لیا۔ سائیکل کو جنگلے

کے سہارے رکھ کر کندن سرجو کے پاس آ کر اوپر کی طرف دیکھنے لگی جہاں پتے اب تک اندھیرے کا رنگ لے چکے تھے۔ البتہ نیچے کی سفید، ملائم اور برچی چھال ابھی تک دکھائی دے رہی تھی۔ وہ پیار سے اس پر ہاتھ پھیرنے ہی والی تھی کہ دوسری طرف برآمدے میں اسے اپنی جیلی فش ماں کا ہیولا سا نظر آیا۔ اسی دم جھک کر کندن نے پیڑ کے نیچے سے تازہ گرے ہوئے پتے اٹھا لیے اور ہاتھ میں مسل کر انھیں سونگھنے اور لانبے لانبے سانس لینے لگی جیسے اسے زکام ہو اور یوکلپٹس کی بو تنفس اور اس کے رگوں ریشوں کو ایک طرح کا سکون دے رہی ہو۔ پھر ماں کی طرف منہ کرتے ہوئے کندن تھوڑا کھسیائی: "میں تو سرجو کو بڑھتے دیکھ بھی سکتی ہوں، ماں!"

اور اس نے پیڑ کی طرف اشارہ کیا۔

ماں کے چہرے میں سے پسینے کے باریک باریک قطرے رس رہے تھے جیسے کورے گھڑے میں پانی ڈالنے سے وہ رسنے لگتا ہے۔ دوپٹے سے ماں اپنا چہرہ پونچھتے ہوئے بولی۔

"پودے دن کو نہیں، رات کو بڑھتے ہیں، کندنا!"

"کیوں۔ رات کو کیوں؟"

"اپنی کے سب کام پرماتما اندھیرے میں کرتے ہیں۔"

اور پھر ماں چپ ہو گئی۔ کندن کو ماں سے کسی اور بات کی توقع نہ تھی۔ وہ جانتی تھی ایک پیڑ کے ساتھ اپنی بیٹی کی بیو رسی محبت کو دیکھ کر ماں اکثر پریشان ہو اٹھتی ہے۔ سائیکل کو جنگلے پر سے اٹھا کر کندن برآمدے میں پہنچی ہی تھی کہ ماں نے کہنا شروع کیا: "پھر کیا نہ وہی خلجگن لکھی نے!"

لکھی کندن کی کرسچین نوکرانی تھی۔ کندن نے وہیں رُکتے ہوئے کہا "کیا مطلب؟" اور پھر، جیسے اپنے آپ سمجھ گئی ——— "شروع ہو گیا؟"

"ہاں"

"کب سے؟"

"جب سے پٹر دس کے مالی سے تمھیں ٹیلی فون کرایا۔"

اور ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے ماں نیچے فرش ہی پر بیٹھ گئی حالانکہ پاس ہی برآمدے

میں ملاقاتیوں کے لیے رکھی ہوئی آدھے درجن بید کی کرسیاں پڑی تھیں. یہ حرکت عورتیں اس وقت کرتی ہیں جب کوئی مرنے والا ہو، یا مر چکا ہو۔

ادھر لکھی اپنے کوارٹر میں کراہ رہی تھی. ادھر ماں گالیاں بکے جا رہی تھی. اس کی آخری گالی تھی ——— "چھنار" جبھی لکھی کی چیخ سُنائی دی تو ماں اور کندن دونوں منہ اٹھا کر اندھیرے میں دیکھنے لگیں جیسے لکھی سامنے تڑپتی ہوئی نظر آ رہی ہو. شاید ——— دردِ زِہ میں مبتلا عورت کہیں بھی ہو، دوسری سب عورتوں کو دکھائی دینے لگتی ہے۔

کندن نے ایک دم گھبرا کر ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ماں"

"سُن رہی ہوں" ماں نے اپنے بوڑھے، چرخ چوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر مشکل سے اٹھتے ہوئے کہا اور گرتے گرتے بچی۔ "مجھے بھی کان دیے ہیں پرماتما نے" وہ بولی اور سچ مچ ہی اپنی بات کو سچ ثابت کرنے کے لیے دونوں ہاتھ کانوں کی طرف اٹھا دیے۔

کیا جذبہ تھا کہ دوسری چیخ کے ساتھ ہی ماں بھی چلا اٹھی۔ "مرتی ہے تو مر جائے ——— کیوں نہیں دن کے وقت بتاتی رانڈ؛ ——— پار سال بھی ایسے ہی کیا تھا"

ماں بولے بغیر بھی نہ رہ سکتی تھی ——— "کیسے خونو خون، ہو گئے تھے میرے ہاتھ پیر، کپڑے جو نوچندی میں بنوائے تھے، تم نے پیسے بھیجے تھے ——— میں اس کے باپ کی دائی ہوں؟" پھر ماں کے پیر کوارٹر کی طرف اٹھ گئے، پھر وہ لوٹ بھی آئے۔

چیخ جو تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد سنائی دے رہی تھی، مسلسل ہو گئی. کندن کے پیٹ میں بھی جیسے کوئی آزار پیدا ہو گیا اور طنابیں سی کھنچنے لگیں. سامنے ہاتھ رکھتے ہوئے وہ بولی: "تو سمجھتی کیوں نہیں ماں؟ ——— وہ غریب بے پیسے والے سو دار و کر سکتے ہیں؟"

اور کندن آپ ہی کوارٹر کی طرف چل دی جب ماں نے لپک کر اُسے بازو سے تھام لیا اور دھمکی آمیز لہجے میں بولی ——— "کندنا!" اور پھر کوارٹر کی طرف جاتے ہوئے کہنے لگی: "یہ کام تیرے ایسی کچی کنواری کا ہے؟"

ماں لکھی کے پاس جانا بھی چاہتی تھی اور اپنی اہمیت کو جتانا بھی۔ جاتے ہوئے وہ منہ میں کچھ بکے جا رہی تھی. صرف ایک یہ لفظ کندن کے کان میں پڑا۔ "چھنار ———"

کہیں سے کوئی چمگادڑ اڑا اور ڈرائنگ روم کے اندر بیرا بولا کی شکلیں پیدا کرتا ہوا سامنے پہاڑیوں کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں سے باہر اُڑ گیا جس میں ایک روز پہلے کی بارش کی وجہ سے بھنبٹ در قطار اندر آ رہے تھے اور سوداٹ کے بجلی کے ہنڈے سے ٹکرا کر زمین پر ڈھیر ہو رہے تھے. جب وہ گرتے تو پتا بھی نہ چلتا صرف دیکھنے سے یوں لگتا جیسے زمین اوپر کی طرف اٹھ رہی ہے ——— ..... اور لمحوں کا ایک ٹیلہ بن رہا ہے.

کندن کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی اور انتظار کرنے لگی. روشنی میں تو اونچ پنیچ سب نظر آتا ہے مگر اندھیرا ایک عجیب قسم کی یکسانیت پیدا کرتا ہے. صرف اس کے عادی ہو جانے پر مصیبتوں کے ہلکے خاکے اور گہرے خاکے دکھائی دیتے ہیں جو اس یکسانیت میں اور بھی تاکید کا عالم پیدا کر دیتے ہیں اور آدمی گھبرا کر کھڑکی چھوڑ دیتا ہے اور ایک بے پناہ حبس سے بچنے کے لیے کسی کا بھی گریبان پھاڑ دیتا ہے۔

کُندن واپس آ کر صوفے میں بیٹھی تو یوں معلوم ہوا جیسے صوفے کے بازو اوپر اٹھے اور ایک حسین لڑکی کو آغوش میں لے لیا ——— کُندن انتظار کرنے لگی.

پہلے تو انتظار ٹِک ٹِک کرتا رہا، پھر وہاں کے کیتھولک مشن کے گرجے میں لگے ہوئے گھڑیال کی طرح بجنے لگا. چیخیں تھم چکی تھیں. شاید ماں کے پہنچ جانے سے لکھی کا حوصلہ ہو گیا تھا یا شاید بچہ پیدا ہو گیا تھا ——— نہیں، بچہ اس دنیا میں آتا تو ضرور روتا ——— شاید ماں کو گرم پانی کی ضرورت پڑے ——— کندن لکھی کی کھولی تک جا پہنچی. لیکن سوائے ماں کے بڑبڑانے کے اور کوئی آواز نہ سنائی دی. وہ ضرور گالیاں تھیں جنھوں نے اس سانحے کے پیشِ نظر بے شکل، سا صوت اختیار کر لیا تھا. بیچ میں کندن کو کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دی جیسے کوئی لکڑی کو چیرنے کے بجائے زمین پر مار مار کر توڑ رہا ہو پھر لکھی کے ہونگنے کی آواز، جیسے اس نے افیون کھائی ہو اور اصل کی تائید اور نقل کی تردید کرنے

کا جتن کر رہی ہو۔ کندن نے اپنے بدن میں سے کوئی بجلی جھٹکی اور بنگلے کی طرف مڑ آئی۔ راستے میں سرجو کی طرف دیکھا تو اُسے ایک بچّہ دکھائی دیا جس سے ڈر کر وہ بھاگتی ہوئی ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئی۔

تھوڑے حواس بجا ہوئے تو کندن تپائی پر پڑی ہوئی کتابیں اُلٹنے پلٹنے لگی۔ ان پر کھڑکی میں سے آنے والے بے شمار لمحے بکھرے پڑے تھے جن کے پر جھلسے ہوئے تھے اور بدن مردہ۔ کندن نے اوپر کی کتاب کو صاف کیا جس کا عنوان تھا ——— "مرد، عورتوں کے بغیر ———" اس نے کتاب کھولی، پہلی چند سطریں پڑھیں اور پھر بند کرتے ہوئے سوچنے لگی ——— "عورتیں، مردوں کے بغیر"

فادر ولیم اسکول کی وائس پرنسپل کماری کُندن ایم۔اے، ٹی ڈپ کے بنگلے میں تین عورتیں تھیں اور تینوں ہی مردوں کے بغیر ——— پہلی ماں۔ سبھاشنی، جواب چھیاسٹھ سال کی ہو چکی تھی اور بے شمار لمحے اس پر ڈھیر ہو کر تہیں جما چکے تھے۔ اس کا نام آج کل کی لڑکیوں کا سا تھا لیکن اب تک اس نام کی سب لڑکیاں بوڑھی ہو چکی تھیں۔ نئے نام پرانے ہو چکے تھے اور نئی طرز کے وضع نہ ہوئے تھے۔ اور لوگ مجبور ہو کر پرانے ناموں پر لوٹ آئے تھے، جیسے ——— کُندن ——— جو نام کبھی بوڑھا تھا مگر اب جوان ہو چکا تھا۔ پچیس چھبیس برس کا، اور خوبصورت اور دمکتا ہوا۔ سبھاشنی بدصورا تھی اور کندن یتیم۔ اس نے تو باپ کا منہ بھی نہ دیکھا تھا اور زندگی بھر اس کے لیے تڑپتی رہی تھی۔ ابھی وہ پیٹ ہی میں تھی کہ ماں کے بیان کے مطابق کندن کا باپ چل بسا تھا۔ اس صدی کے شروع میں جو پلیگ پھیلی تھی اس نے موت میں سچ اور جھوٹ کو برابر کر دیا تھا۔ عجیب سی یکسانیت پیدا کر دی تھی۔ اس لیے جب مشن میں فادر مائیکل آسمانی باپ کے بارے میں باتیں کرتا تو کندن ہمیشہ سوچنے لگتی، وہ تو مر چکا ہے، کسی زمینی پلیگ میں اور جب اسے کہا جاتا آسمانی باپ لافانی ہے، وہ کسی پلیگ میں نہیں مر سکتا تو وہ اسے ڈھونڈنے کے سلسلے میں قریب کے کسی بھی مرد پر عاشق ہو جاتی چاہے وہ کیتھولک چیپلن ہی کیوں نہ ہو حالانکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کیتھولک پجاری کبھی شادی نہیں کر سکتے۔

کئی بار کندن نے چچا، تاؤ اور ددھیال کے بارے میں پوچھا لیکن ماں نے ہمیشہ دریچے سے باہر دیکھتے ہوئے کہہ دیا۔ سب مر کھپ گئے دوسری پلیگ میں ——— تیسری پلیگ کب آنے والی تھی؟ اور پھر ایکا ایکی متجسس نگاہیں کندن پر پھینکتی ہوئی ماں پوچھنے لگتی ——— "تو کیوں پوچھتی ہے؟"

"ایسے ہی" کندن جواب دیتی اور پھر کہہ اٹھتی۔ "ماں! آج ٹیچر نے مجھے یہ ریشمی رومال دیا تھا، مجھ سے بہت پیار کرتا ہے۔"

سبھاشنی نے اپنا رنڈاپا اپنے چچیرے بھائی اسولک رام کے ہاں کاٹ دیا تھا جو امرتسر میں لاہول اور تبت سے آئے ہوئے کُٹھ کا بیوپار کرتا تھا ——— کُٹھ جو مرتے ہوئے آدمی میں بھی ایک بار تو زندگی کی لہر دوڑا دیتی ہے۔ وہ مرتا ضرور ہے لیکن اس سے پہلے وصیت کر جاتا ہے۔ سبھاشنی نے کندن کے ساتھ ساتھ اپنی بھتیجیاں اور بھتیجے کھلائے تھے اور اس کے عوض روکھے سوکھے ٹکڑے پائے تھے۔ اسی لیے کندن کی لوریاں اس کے لیے بھجن ہو گئی تھیں ——— روکھا سوکھا رام کا ٹکڑا، سیٹھا کیا اور سلوما کیا ——— وہ بھابی کے پھٹے پرانے پہنتی تھی تو اکثر باہر نہ نکل سکتی تھی۔ کیوں کہ اس کا جسم جوں کا توں بھرا ہوا تھا حالانکہ بھابی کا خرچ چاند کی طرح سے گھٹتا بڑھتا رہتا تھا۔ بھابی کے کپڑوں میں پھنس پھنسا کر سبھاشنی برہنہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ ہمیشہ ایک جرم کے احساس اور اذیت پسندی کے جذبے میں نیچے ٹھنڈے فرش پر سوتی تھی اور ایک رہبانیت سی اس کے جذبات پر چھائی رہتی جس میں اداسی بھری ایک تسلی تھی۔ اسے اس حدّت کا احساس ہی نہ تھا جو مرد کے ساتھ والی چارپائی پر سونے سے عورت کے بدن میں اپنے آپ پیدا ہوتی رہتی ہے۔ پھر سوتے میں کبھی تکیہ اور لحاف وغیرہ ہوتے تھے اور کبھی نہ ہوتے تھے۔ سوائے سردی کے موسم میں ان کی ضرورت ہی کیا تھی؟ پھر، سبھاشنی سوتی ہی کہاں تھی؟ جاگتی بھی کہاں تھی؟ وہ تو خواب اور بیداری کے اعراف میں روتی ہنستی رہتی اور بھجن اس کا سہارا ہوتے۔

جب نینن سے نیند گنوائی، تکیہ لیف بچھونا کیا
آخر ——— سمجھ بوجھ کچھ سوچ پیارے، پیار کیا تو رونا کیا؟

بھابی کی گالیوں کو سبھاشنی نے گھی کی نالیں، مجھا اور مار پیٹ، دھکوں کو پھولوں کی چھڑیاں، اور یوں کندن کو پڑھایا باقی وہ وظیفوں اور سرکاری گرانٹوں سے آگے بڑھتی بڑھتی امریکا تک جا پہنچی۔ وہ خوب صورت تو تھی ہی، اس پر تعلیم نے اس کے حُسن کو اور بھی صیقل کر دیا تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں جن میں بیسیوں شک تھے اور وسوسے۔ ایک عجیب سے ارتقا میں اس کی آنکھیں کانوں تک کھنچ آئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا سامنے جاتی ہے تو پیچھے بھی دکھائی دیتا ہوگا۔ یا وہ ایسے ہی دیکھتی رہتی تھی جیسے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ باپ نہ ہونے سے لڑکیوں کو کیسی کیسی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے ـــــ اس کے باوجود بارہ تیرہ برس ہی کی عمر میں کندن کو ایک ایسے مرد کے سلسلے میں تجربہ ہوا تھا جس کے بارے میں وہ کبھی سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ شاید وہ مر جاتی مگر گمٹھ نے اس کی زندگی بچالی تاکہ وہ بڑی ہو کر یو کلپٹس کا پیڑ ہو سکے۔ یہ سب ایک طرح سے اچھا ہی ہوا ورنہ کندن پڑھائی ہی کو شادی نہ سمجھتی۔

تیسری عورت لکھمی تھی، کرسچین۔ وہ تیس ایک برس کی تھی اور محنتی ہونے کی وجہ سے تندرست۔ اس کا اصل نام لکشمی رام داس تھا اور اس کے شوہر کا نام سدھو گرگیٹی اور گرجے کے رجسٹروں میں رام داس کچھ یوں چڑھا کر پھر نہ مٹا اور لکھمی آج تک نہ بتا سکتی تھی کہ رام داس اس کے باپ کا نام تھا یا کسی پہلے شوہر کا۔ کبھی وہ اسے شوہر کا نام بتاتی اور کبھی باپ کا۔ اور پھر ایک بتری کے عالم میں ـــــ "میرے باپ کا بھی وہی نام تھا جو میرے مرد کا۔"

لکھمی کا یہ تیسرا مرد ـــــ سدھو، وہاں سے اکا دن باون میل دور کسی کولیئری میں کام کرتا تھا۔ وہ سال میں صرف ایک دو بار آتا۔ جب اس کے کپڑے کوئلے اور اس کی دھول سے اٹے ہوتے اور چہرے پر سیاہیاں کھنڈی ہوتیں۔ کچھ تو کوئلے کی اور کچھ ایسے جرائم کی جن کا وہ بے اختیار مرتکب ہوتا۔ ان باتوں کے کارن وہ آپ ہی اپنا ہمزاد معلوم ہوتا تھا۔ وہ آتا تو نہایت ہی بدصورت دکھائی دیتا اور جب نہ آتا تو اس سے بھی زیادہ بدصورت ـــــ سدھو کا بھوت بنگلے میں دکھائی پڑتے ہی ماں سبھاشنی اور کندن پنجے جھاڑ کر لکھمی کے پیچھے پڑ جاتیں۔

"کیوں تو ہر بار اس کے ساتھ راس رچا بیٹھتی ہے؟"

"جب وہ تیری ذمّہ داری لیتا ہے، نہ تیرے بچّوں کی، اپنے ـــــ؟"

"سب مرد ایک ہی رسّی سے پھانسی دیے جانے کے قابل ہیں۔"

مرد! ـــــ لکھمی پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھنے لگتی۔ کبھی سب غلط اور کبھی سب ٹھیک معلوم ہونے لگتا ـــــ ہاں، ہاں، ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں۔ سب مرد اس قابل ہیں کہ ـــــ میں ایک اور کر لوں گی، مگر نہیں ـــــ وہ بھی تو ـــــ پھر وہ ایکا ایکی خفا ہو اٹھتی اور اپنا ہاتھ جوتی کی طرف لے جاتی۔ اس کے بعد سدھو کا ہمزاد اس کی طرف آتا، نم آنکھیں لیے، ہاتھ جوڑے اور لکھمی کا ہاتھ جوتی کی طرف جانے لگتا۔ پھر وہ دیکھتی۔ جب تک سدھو کا ہاتھ لکھمی کے بدن پر پڑتا اور لکھمی کی گرفت ڈھیلی ہو جاتی آنکھیں بند ہونے لگتیں اور وہ بے دم سی ہو کر گر جاتی۔ اسے جب ہی پتا چلتا جب اس کے پیٹ میں کیڑا رینگنے لگتا ـــــ

کرسچین ہونے کے ناتے لکھمی میں صبر تھا اور شکر بھی۔ لیکن کندن نہ کرسچین تھی نہ مسلمان اور نہ ہندو۔ وہ ایک تعلیم یافتہ لڑکی تھی، وہ سوچتی ـــــ کیا بکواس ہے، بچّہ ہمیشہ عورت کو اٹھانا پڑتا ہے۔ ایک دن تو آئے گا جب چاند، زحل اور مشتری تک پہنچنے والے عورت کی سوچ بچار کے افلاک پہنچیں گے اور مرد کے ہاں بھی بچّہ ہونے کا سامان کریں گے آخر سارا سلسلہ تقلب ہی کا ہے نا ـــــ مگر ایسے میں تو داڑھی اُگ آئے گی ـــــ!

ماں گرتے پڑتے چلی آئی۔ اس کے کالے بھورے بال بھیگے ہونے پر بھی بکھرے ہوئے تھے۔ کچھ منہ پر کچھ جھکے جھکے شانوں پر۔ اس نے کس قدر جلدی میں اپنے ہاتھ پیر خون سے صاف کیے تھے، اس پر بھی بانات کی قمیص پر ایک چھچھڑا لگا ہوا تھا جس کے بارے میں وہ نہ جانتی تھی۔ وہ گالیاں دے رہی تھی، تیز تیز اور بے ربط اس کی آخری گالی تھی ـــــ "ایک اور لڑکی چلی آئی ـــــ"

کندن چونک کر اٹھی۔ بچّہ پیدا کر دینے کے بعد سنبھالنے کا کام کندن کا تھا جب وہ لکھمی کے کوارٹر کی طرف لپکی تو ماں کہہ رہی تھی: ایک لائسن (لائسنس) لے لو کندن ـــــ

ابکے وہ حرامی آیا تو میں اسے گولی مار دوں گی۔"

اور ماں سبھاشنی اپنے تخیل میں لاش دیکھ رہی تھی اور رو بھی رہی تھی جیسے ہر عورت اپنے بیٹے کی سرزنش کے بعد خود رونے بیٹھ جاتی ہے ______

سرجُو لہراتا رہا۔ ہر صبح و شام اسکول جانے سے پہلے اور لوٹنے کے بعد کندن اس کے پاس رکتی اور اس کی نرم سی چھال پر ہاتھ پھیرتی، پیار کرتی ______ اور ماں سبھاشنی دیکھتی، پکارتی "کندنا! اب آبھی جا۔"

سرجُو اب بیس پچیس فٹ لمبا ہو گیا تھا۔ کہیں سولہ سترہ فٹ اونچا جا کر تو اس کے تنے پھوٹتے تھے اور پتّے پھلیوں اور نمتوں کی طرح عموداً لٹکے رہتے، جس کے کارن دوپہر کے سمے جب سایے کی ضرورت ہوتی تو سرجُو بیکار ثابت ہوتا۔ البتہ پہلے اور پچھلے پہر جب چھانویں ہی بدن میں کپکپی پیدا کرتی تب یہ بھی لانبے اور گھنیرے سایے پیدا کرنے لگتا اور لکھمی کی تینوں چاروں بیٹیاں ریل ریل کھیلتی ہوئی ایک دوسرے کا فراک تھامے، پیچھے سے ننگی پیڑ کے نیچے چلی آتیں۔ اس کی آخری بیٹی ریوڑی بھی ______ اپنا گول مٹول اور ممتی دار چہرہ لیے سرجُو پیڑ کے نیچے سے ریت کے لمحے اکٹھے کرنے لگتی۔

کندن نے ماں کے کہنے پر بندوق کا لائسنس تو نہ لیا تھا البتہ ایک اور بندوبست کیا تھا جو بندوق سے بھی مؤثر ثابت ہوتا ہے۔ بندوق تو رات کے وقت بے کار بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ ہتھیار کبھی خالی نہیں جاتا۔ اس نے چاکلیٹ کے رنگ کا ایک کتا رکھ لیا تھا جس کا منہ خوفناک تھا اور جبڑے کالے، جن میں سے ایک فٹ کی زبان ہمیشہ باہر نکلی رہتی تھی۔ جیگوار بہت موڈی کتا تھا۔ سدّھو کو بنگلے میں آنے دینا تو کجا، کندن کو بھی اندر آنے کے لیے اس سے اجازت لینا پڑتی تھی۔

بچیوں سے جیگوار البتہ مانوس ہو چکا تھا کیوں کہ وہ چوبیس گھنٹے بنگلے میں رہتی تھیں۔

ایک دن لکھمی کو ابکائیاں آنے لگیں اور بہت ادھر ادھر کی کرنے کے باوجود ماں کو پتا چل گیا اس کے پیٹ میں بچّہ ہے۔ وہ کیسے ہوا؟ لکھمی اس کا تسلی بخش جواب نہ دے سکتی تھی۔ اس نے بڑی سے بڑی قسمیں کھائیں کہ وہ اپنے مرد کے پاس نہیں گئی۔ ماں سبھاشنی اور کندن جانتی تھیں کہ ریوڑی کے بعد سدّھو بنگلے میں نہیں آیا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا تھا کہ لکھمی نے چوری چھپے کوئی اور مرد کر لیا مگر لکھمی انکار کرتی تھی۔ وہ یہ بات بھی "سچ" کہتی تھی کہ اس نے کسی مرد کا منہ بھی نہیں دیکھا۔

نہیں دیکھا تو پھر یہ سب کیسے ہوا؟

بنگلے میں کہرام مچ گیا۔ لکھمی ایک طرف بیٹھی ہوئی تھی اور ماں بیٹی آپس میں لڑنے لگیں۔ ماں اس کتیا کو باہر پھینکوا دینا چاہتی تھی مگر کندن اس بات کی اجازت نہ دیتی تھی۔ اتنے ڈھیر سارے بچّے لے کر وہ کہاں جائے؟ ماں نے اپنے بھائی اسولک رام کے ہاں چلے جانے کی دھمکی دی۔ کندن نے بہت سمجھایا، پیروں پڑی۔ لیکن جب ماں باپ کی ہمسائی ہونے کو تیار نہ ہوئی تو کندن نے صاف کہہ دیا ______ اچھا ماں تم جاؤ تو جاؤ، میں لکھمی کو نہ نکالوں گی ______"

اس پر ماں خوب دھاڑیں مار کر روئی۔ یہ بیٹی میری ______ ماں کا جانا سہہ سکتی ہے۔ لیکن لکھمی کا نہیں۔ لکھمی اس کی کیا ہوتی ہے؟ جبھی ماں کو بھابی کے ظلم یاد آئے اور اس نے بیٹی کے پیروں پر سر رکھ دیا اور سفید بالوں کا واسطہ دے کر معافی مانگ لی۔

لیکن پھر لکھمی سے وہی پوچھ گچھ شروع ______ "سچ بتا، کہاں سے لائی ہے؟"

"کہیں سے نہیں" لکھمی کہتی "اگر میں نے پاپ کیا ہو تو خداوند یسوع میری چاروں بیٹیوں کو لے جائیں"

"بیٹیوں کا کیا ہے؟" ماں کہتی "وہ تو ہر عورت چاہتی ہے"

کندن ایک جھٹکے کے ساتھ بات کاٹ دیتی۔ "ماں ______"

ماں کندن کی طرف دیکھتی ______

"میں بھی تیری بیٹی ہوں ______" کندن آنکھوں میں شکایتیں، حکایتیں لیے

ہوئے ماں سے کہتی، "تو چاہتی ہے، پرماتما مجھے لے جائیں؟"

ماں سہماشی کندن کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی تاکہ وہ اس سے زیادہ اشبھ اور اوگت والی بات نہ کہہ سکے اور پھر اپنی بیٹی سے لپٹ جاتی، کہتی ہوئی: "کندنی! اور پھر تو میری بات نہیں سمجھتی، میں بھی تو کسی کی بیٹی ہوں میں بھی سوچتی ہوں میں کیوں اس سنسار میں چلی آئی، کیوں نہ پیدا ہوتے ہی مر گئی؟"

اس بات کے مہینے ڈیڑھ مہینے کے بعد صبح کاذب کے قریب جیگوار بہت غرایا، بہت بھونکا لیکن وہ لوہے کی ایک موٹی سی زنجیر سے بندھا ہوا تھا۔ برآمدے کے جس ستون کے ساتھ اسے باندھا گیا تھا اپنی جگہ سے ہل گیا مگر زنجیر نہ ٹوٹی۔ اس کے یوں بے تحاشا بھونکنے سے ماں اور کندن نے لیمپ ہاتھ میں لے کر ایک دو بار باہر جھانکا بھی مگر کچھ نہ دکھائی دینے پر خاموش ہو گئیں۔ صرف ماں نے اتنا کہا۔

"یہ جیگوار کو آج ــــــ ہوا کیا ہے؟"

"جانے ــــــ بہت ہی بھونکا ہے۔"

"ادھر ہی بھونکتا ہے، جس طرف سرجو ہے۔"

کندن نے بھی ایک بار ادھر دیکھ لیا۔ حالانکہ اندھی سی روشنی میں سرجو کی سفید چھال بھی سیاہ دکھائی دے رہی تھی۔ کندن بولی: "ہاں ماں! جانوروں کو وہ سب دکھائی دیتا ہے جو ہم انسان نہیں دیکھ سکتے۔"

اور کندن نے پٹے سے گھسیٹتے ہوئے جیگوار کو اندر ڈرائنگ روم میں باندھ کر دروازہ بند کر دیا۔ ہاں، اب سنہ صوتا بھی جاتا تو کیا بگڑتا؟

لیکن پو پھٹے جب منہ میں برش لیے، کاندھے پر تولیہ رکھے، نائٹ گون میں ملبوس کندن باتھ روم سے بغلی کمرے میں داخل ہونے لگی تو اسے اپنی نگاہوں کے سامنے یوکلپٹس کے نیچے کوئی سفید سی چیز دکھائی دی۔ وہ پہلے ٹھٹھکی اور پھر سنبھلتی ہوئی اس کی طرف بڑھی معلوم ہوتا تھا کوئی بیٹھا ہوا ہے اور دُعا پڑھ رہا ہے۔ جبھی ایک سفید فرغل پوش قد میں سامنے کھڑا ہو گیا۔ کسی آدمی کا چہرہ دھندلا سا دکھائی دے رہا تھا ــــــ

"کون ہے؟" کندن نے فرغل سے چند ہاتھ پر رکتے ہوئے پوچھا۔

فرغل نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف پچھم سے آنے والی ہوا سے وہ تھوڑا سا ہلا۔ کندن ایک قدم اور آگے بڑھی اور اپنی نظروں کے کیمرے کا پورا ڈایافرام کھولتے ہوئے ایک دم چلائی ــــــ "باب!"

پھر وہ برش، تولیہ وغیرہ پھینکتے ہوئے دونوں بازو پورے پھیلا کر باب کی طرف لپکی۔ باب جامد و ساکت کھڑا تھا۔ کندن اس سے لپٹ گئی ــــــ "باب ــــــ باب ــــــ"

باب کے ہاتھ فرغل میں تھے۔ وہ ساکت تھا۔ اس نے کہا بھی تو اتنا "KEEP AWAY"

کندن بھونچکی رہ کر تھوڑا پیچھے ہٹ گئی اور نگاہوں میں معمے لیے بابی فشر کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ دن صاف ہونے لگا تھا اور صبح مشرق کے پرتو میں اس کی آنکھوں کے نمناک کونے دکھائی دے رہے تھے اور چہرے پر گناہوں کا احساس جو بہت سی غیر فانی چیزوں کی طرح سے کبھی نہیں مرتا۔

کندن نے پوچھ ہی لیا: "امریکا سے کب آئے؟"

"رات" بابی فشر نے وہیں سے جواب دیا: "پین ایم سے ــــــ پھر مائکل کی کار میں۔"

کندن ایکا ایکی بھڑک اٹھی غصے اور رقت میں ڈوبی آواز سے بولی "کیوں؟ کیوں آئے تم؟ کیا ضرورت تھی؟ ــــــ چلے جاؤ یہاں سے۔"

بابی فشر جوں کا توں کھڑا رہا۔

کندن نے ہانپتے ہوئے پیچھے کی طرف آواز دی ــــــ "جیگوار ــــــ"

جیگوار کندن کے پکارنے سے پہلے ہی بھونک رہا تھا۔ اسے کوئی بو آ گئی تھی۔ اور وہ زنجیر تڑا تڑا کر باہر آنے، اس اجنبی کو کچا چبا جانے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ کندن اسے کھول کر فادر فشر پر چھوڑ دینے کے لیے لپکی لیکن پھر لوٹ آئی اور سامنے دکھائی دینے والی برف کی سل پر یورش شروع کر دی۔ وہ مکیں توڑ رہی تھی اور چلا رہی تھی "باب، باب، بولو، کچھ تو بولو ــــــ"

کندن کا جسم ساتھ لگتے ہی فادر فشر کی پاکیزگی کے ہالے اور اس کے وطن کے اینڈیز پگھلنے پسیجنے لگے۔ چند لمحے پہلے سردی میں ٹھٹھرنے والے دو جسموں پر کوئی لحاف سے چلے آئے۔

جنھیں اُتار، ایک طرف پھینک کر باب بولا "پرے ہٹ جاؤ ـــــ تم عورتیں سمجھتی ہو، مردوں کے عصمت ہی نہیں ہوتی ؟"

کندن نے تھوڑا پیچھے ہٹ کر بابی کی روح میں جھانکا اور کانپتی ہوئی منت اور آہ وزاری پر اُتر آئی ـــــ

"میں نے عورت ہو کر تمھیں معاف کر دیا، باب ـــــ اور تم ـــــ"

"میرے اور تمھارے درمیان ـــــ میں عورت ہوں!"

بابی اپنا آپ چھڑا کر، سینے پر کراس پیدا کرتا ہوا چل دیا اور کندن پھاٹک تک اس کے پیچھے بھاگتی، پکارتی گئی ـــــ "باب ـــــ باب ـــــ"

اور جب باب نہ پلٹا تو کندن وہیں کھڑی ہو گئی اور اسے جاتے دیکھتی رہی پھر اُسے خیال آیا. شاید ـــــ

اور اس نے ایک بار پھر بلند آواز میں پکارا ـــــ مَا ـــــ د ـــــ ر ـــــ" اور اس کی آواز بے شمار گھاٹیوں اور ان کی سیاہ تہوں میں گرتی، جذب ہوتی ہوئی دکھائی دی۔

ماں نے باب فشر کو نہ دیکھا تھا ـــــ "بیٹا! تم کس سے باتیں کر رہی تھیں ؟" اس نے پوچھا۔

کندن نے اپنی آنکھوں سے مایوسیاں پونچھ ڈالنے کی بیکار کوشش کی اور نیچے دیکھتی ہوئی بولی ـــــ "اپنے آپ سے"

لکھتی پر اب تک سوالوں کی بوچھار ہو رہی تھی: "سچ بتا، کون تھا ـــــ؟ یہ الجھا ہوا نسخہ کہاں سے لائی ؟"

"تم تو یہ مت پوچھو، ماں!"

ماں یکایکی ڈر گئی. اس نے بیٹی کے چہرے پر دیکھا اور کچھ مطلب ڈھونڈنے کی کوشش کی۔

کُندن نے بالقصد چہرے پر ایک معصومیت لاتے ہوئے کہا: "ہم عورتیں ہیں ـــــ ہمیں ایسی باتیں نہیں کرنی چاہییں ماں. کیا یہ کافی نہیں کہ وہ بچہ ہے ـــــ ؟"

"اگر پھر لڑکی ہو گئی تو ؟"

"لڑکی کیا انسان نہیں ہوتی ؟"

"ہوتی ہے، مگر ـــــ"

اور پھر سب باتیں ان چند سوالوں میں گم ہو گئیں جو عورت سے ازل سے پوچھے جا رہے ہیں اور ابد تک پوچھے جائیں گے۔ جن کا وہ کبھی جواب دے گی اور کبھی نہ دے سکے گی اور دے گی بھی تو اس پر ہزاروں دباؤ ہوں گے ـــــ سماجی، اخلاقی ـــــ اور بچے کو کچھ پتا نہ ہوگا اور ماں ڈری، سہمی رہے گی۔

گرجے میں لکھتی نے "کنفیشن" کیا تو ایک اور ہی صورت پیدا ہو گئی جس نے فادر مائکل فادر روبیلو، سسٹر سپیریر انجیلا کو بھگدڑ میں ڈال دیا۔ بابی فشر ابھی تک یہیں تھا اور دم سادھے ہوئے باتیں سن رہا تھا. لکھتی نے کہا ـــــ "وہ خواب میں آیا تھا"

اس پر معاملہ اور ابتر ہو گیا: "کون ؟" سسٹر انجیلا نے پُوچھا۔

کندن بھی وہیں تھی۔ اس نے لکھتی کی مدد کرنے کی کوشش کی "مدھو ؟" اس نے کہا مگر لکھتی نے نفی میں سر ہلا دیا۔ سب اور بھی حیران ہو کر جواب کے منتظر ہو گئے. لکھتی نے اچٹتی ہوئی نظر سے سب کی طرف دیکھا اور پھر آنکھیں جھکاتی ہوئی بولی ـــــ "رام داس !"

کمیٹی اور گرجے کے رجسٹروں میں رام داس ہی کا نام تھا ـــــ

لکھتی قسمیں لے رہی تھی جن پر کوئی یقین کرے تو مرے، نہ کرے تو بھی مرے ـــــ

عشائے ربانی کی یہ شرکت ختم ہوئی. حیران و پریشان کُندن نے سسٹر انجیلا کو ایک طرف لے جاتے ہوئے کہا: "خواب میں آیا تھا ـــــ کیا یہ ہو سکتا ہے سسٹر ؟" سسٹر انجیلا نے خود بوکھلاہٹ کے عالم میں ایک مہمل سا جواب دیا: "کیوں نہیں ؟ ـــــ اگر سچ کہتی ہے، لکھشمی رام داس !"

فرداً فرداً فادر روبیلو اور فادر مائکل نے بھی کچھ ایسے ہی جواب دیے. گرجے سے باہر سلیٹ سے بنے ہوئے راستے پر کندن نے فادر فشر کو پکڑ لیا اور پوچھا ـــــ "کیا یہ ہو سکتا ہے ؟"

فادر فشر نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر کُندن سے کہا۔ "نہیں۔"

کندن چونک گئی اور بولی: "فادر — تم ایک کیتھولک پادری ہو کر اس بات کو نہیں مانتے؟"

"نہیں۔"

"کیوں نہیں؟"

"اس لیے کہ خدا کے بیٹے اور انسان کے بیٹے میں فرق ہے — میرا خیال ہے، کہیں رات کے وقت سدھو چپکے سے چلا آیا ہو گا۔"

کندن کو ماں کا فقرہ یاد آیا: "اپتی کے سب کام پرماتما اندھیرے میں کرتے ہیں۔" مگر فادر فشر کو آخر حد تک پہنچانے کے لیے کندن بولی: "سدھو یا رام داس؟"

"سدھو۔"

"رام داس کیوں نہیں؟"

"رام داس کوئی حقیقت نہیں رکھتا — اس کا کوئی وجود نہیں۔ وہ تو صرف نام ہے رجسٹر میں۔"

"ہاں مگر،" کندن نے ضد کی، "آیا کبھی تو لکھی کو پتا نہ چلا ہو گا؟"

"تم تو جانتی ہو،" فادر فشر نے کندن کی نگاہوں کو ٹالتے ہوئے کہا — "پھر خواب کتنا گہرا ہو جاتا ہے —"

کندن جذبات سے معمور ہو گئی — "باب،" اس نے کہا: "تم ایسا سمجھتے ہو۔ تو کیوں نہیں یہ مشن چھوڑ دیتے؟ کیوں نہیں شادی —"

باب فشر نے کندن کو وہیں روک دیا۔ صرف اتنا کہہ کر — "نہیں"

"تم کیوں نہیں سمجھنے کی کوشش کرتے، باب؟ اس دنیا کے سب دھندے کرتے ہوئے آدمی پادری سے بھی بڑا ہو سکتا ہے، یسوع —"

باب نے پھر ٹوک دیا: "تم نہیں سمجھ سکتیں —"

اور فادر فشر ایک ایک قدم سے دو دو سیڑھیاں پھاندتا ہوا واپس گرجے میں چلا گیا۔ پھر میری کے حضور میں دعائیں کرنے، رات کو اپنے مجرد بستر پر سونے اور روز آدھی رات کے وقت اُٹھ کر شیو بنانے اور پھر سو جانے۔ اس کے کچھ دن بعد فادر فشر ہمیشہ کے لیے

میڈیسن، وس کانسن چلا گیا۔

اب کے زچگی کے سلسلے میں لکھی کو بہت کڑی ہدایات تھیں بلکہ کندن نے ایک سستی مگر چست چالاک سی دایا طے کر رکھی تھی۔ شہر پانچ میل دور تھا اور وہاں کے اسپتال کی بیڈز بعض وقت ارجنٹ کیس کے لیے بھی خالی نہ ہوتی تھیں۔ میٹرنٹی کا خرچ برداشت کرنے کی لکھی میں ہمت نہ تھی۔ کندن مدد کر سکتی تھی مگر ایک حد تک۔

مگر لکھی زچگی کے سلسلے میں کوئی بھی مصارف برداشت کرنے کو تیار نہ تھی۔ ماں سبھاشنی نے سیخ پا ہو کر کہا — "مر جائے گی، کمینی!"

"ٹھیک ہے،" لکھی نے گھڑا سا سر ہلا دیا۔ "چھٹی ہو جائے گی۔"

"یہ چھوکریوں کی لام کون سنبھالے گا؟"

"خدا، جس نے پیدا کیا۔"

"انھیں پیدا کرنے میں تیرا کوئی ہاتھ نہیں؟"

"نہیں۔"

اور ناک ناک تک بھرے ہونے کے باوجود، شرارت سے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے لکھی مسکرا دی۔ اس کا مطلب تھا یہ خدا ہی ہے جو عین وقت پر عقل پھرا دیتا ہے، کسی اپنے ہی کھیل کے لالچ میں۔

اور تو سب ٹھیک تھا لیکن چیتی دار چہرے والی ریوڑی ابھی بہت چھوٹی تھی اور کندن کو اس کی طرف دیکھ دیکھ کر رحم آتا تھا۔ وہ اب تک مکمل طور پر ماں کو اپنا سمجھے ہوئے تھی۔ ماں ہی اس کا اوڑھنا بچھونا تھی اور ماں ہی اس کی روٹی۔ اسے کیا معلوم چند ہی دن کے بعد لکھی اسے نہ پوچھے گی۔ اس لیے نہیں کہ وہ پوچھنا نہ چاہے گی بلکہ دوسرے بچے کے سلسلے میں الجھی ہونے کے کارن اسے وقت ہی نہ ہو گا اور اگر کہیں لڑکا پیدا ہو گیا، تو —

نہیں اس بنگلے کا قانون ٹوٹ جائے گا، یہ لکھی جانتی تھی اور سبھاشنی اور کندن بھی۔

دایہ دن میں دو ایک چکّر کاٹ جاتی تھی تاکہ لکھی کے چہرے پر شکن بھی دکھائی دے تو ماں کو خبر کر دے۔ اس کے ساتھ طے ہی یہ تھا کہ وقت نبھا گئی تو لکھی کی تنخواہ سے دس روپے کاٹ کرا دیے جائیں گے اور میم صاحب، کندن بیس روپے اپنی جیب سے دے گی۔ اور ساتھ دھوتی بلاؤز یا فراک کا کپڑا۔ گیدرڈا سکرٹ

ایک دن دوپہر کے قریب دایہ آئی تو لکھی ہنس ہنس کر اس کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ دایہ کو خود بہت اچنبھا ہوا۔ اس نے تو کوئی ایسی بات نہ کی تھی جس پر کوئی ہنس سکے۔ اس کے تھوڑی دیر بعد لکھی پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔ دایہ اس کا منہ دیکھنے لگی اور ڈر گئی۔ اس کے پڑوس میں ایسے ہی ایک کنڑی عورت بیٹھے بیٹھے پاگل ہو گئی تھی مگر وہ ہنسنے کے سوا اور کوئی بات ہی نہ کر سکتی تھی لیکن لکھی ——— بات بھی کرتی تھی اور ہنستی بھی تھی۔ دایہ لکھی کی ہنسی سے مایوس ہو گئی اور سوچتی ہوئی چلی گئی۔ ابھی ہفتہ بھر کوئی خطرہ ہی نہیں۔

دایہ کے جاتے ہی لکھی رونے لگی۔ وہ اتنا ہی روئی تڑپی، جتنا وہ ہنسی تھی۔ وہ ایک ایسے جری پن سے جو عورت ہی کا حصّہ ہے، اپنے درد کو دبلاتی رہی حتّٰی کہ شام کے سات بج گئے۔

کندن اسکول سے لوٹ کر ایک کتاب پڑھ رہی تھی اور کھانے کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ ماں دلن بنتی ہوئی رسوئی کی طرف سے کوئی ضروری بات کہنے کے لیے آئی کہ ایک دلدوز چیخ سنائی دی۔

"یہ ——— ؟" ماں نے کہا۔

"لکھی کی آواز ———" کندن بولی اور پھر یہ دونوں اندھیرے میں لکھی کے گھر کی طرف دیکھنے لگیں۔

"ہائے سرب ناش" ماں نے ماتھا اور چھاتی پیٹتے ہوئے کہا۔ "دایہ تو کہہ گئی ہے ہفتے بھر کوئی خطرہ نہیں ———" اس کے بعد اور ہو ہا سے سنائی دینے لگیں۔ ماں سبھاشنی کی بے نقط گالیوں کا تانتا بندھنے لگا۔ بیچ میں جیگوار کے بے تحاشا بھونکنے کی آواز شامل ہو گئی۔

لیکن ماں سبھاشنی بھسکڑا مارے بیٹھی تھی اور اس بات کے انتظار میں تھی کب یہ آواز ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ کندنا زندہ تو اس کتیا کو گھر سے جانے نہ دے گی۔ البتہ مُردہ نہ رکھ

سکے گی۔ اس نے کندن کو بھی روک لیا ——— "اگر تو جائے تو میرا منہ دیکھے۔"

کندن رک گئی لیکن اس کا انگ انگ پھڑک رہا تھا اور چیخیں سن کر اس کے قدم دروازے کی طرف اٹھے اور پھر ماں کے ڈر سے رُک گئے۔ اس نے ملتجیانہ نظروں سے ماں کی طرف دیکھا جو پتّھر بنی بیٹھی تھی۔ اندر سے وہ کیوں اور کس بات کے خوف سے کانپ رہی تھی؟ اس کا کندن کو بھی اندازہ نہ تھا۔ شاید وہ بھی سل بنی بیٹھی رہتی لیکن ایکا ایکی کھلے دروازے میں سے ریوڑی چلی آئی ——— روتی ہوئی، متوحش اور مادر زاد ننگی ———

کندن سے نہ رہا گیا۔ وہ بولی: "میں جاؤں گی ———"

"کندنا" ماں نے آواز دی: "میں کچھ کھا لوں گی۔"

اس پر بھی کندن نہ رکی اور کوارٹروں کی طرف لپک گئی۔ ماں کو وہ دن یاد آیا، جب اس نے اپنے بھائی امولک رام کے ہاں چلے جانے کی دھمکی دی تھی اور کندن اسے ہمیشہ کے لیے بھیج دینے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ آج اسے ماں کے مر جانے کی بھی پروا نہ تھی۔ یہ کیا رشتہ تھا کندن کا اور لکھی کا؟ سبھاشنی اٹھی اور اپنی "کچی کنواری" بیٹی کو اس کربہ منظر سے بچانے کے لیے ریوڑی کو دھکا دے کر باہر نکل گئی۔

دو گھنٹے ماں بیٹی کشتی کرتی رہیں تب کہیں نو ساڑھے نو بجے ولادت ہوئی۔ حرامی بچہ پیدا ہو گیا، لیکن مرا ہوا۔ وہ لڑکا تھا ——— !

پیدائش کے فوراً بعد، لڑکے اور لڑکی تو کیا، زندگی اور موت سے بھی بے خبر لکھی ایک میٹھی نیند سو گئی ایسی نیند جو اس جانکاہی کے بعد ہی آتی ہے اور جس کا احساس مرد کو کبھی نہیں ہوتا۔ کندن کو یاد آیا ——— لکھی نے ایک بار دعا مانگی تھی ——— "خدایا! ایک بار صرف ایک بار میں لڑکا پیدا کر کے دیکھ لوں، چاہے وہ مرا ہوا ہو۔"

رات کے اندھیرے میں حقیقت کی راہیں ٹٹولتی، گرتی پڑتی ہوئی کندن مشن میں پہنچی جہاں مقدس مریم اور اس کے اور بھی مقدس بچے کا آئیکون تھا جس کے سامنے وہ دو زانو ہو گئی۔ وہ جو ایک کرسچین سے بہت بڑی تھی دائیں بائیں طرف دو بڑی سی موم بتیاں کانپنے لگیں، جن سے آئیکون متحرک ہو گیا اور مقدس ماں، بچے کو گود میں لیے کندن

سکے گی. اس نے کُندن کو بھی روک لیا ——— "اگر تو جائے تو میرا مرا منہ دیکھے"۔

کُندن رُک گئی لیکن اس کا انگ انگ پھڑک رہا تھا اور چیخیں سُن کر اس کے قدم دروازے کی طرف اٹھے اور پھر ماں کے ڈر سے رُک گئے. اس نے ملتجیانہ نظروں سے ماں کی طرف دیکھا جو پتھر بنی بیٹھی تھی. اندر سے وہ کیوں اور کس بات کے خوف سے کانپ رہی تھی؟ اس کا کُندن کو بھی اندازہ نہ تھا. شاید وہ بھی سل بنی بیٹھی رہتی لیکن ایکا ایکی کھلے دروازے میں سے ریوڑی چلی آئی ——— روتی ہوئی، متوحش اور مادر زاد ننگی ———

کُندن سے نہ رہا گیا۔ وہ بولی: "میں جاؤں گی ———"

"کُندنا" ماں نے آواز دی: "میں کچھ کھا لوں گی"۔

اس پر بھی کُندن نہ رکی اور کوارٹروں کی طرف لپک گئی۔ ماں کو وہ دن یاد آیا، جب اس نے اپنے بھائی امولک رام کے ہاں چلے جانے کی دھمکی دی تھی اور کُندن اسے ہمیشہ کے لیے بھیج دینے کے لیے تیار ہو گئی تھی. آج اسے ماں کے مر جانے کی بھی پروا نہ تھی۔ یہ کیا رشتہ تھا کُندن کا اور لکھی کا؛ سبھاشنی اٹھی اور اپنی کچی کنواری بیٹی کو اس کریہہ منظر سے بچانے کے لیے ریوڑی کو دھکا دے کر باہر نکل گئی۔

دو گھنٹے ماں بیٹی کشتی کرتی رہیں تب کہیں ساڑھے نو بجے ولادت ہوئی. حرامی بچہ پیدا ہو گیا، لیکن مرا ہوا۔ وہ لڑکا تھا ——— !

پیدائش کے فوراً بعد، لڑکے اور لڑکی تو کیا، زندگی اور موت سے بھی بے خبر لکھی ایک میٹھی نیند سو گئی ایسی نیند جو اس جانکاہی کے بعد ہی آتی ہے اور جس کا احساس مرد کو کبھی نہیں ہوتا. کُندن کو یاد آیا ——— لکھی نے ایک بار دُعا مانگی تھی ——— "خدایا! ایک بار صرف ایک بار میں لڑکا پیدا کر کے دیکھ لوں، چاہے وہ مرا ہوا ہو"۔

رات کے اندھیرے میں حقیقت کی راہیں ٹٹولتی، گرتی پڑتی ہوئی کُندن مشن میں پہنچی جہاں مقدس مریم اور اس کے اور بھی مقدس بچے کا آئیکون تھا جس کے سامنے وہ دو زانو ہو گئی۔ وہ جو ایک کرسچین سے بہت بڑی تھی دائیں بائیں طرف دو بڑی سی موم بتیاں کانپنے لگیں، جن سے آئیکون متحرک ہو گیا اور مقدس ماں، بچے کو گود میں لیے کُندن

پہ مسکرانے اور اس سے باتیں کرنے لگی. جبھی فادر مالکل آیا اور کُندن کو مسیح کی بھیڑوں میں شامل ہوتے دیکھ کر مسکرا دیا لیکن جبھی اس کے ہونٹ بھنچ گئے اور اس نے بچے کا فاتحہ پڑھنے سے انکار کر دیا کیوں کہ وہ کرسچین ہوئے بغیر مر گیا تھا، شراب اور پانی کے ساتھ اس کا بپتسمہ نہ ہو سکا تھا ———

صبح کُندن کو ایک اور ہی مسئلہ درپیش تھا۔ بچہ کرسچین تھا اور نہ مسلمان ——— نہ ہندو ——— کون اسے اپنے قبرستان میں دفنانے دے گا۔ شمشان میں جلانے دے گا۔ ہر کوئی یہی پوچھے گا ——— اس کے باپ کا نام کیا ہے؟

ماں نے بنگلے کے ایک کونے میں گڑھا کھود لیا۔ بچے کو دفنانے کے لیے لکھی گھسٹتی ہوئی چلی آئی. اس کے ہاتھ میں لکڑی کا ایک کھوکھا تھا جس میں مشنریوں کے لیے شراب آئی تھی اور جسے انھوں نے بپتسمے وغیرہ کے لیے استعمال کیا تھا وہی کھوکھا بچے کا تابوت بنا۔ کھوکھے میں بچے کو ڈالنے سے پہلے لکھی نے ماں سے کہا ——— "ماں! ——— ایک بار، صرف ایک بار مجھے میرا بیٹا دے دے ———"

ماں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بچے کو لکھی کے بڑھتے ہوئے ہاتھوں میں دے دیا۔ لکھی نے بچے کو گود میں لے لیا۔ اس کی طرف دیکھا اور ایکا ایکی جھک کر اس کے لڑکے پن کو چوم لیا۔ اور پھر اسے ماں کو لوٹاتے ہوئے بولی ——— "لے ماں"۔

تابوت کو گڑھے میں اُتار کر اس پر مٹی ڈالی گئی تو وہ بھی لمحوں کا ڈھیر، ایک ٹیلہ بن گیا. کُندن ——— کُندن کہاں تھی؟ تھوڑی ہی دیر میں وہ نیچے سے آتی ہوئی دکھائی دی. اس کے ہاتھ میں سرجو کا ایک بوٹا تھا جسے وہ کہیں سے کھود لائی تھی.

"یہ اس پر لگا دو، ماں" وہ بولی.

ماں نے دیکھا اور اس کے ہاتھ سے کھرپی گر گئی. اس نے ایک تیز سی نظر سرجو ——— یوکلپٹس کے پیڑ کی طرف دیکھا اور پھر ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں میں، ایک جست کے ساتھ اپنی بیٹی سے لپٹ گئی. ماں بیٹی دونوں ایک مشترک غم میں رو رہی تھیں.

سب باتوں سے فارغ ہو کر بنگلے کے برآمدے میں بیٹھتے ہوئے ماں نے کُندن سے

کہا "بیٹا! جو ہوا سو ہوا، اب تو شادی کر لے۔"

کندن ماں کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی "مجب ——— تم نے کیوں نہ کی ماں؟"

"تم جو تھیں ——— میرا سب کچھ" ماں نے جواب دیا اور نظریں بچائیں۔

کندن نے ماں کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور بولی "ادھر میری طرف دیکھو، ماں! میں شادی کروں گی۔"

———

₹ 70/-

ISBN:978-81-7587-500-5